بچھو

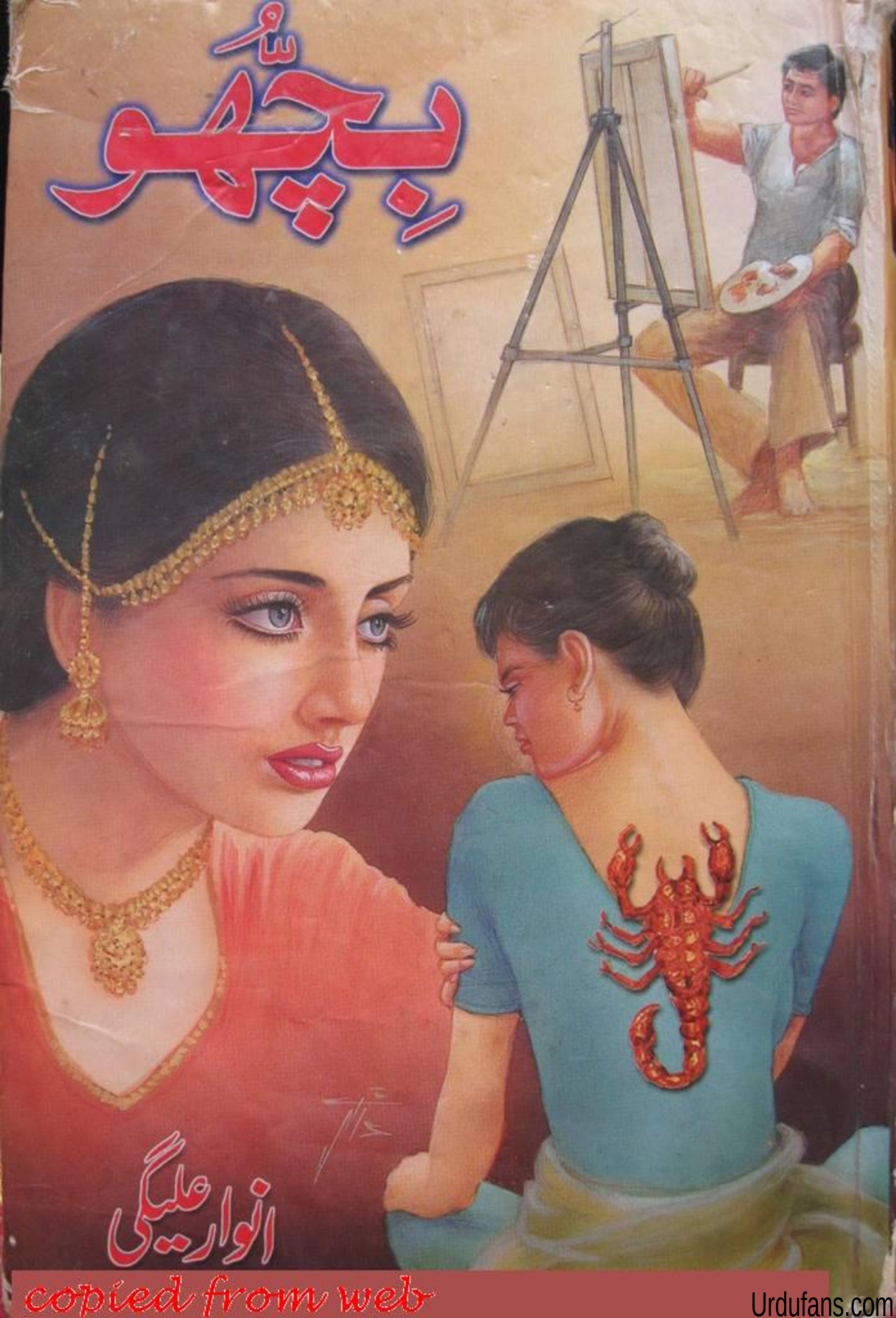

انوار علیگی

copied from web
Urdufans.com

کائنات کے پہلے اور آخری
قصّہ گو کا نام
کون ہے وہ؟
اَللّٰہ جس کا نام

copied from web

Urdufans.com

copied from web

گفتگو

اس کتاب کو میں نے اللہ کے نام معنون کیا ہے۔ آئندہ بھی میری جو کتاب آئے گی (انشاء اللہ) اللہ کے نام سے منسوب ہو گی۔ میں شکر گزار ہوں ربّ کائنات کا جس نے مجھے بہترین تخلیقی صلاحیتوں سے نوازا۔ اپنے خالق کی ثنا کے لئے میرے پاس لفظ نہیں۔ ویسے بھی ایک انسان میں اتنی استعداد کہاں کہ وہ اللہ کی تعریف (جس طرح کی جانی چاہئے) کر سکے۔ سارے سمندر روشنائی اور سارے درخت قلم بن جائیں، تب بھی اللہ کی تعریف مکمل نہ ہو۔ بس اللہ اپنی تعریف خود ہی کر سکتا ہے کہ اس کے سوا، اس کے بارے میں مکمل طور پر کوئی نہیں جانتا۔

یہ ناول اخبارِ جہاں میں ''طاغوت'' کے نام سے چھپا تھا۔ اس نام کے دو ناول شائع ہو جانے کی وجہ سے اس کا نام تبدیل کرنا پڑا۔ اب یہ ناول ''بچھو'' کے نام سے آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ ''طاغوت'' سے زیادہ اچھا نام ہے۔ اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئے گا۔

میں جب بھی کوئی پراسرار ناول شروع کرتا ہوں تو پراسرار حالات میں گھر جاتا ہوں۔ اس ناول کو لکھتے ہوئے میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہوا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ کراچی میں ''بچھو'' بالکل نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود اسکیچ بناتے بناتے اچانک کاغذ پر ''بچھو'' کا بچہ نمودار ہو گیا۔ اخبارِ جہاں کے آرٹسٹ عمران زیب اس بچھو کو شیشی میں بند کر کے میرے پاس لے آئے۔ اس بچھو کی ''ممی'' آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ مجھے نہیں معلوم ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن ہوتا ضرور ہے کہ میں تخلیق کے دوران غیر انسانی مخلوق کی گرفت میں آ جاتا ہوں۔ یہ اللہ ہی ہے جو مجھے پراسرار مخلوق کے نرغے سے بچاتا ہے۔

''بچھو'' کا اب دوسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے۔

ناول کی پذیرائی کا شکریہ۔

(انوار علیگی)

Urdufans.com

وہ بڑی محویت سے کام کر رہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس کے جسم میں جھٹکا سا لگا۔ یہ اچھا ہوا کہ برش تصویر سے دور تھا۔ وہ برش سے لڑکی کے ہونٹ سنوارنے جا رہا تھا۔ اگر برش ہونٹوں پر ہوتا تو اس جھٹکے کی وجہ سے ہونٹ سنورنے کی بجائے بگڑ جاتے۔

اس نے ایک لمحہ ٹیلیفون کو گھورا' پھر ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے یہ ایک خاص وقت تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس وقت ٹیلیفون پر کون ہو گا؟

دو انگریزی کے رسالوں پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا ریسیور اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا۔ برش اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ ریسیور کان سے لگا کر اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''جی۔''

جی کے جواب میں ایک مترنم ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کی ہنسی لاجواب تھی۔ اگر وہ موسیقار ہوتا تو اپنی کئی دھنیں اس پر قربان کر دیتا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہنسی ٹیپ کرے اور اسے گھنٹوں سنتا رہے۔ اس کی ہنسی میں پائل کی چھنک تھی۔ بانسری کی مدھر تان تھی۔ جو سنتا اس کے کانوں میں رس گھلتا تھا۔ وہ پوچھتا کہ تم کون ہو تو وہ بولنے کے بجائے ایک بار اور ہنس دیتی۔ اس نے جب سے فون کرنا شروع کیا تھا وہ آج تک بولی نہ تھی۔ لیکن آج اس نے اپنی ہنسی سنانے کے بعد پہلی بار لب کھولے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''رانجھن تم کیسے ہو؟''

''رانجھن؟'' اس نے بڑی حیرت سے دہرایا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے اسے رانجھن کیوں کہا۔

''ہاں' رانجھن ..... میرے رانجھن.....'' ہنسی کی طرح اس کی آواز بھی بڑی پیاری تھی۔ اس کے لہجے میں پیار رچا ہوا تھا۔

''بابا میں کوئی رانجھا وانجھا نہیں ہوں۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام ساحل ہے ساحل عمر..... میں ایک چھوٹا سا آرٹسٹ ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کون ہو' تمہارا نام کیا ہے اور تم کیا کرتے ہو؟ مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں' میرے رانجھن۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا۔ بولنے کے دوران وہ ہنستی بھی رہی۔

''مجھے جانتی ہو تو پھر ساحل کہو' رانجھن نہ کہو۔''

Urdufans.com

''تمہیں۔ساحل کہوں اور دور کھڑی نظارہ کرتی رہوں..... یہ چاہتے ہو تم؟''

''معلوم ہوتا ہے ادب سے خاصا لگاؤ ہے۔''

''ادب سے لگاؤ ہو یا نہ ہو بہر حال بے ادب نہیں ہوں میں۔''

''اتنے دن سے فون کر رہی ہو' لب تم نے آج کھولے.....''

''لب نہ کہو' زبان کہو' لب کھولے بنا بھی کیا کوئی ہنس سکتا ہے۔'' اس نے ساحل عمر کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

''ذہین بھی ہو' اچھی بات کہی تم نے۔'' وہ دل سے معترف ہوا۔

''تعریف کا شکریہ۔'' وہ پھر ہنسی..... ''اب اپنی بات پوری کرو۔''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنے عرصے تک تم صرف ہنستی رہیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ آخر کیوں؟ کیا میرے حال پر ہنستی تھیں۔'' ساحل عمر نے مسکرا کر کہا۔

''کسی کے حال پر ہنسنے والے دوست نہیں' دشمن ہوتے ہیں..... تمہاری دشمن نہیں' تمہاری دوست ہوں' میرے راجنھن۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی اور پھر ساحل عمر کا جواب سنے بغیر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

ساحل عمر چند لمحے اس کی ہنسی' اس کی باتوں میں کھویا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر ریسیور بہت آہستگی سے رکھ دیا۔

وہ جو کوئی تھی بڑی انوکھی لڑکی تھی۔ یہ سلسلہ اس نے بڑے عجیب انداز میں شروع کیا تھا۔ پہلے ٹیلی فون کی ایک گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ ٹیلیفون کی ایک گھنٹی بجتی اور ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ ایک دو دن تو ساحل عمر نے کوئی توجہ نہ دی۔ ٹیلیفون کی خرابی سمجھ کر نظر انداز کیا۔ لیکن جب کئی دن تک ایک گھنٹی بجتی رہی اور اتفاق سے اس نے گھنٹی بجنے کا ٹائم نوٹ کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ یہ گھنٹی ٹھیک گیارہ بجکر پانچ منٹ پر بجتی ہے۔ پھر دو گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ساحل عمر کو تیسری گھنٹی پر ٹیلی فون اٹھانے کی عادت تھی۔ کچھ دن دو گھنٹیاں بج کر ٹیلی فون منقطع ہوتا رہا۔

ایک دن اس نے دوسری گھنٹی پر ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف گہری خاموشی تھی۔ اس نے ''جی'' کہا تو ادھر سے ٹیلی فون منقطع کر دیا گیا۔ کچھ دن یہی چلتا رہا کہ وہ ٹیلی فون اٹھاتا..... جی کہتا تو اس کی آواز سن کر فوراً ٹیلی فون بند کر دیا جاتا۔

پھر ایک دن سانس کی آواز سنائی دی تو محسوس ہوا جیسے کسی نے گہری ٹھنڈی سانس لی ہو۔ کوئی سرد آہ بھری ہو۔ اس کے بعد ٹیلی فون بند..... کچھ دن کے بعد یہ گہری اور ٹھنڈی سانس ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ پھر کچھ عرصے یہ ہنسی چلی۔ بالآخر خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹا۔

اس کافر ادا نے آج اپنی ہنسی کے ساتھ آواز سنائی۔ جو کچھ کہا خوب کہا لیکن اتنا کہنے کیلئے اتنی دیر کیوں کی۔ اتنا کچھ تو وہ پہلے دن بھی کہہ سکتی تھی۔

اگر وہ پہلے ہی دن یہ سب کچھ کہہ دیتی تو وہ اس کے دماغ میں رجسٹر کس طرح ہوتی۔ اس نے بوند بوند برسنا شروع کیا اور اس کی لوح دل پر نقش ہوتی چلی گئی۔

وہ جو کوئی بھی تھی بڑی ذہین تھی' بڑی منصوبہ ساز تھی۔ وہ دھیرے دھیرے کھل رہی تھی۔ وہ کیا چاہتی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی اس کے بارے میں ساحل عمر کچھ نہیں جانتا تھا اور اسے جاننے کی اتنی فکر بھی نہ تھی وہ ایک بے نیاز سا نوجوان تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔

اپنی انگلیوں کے درمیان پھنسا برش نکال کر وہ ٹیلی فون کے پاس سے اٹھ آیا اور بورڈ پر لگی تصویر کے سامنے بیٹھ کر اس نے رنگ کی پیالی اٹھائی۔ برش میں ہلکا سا رنگ لگایا اور اس لڑکی کے ہونٹوں کو پینٹ کرنے لگا۔

ساحل عمر کوئی معمولی پینٹر نہ تھا وہ ایک غیر معمولی آرٹسٹ تھا اور اپنی انوکھی پینٹنگز کی وجہ سے مشہور تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ستائیس اٹھائیس سال کا ہوگا لیکن اس کم عمری میں اس نے وہ شہرت پالی تھی جو ایک آرٹسٹ پختہ عمر میں پہنچنے کے بعد حاصل کرتا ہے۔

وہ ایک زبردست تخلیق کار تھا۔ اسے تصویریں بنانے کا جنون تھا۔ وہ رئیلزم کا قائل تھا اور رئیلزم بھی فینٹسی کی آمیزش کے ساتھ۔ حقیقت اور تصور کو وہ اپنی تصویروں میں کچھ اس انداز سے برتتا تھا کہ تصویر دیکھنے والا اس کی تصویر میں گم ہو کر رہ جاتا تھا۔ اسکی تصویروں میں کوئی اسرار کوئی چونکا دینے والی بات ضرور ہوتی تھی۔

یہ تصویر اس وقت جس پر وہ کام کر رہا تھا ایک خوبصورت لڑکی کا پورٹریٹ تھا۔ لڑکی دلہنوں والے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ زیورات سے لدی پھندی تھی۔ خوبصورت آنکھوں والی۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں اور ہلکی سی اوپر اٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے اپنی پیشانی کی طرف دیکھ رہی ہو۔ اس کی پیشانی پر ٹیکہ نہ تھا۔ ٹیکے کی جگہ ایک بچھو بیٹھا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بچھو اس کے بالوں سے رینگتا ہوا اس کی پیشانی پر ٹھہر گیا ہو' اس کا ٹیکہ بن گیا ہو۔ یوں تو پوری تصویر میں ہی بڑی جان تھی لیکن اس بچھو کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب چلا تب چلا۔

کام کرتے کرتے وہ ذرا سا پیچھے ہٹ کر بیٹھا تاکہ تھوڑے فاصلے سے اس کے ہونٹ دیکھ سکے کہ اتنے میں ایک مرتبہ پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر نے فوراً گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے بارہ بجے تھے رات کے اس پہر کس کو اس سے بات کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔ یہ سوچتا ہوا وہ ٹیلی فون کے پاس پہنچا۔

ریسیور اٹھا کر اس نے ''جی'' کہا اس کی نظریں تصویر پر تھیں۔

''ہاں' شہزادے کیا ہو رہا ہے؟'' ادھر سے کسی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا تو یہ تم ہو۔'' ساحل عمر نے اپنے دوست مسعود آفاقی کی آواز پہچان کر کہا۔ ''کہاں سے بول رہے ہو۔''

''یار گھر سے بات کر رہا ہوں۔ ابھی ابھی ایک سیشن سے فارغ ہوا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''بھائی تمہارا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ تم جہاز سے بھی بول سکتے ہو۔ ویسے بھی جہاز پر تم اس طرح سفر کرتے ہو جیسے کوئی غریب آدمی موٹر سائیکل پر سفر کرے۔ آج اسلام آباد تو کل لاہور۔ کبھی لندن تو کبھی پیرس۔'' ساحل عمر نے خوشدلی سے کہا۔

''کام ہی ایسا ہے۔ کیا کروں۔'' وہ بولا۔

''کام تو خیر جو ہے وہ ہے..... ویسے تمہیں اڑنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ تم ایک جہاز کیوں نہیں خرید لیتے۔'' ساحل عمر نے مشورہ دیا۔

''اچھا یار اب مجھے معاف کر دے۔ دیکھ میں تیرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔'' مسعود آفاقی نے واقعی ریسیور اپنی گردن میں دبا کر دونوں ہاتھ جوڑے۔ ساحل عمر کو ہلکی سی تالی کی آواز آئی۔

''اچھا یہ بتاؤ کون تھی؟'' ساحل عمر نے موضوع بدلا۔

''کیا مطلب کون تھی؟'' مسعود آفاقی کو ساحل عمر کا سوال سمجھ میں نہ آیا۔

''او بھائی جس کے سیشن سے تم ابھی فارغ ہوئے ہو۔ اس کی بات کر رہا ہوں۔''

''ٹی وی کی ایک آرٹسٹ تھی یار۔''

''تم لوگوں کے بڑے مزے ہیں..... روز ایک نئی لڑکی۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر زور سے ہنسا۔

''اوے..... شہزادے میں نے کوئی حرم نہیں کھولا ہوا ہے اور نہ ہی کسی ملک کا شہنشاہ ہوں۔ ایک چھوٹا سا فوٹو گرافر ہوں اور یہ لڑکیاں میرے پیشے کا حصہ ہیں۔''

''جانتا ہوں۔'' ساحل عمر بڑے سکون سے بولا۔

''جانتے ہو تو یہ بتاؤ پینٹنگ کا کیا بنا؟'' مسعود آفاقی نے پوچھا۔

''اسی پر کام کر رہا ہوں۔''

''تم تو کہہ رہے تھے کہ آج رات تم مکمل کر لو گے؟'' مسعود کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تو میں نے یہ کب کہا ہے کہ کام پورا نہیں ہو گا۔'' ساحل عمر نے اطمینان سے کہا۔

''تمہارے لہجے سے اندازہ ہوا..... ویسے یار آج تم اس پینٹنگ کو ضرور مکمل کر لینا۔ کل میں فاروقی صاحب کو لے کر آؤں گا۔ اصل میں کچھ دیر پہلے ان کا فون آیا تھا۔ وہ تصویر کے بارے میں معلوم کر رہے تھے۔ بھئی وہ بہت بے چین ہیں۔''

''تصویر تو تم مکمل سمجھو..... لاسٹ ٹچز لگا رہا ہوں لیکن میں ابھی یہ تصویر دوں گا نہیں انہیں؟''

''آخر کیوں؟'' مسعود آفاقی حیران ہو کر بولا۔

''تم کل فاروقی صاحب کو لے آنا..... وہ تصویر دیکھ جائیں گے۔ انہیں تسلی ہو جائے گی لیکن انہیں لے جانے نہیں دوں گا۔''

''شہزادے اس بکواس کا مطلب کیا ہے؟''

''یار یہ تصویر کچھ زیادہ اچھی بن گئی ہے۔ دو چار دن اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔'' ساحل عمر نے سادگی سے کہا۔

''تو نہیں سدھرے گا بھائی اصل میں تو وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں.....

تیرے بارے میں یہ پتا ہے کہ کس کروٹ بیٹھے گا'' مسعود آفاقی نے غصے سے کہا۔''اس سے کہیں بہتر بات یہ ہے کہ میں انہیں پینٹنگ مکمل نہ ہونے کے سلسلے میں کوئی بہانا کر دوں۔''

''اچھا بھائی کل تم ان کو لے کر آ جانا اور تصویر لے جانا..... اب تو خوش ہو۔''

''ہاں شہزادے یہ ہوئی نہ بات..... او کے پھر کل ملاقات ہو گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

ساحل عمر نے ریسیور ٹیلی فون پر آہستگی سے جمایا اور وہیں بیٹھا بیٹھا تصویر کو دیکھنے لگا۔ وہ تصویر کو بڑی باریک بینی سے دیکھ رہا تھا ایک دم اس کی بچھو پر نظر ٹھہر گئی۔

ایک لمحے کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو میں حرکت پیدا ہوئی ہو' اس نے اپنی اگلی دو ٹانگیں ہلائی ہوں۔ بچھو کو ہلتے دیکھ کر ایک دم اس کے جسم میں سنسنی سی پھیلی۔ آنکھوں میں خوف جاگا۔ وہ لاشعوری طور پر پیچھے ہٹا مگر بچھو اپنی جگہ پر ساکت تھا۔ اس کی حرکت کا احساس بس ایک لمحے کا تھا۔ ساحل عمر طے نہ کر پایا کہ وہ بچھو واقعی حرکت میں آیا تھا یا یہ محض فریب نظر تھا۔

قریب آ کر اس نے بغور بچھو کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوا تھا۔ بچھو کے حرکت میں آنے والے خیال پر اسے ہنسی آئی۔ اسے یقین آ گیا کہ بچھو کو حرکت کرتے دیکھنا سو فیصد فریب نظر تھا۔ ویسے اپنے اس خیال پر وہ خوش تھا۔ وہ خود ہی اپنی تخلیق کے فریب میں آ گیا تھا۔ اس کی تصویر میں جان پڑ گئی تھی۔ یہ بات اس کے فن کی کامیابی کی دلیل تھی۔

اپنی تخلیق کے نشے میں مست وہ رات کے دو بجے تک کام میں لگا رہا۔ جب تصویر ہر طرح سے مکمل ہو گئی تو اس پر ایک سرشاری سی چھا گئی۔ تخلیق کی تکمیل کا کیف بالکل ہی الگ ہوتا ہے اس کیف کو' اس مزے کو' اس لطف کو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جو تخلیقی کام کرتے ہیں۔

وہ آسودگی سے مسکرا رہا تھا اور نظر بھر بھر کر اپنے شاہکار کو دیکھ رہا تھا۔

''ساحل تم ابھی تک سوئے نہیں۔'' اماں اچانک دروازے پر آ کھڑی ہوئیں۔

''اماں' بس کام ختم ہو گیا..... سونے جا رہا ہوں۔'' ساحل عمر اماں سے مخاطب ہو کر بولا..... ''اماں ذرا اندر آؤ..... آؤ تمہیں ایک زبردست دلہن دکھاؤں۔''

''ہیں دلہن۔'' اماں کے چہرے پر ایک دم خوشی آ گئی۔''میں ابھی آتی ہوں' ذرا چشمہ لے آؤں۔''

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچیں۔ تکیے کے برابر رکھا ہوا چشمہ اٹھایا اور دوپٹے سے صاف کرتی ہوئیں وہ ساحل عمر کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں۔

ساحل عمر نے جس کمرے کو اپنا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا اس کمرے میں وہ کبھی داخل نہ ہوئی تھیں۔ ساحل عمر اسٹوڈیو میں نہ ہوتا تو وہ کمرہ لاک رہتا اور اگر وہ کمرے میں بیٹھا کام کر رہا ہوتا تو اماں دروازے پر کھڑے ہو کر ہی اس سے بات کر لیتیں۔ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ دروازے سے وہ تصویر نظر نہیں آتی تھی۔ جس پر ساحل عمر کام کر رہا ہوتا۔ ساحل عمر دروازے کے رخ بیٹھتا تھا۔ تصویر کی پشت دروازے کی طرف ہوتی۔ اماں کی ان تصویروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رات کو جب بھی ان

کی آنکھ کھلتی اور وہ ساحل عمر کو اسٹوڈیو میں کام کرتا دیکھ لیتیں تو دروازے پر کھڑے ہو کر اسے ضرور دیتی تھیں۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ ان کی بات کو ایک کان سے سن دوسرے کان سے نکال دے گا۔ وہ اپنا کام کئے بغیر ہرگز نہ اٹھے گا پر دونوں اپنی اپنی عادت سے مجبور تھے۔

ساحل عمر بچپن سے ہی انہیں اماں کہتا تھا۔ وہ اس کی ماں نہ تھیں۔ اس گھر کی ملازمہ تھیں اس کی آیا تھیں۔ وہ ان کی گود میں پل کر ہی جوان ہوا تھا۔ ساحل عمر نے انہیں کبھی ملازمہ نہ سمجھا تھا وہ انہیں اپنی ماں جیسی جانتا تھا۔ اس وقت جب اس کے ماں باپ زندہ تھے اسے ماں جیسی عزت دیتا تھا اور اب جبکہ اس کے ماں باپ اس دنیا میں نہ رہے تھے وہ اس کی ماں تھیں اور وہی اس کی باپ۔

ساحل عمر کبھی کبھی جب ان کے کمرے میں آ کر بیٹھ جاتا تو وہ اس کے خوبصورت بالوں میں انگلیاں پھیر کر اس سے سوال کرتیں۔

''ساحل بیٹا..... تم شادی کب کرو گے؟''

''اماں اسی لئے تو میں آپ کے کمرے میں آتا نہیں ہوں۔ آپ خراب خراب باتیں کرنا شروع کر دیتی ہیں۔'' ساحل عمر انہیں ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہتا۔

''بیٹا..... میرے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں..... پتہ نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس گھر میں دلہن آ جائے تو میں سکون سے مر جاؤں۔'' اماں اپنی سناتیں۔

''اسی لئے تو میں شادی نہیں کرتا۔'' وہ ہنس کر کہتا۔

''کیوں آخر؟''

''میں نے شادی کر لی تو تم چل بسو گی اور میں یہ چاہتا نہیں۔'' وہ مسکرا کر اماں کی طرف دیکھتا۔

رات کے دو بجے جب ساحل نے دلہن دکھانے کی بات کی تو وہ نہ جانے کیا سمجھیں اور خوشی خوشی چہرے پر عینک چڑھائے اس کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئیں اور بولیں۔ ''لاؤ دکھاؤ کدھر ہے دلہن۔''

''ادھر میرے پاس آ جائیں۔'' ساحل عمر نے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اس کے نزدیک پہنچ گئیں تو اس نے بورڈ پر لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دیکھیں۔''

تصویر دیکھ کر بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔ ''ائے ماشاء اللہ..... بہت خوب..... بڑی پیاری ہے۔''

اور جیسے ہی ان کی نظر بچھو پر پڑی۔ وہ خوفزدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ ''اس بچھو کو مارو۔''

یہ سن کر ساحل عمر نے قہقہہ لگایا۔

''ارے ساحل تم ہنس رہے ہو..... جلدی کرو مارو اسے..... بھیا میں تو چلوں یہاں سے کہیں یہ موا میرے اوپر نہ چھلانگ لگا دے۔'' اماں تصویر سے دور ہو کر دروازے کی طرف بھاگیں۔

ساحل عمر نے بھاگتی اماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''اماں سنو تو۔''

''اس بچھو کو مارو۔'' وہ خوفزدہ تھیں۔

''اماں' یہ بچھو نہیں ہے۔'' ساحل عمر نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

''اماں' یہ بچھو نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ میں نے چشمہ لگا رکھا ہے۔ مجھے سب دکھائی دے رہا ہے۔''

''اچھا' ایک منٹ ادھر ہی کھڑی رہو..... میں اسے مارتا ہوں۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر اٹھا اور تصویر کے نزدیک جا کر بچھو پر ہاتھ رکھ دیا۔

اماں نے تصویر کے نزدیک جا کر بچھو پر ہاتھ رکھ دیا۔

اماں ''ہیں' ہیں'' کرتی رہ گئیں۔ پھر وہ بھاگ کر ساحل عمر کی جانب لپکیں۔ جب وہ قریب پہنچیں تو ساحل عمر نے تصویر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ بچھو اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔

تب ان پر حقیقت آشکار ہوئی۔ وہ بڑی حیرت سے اس بچھو کو دیکھنے لگیں۔

''نقلی ہے۔ ہاتھ سے بنا ہوا؟'' وہ بے یقینی سے بولیں۔

''جی اماں..... اسے میں نے بنایا ہے۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

''ارے اتنا زبردست بنایا ہے۔ بالکل اصل لگتا ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر ڈر ہی گئی تھی۔'' اماں نے اسے خراج تحسین پیش کیا۔

بس یہی تو خوبی تھی اس میں..... لوگ اسی لئے اس کے دیوانے تھے۔ وہ خیال کو مجسم کرتا اور پھر اس جسم میں جیسے جان ڈال دیتا تھا۔ وہ سچا تخلیق کار تھا۔ انوکھا مصور تھا۔

نثار فاروقی ایک فضائی کمپنی کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ ساحل عمر کے زبردست فین تھے۔ وہ کافی عرصے سے اس کی کوئی پینٹنگ خریدنے کے خواہاں تھے۔ وہ جب بھی کسی پینٹنگ کے خریدنے کی بات کرتے تو معلوم ہوتا کہ وہ تو پہلے ہی فروخت ہو چکی ہے۔ ساحل عمر بہت کم پینٹنگز بناتا تھا۔ اس کا موڈ نہ ہوتا تو مہینوں کوئی پینٹنگ نہ بناتا۔ پینٹنگ بنانا اس کا پیشہ نہ تھا۔ اسکے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ اس کا باپ اتنا کچھ چھوڑ گیا تھا کہ اس رقم کو فکسڈ ڈپازٹ میں رکھ کر وہ ایک شاندار زندگی بسر کر سکتا تھا لیکن اسے شاندار زندگی بسر کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ ایک عام اور سادہ سی زندگی گزارنے کا خواہاں تھا۔ پیسے کو وہ بالکل منہ نہ لگاتا تھا۔ پیسہ اس کی ضرورت تو تھا لیکن دین دھرم نہ تھا۔ جو تصویر وہ بناتا تھا وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے بناتا تھا۔ فروخت کرنے کے لیے نہیں لیکن لوگ اس کی پینٹنگ چھوڑتے ہی نہ تھے۔ ہزار خوشامدیں کر کے اور منہ مانگے پیسے دے کر پینٹنگ اٹھا کر لے جاتے تھے۔

نثار فاروقی بھی اس کی کوئی تصویر حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مسعود آفاقی کو پکڑا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسعود ساحل عمر کا گہرا دوست ہے۔ مسعود نے ساحل سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ وہ اب جو پینٹنگ بنائے گا وہ نثار فاروقی کے حوالے کی جائے گی۔ دوست کی بات ٹالنا ساحل عمر کی فطرت میں نہ تھا۔ پھر دوست بھی مسعود آفاقی جو اس پر جان دیتا تھا۔ ساحل عمر یوں تو خاصا سوشل تھا۔ جان پہچان والوں کا ایک وسیع حلقہ رکھتا تھا لیکن اس

کے دوستوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ بس اس کے دو ہی دوست تھے ایک مسعود آفاقی اور دوسرے ناصر مرزا۔

ناصر مرزا ایک چھوٹی سی فرم کے مالک تھے۔ وہ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کرتے تھے۔ شکار ان کا شوق تھا۔ یہ شوق انہیں اپنے والد عرفان مرزا سے ورثے میں ملا تھا۔

مضبوط کاٹھی کے آدمی تھے۔ کسرتی جسم کے مالک۔ قد آور..... جو انہیں ایک مرتبہ دیکھتا ان کی شخصیت سے مرعوب ہوئے بنا نہ رہتا۔ چالیس سے اوپر عمر ہو گی لیکن اپنی اصل عمر سے کم دکھائی دیتے تھے۔ شکار کے علاوہ روحانیت میں خاص شغف رکھتے تھے اور کچھ درک بھی تھا۔

یہ تینوں دوست ہفتے میں ایک بار ضرور اکٹھا ہوتے تھے۔ اگر فلم دیکھنے کا موڈ ہوتا تو مسعود آفاقی کے گھر میں ڈیرا جمایا جاتا۔ تاش کھیلنے اور کھانے پینے کا پروگرام ہوتا تو اس کے لئے ناصر مرزا کا گھر مخصوص تھا۔ اگر موسیقی سننا ہوتی' میوزک اور آرٹ پر گفتگو کرنا ہوتی نئی کتابوں پر تبصرے اور نت نئے موضوعات پر بات کرنا ہوتی تو اس کے لئے ساحل عمر کا گھر حاضر تھا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ کسی کے گھر نہ جاتے آؤٹنگ پر نکل جاتے۔ سمندر تینوں کو پسند تھا۔ عام طور سے وہ سمندر کا ہی رخ کرتے یا پھر کسی ہوٹل میں بیٹھ جاتے۔

تینوں کی عمروں میں اگرچہ فرق تھا لیکن ذہنی ہم آہنگی اتنی تھی کہ بعض اوقات بولے بغیر ہی وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ جایا کرتے تھے۔ کسی کو اپنی عمر کا احساس نہ تھا۔ ساحل کو چھوٹے ہونے کا اور ناصر مرزا کو بڑے ہونے کا۔

صبح کو مسعود جب نثار فاروقی کے ساتھ ساحل کے گھر پہنچا تو وہ شہزادے تکیے میں منہ دیئے سو رہے تھے۔ نثار فاروقی کو مسعود نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اس کے بیڈروم میں گھس گیا۔ اماں سے معلوم ہوا تھا کہ وہ رات کو کافی دیر سے سویا ہے لیکن اتنی دیر سے بھی نہ سویا تھا کہ اٹھ نہ سکے۔

مسعود نے اماں کو چائے بنانے کو کہہ دیا تھا۔ پھر اس نے ڈیک میں ایک کیسٹ لگا کر اسے پوری آواز میں کھول دیا اور خود اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔

ڈیک کی آواز نے ساحل کے اعصاب جھنجھنا دیئے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جب اس نے مسعود کو کانوں میں انگلیاں ٹھونسے اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس کے منہ پر تکیہ کھینچ کر مارا اور جلدی سے ڈیک آف کر دیا۔ اس سے پہلے کہ ساحل کچھ بولتا مسعود گویا ہوا۔

''شہزادے تمہیں شرم نہیں آتی..... لوگوں کو دعوت دے کر خود سوئے پڑے ہو؟''

''فاروقی صاحب آ گئے ہیں کیا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''جی۔'' مسعود آفاقی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''کہاں ہیں؟''

''ڈرائنگ روم میں بٹھا آیا ہوں اور ماں کو چائے بنانے کو کہہ دیا ہے۔ اب آپ براہ کرم

منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تم جب تک ان سے گپ شپ لگاؤ میں پانچ منٹ میں آیا۔''

اس نے تیار ہونے میں واقعی پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگائے۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کے تین کپ رکھے تھے۔

نثار فاروقی نے اسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھا تو احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ساحل عمر نے جلدی سے ٹرے میز پر رکھی۔ آگے بڑھ کر بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور خوشدلی سے بولا۔ ''سر تشریف رکھئے۔''

پھر اس نے ان کے سامنے چائے کی پیالی رکھی۔ مسعود نے اپنا کپ خود ہی اٹھا لیا۔

''تصویر کا کیا بنا؟'' فاروقی نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

''بن گئی۔'' ساحل عمر نے مختصراً جواب دیا۔

''واہ کیا خبر سنائی..... پھر دکھائیں نا۔'' فاروقی صاحب کپ میز پر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔

''فاروقی صاحب' ایسی بھی کیا بے صبری..... چائے تو پی لیں۔ اب تصویر کہیں نہیں جاتی۔'' مسعود نے ہنستے ہوئے کہا۔

لیکن انہیں کہاں صبر تھا۔ دو لمبے گھونٹوں میں انہوں نے اپنی چائے ختم کر دی اور صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنے۔ ساحل عمر ان کی بے قراری دیکھ کر جلد ہی اٹھ گیا اور انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

نثار فاروقی نے تصویر دیکھی تو حال سے بے حال ہو گئے۔ کئی بار ساحل عمر کا ہاتھ چوما اور وہیں بیٹھے بیٹھے ایک بھاری رقم کا چیک لکھ دیا۔ چیک کاٹ کر انہوں نے بڑے ادب سے ساحل عمر کو پیش کیا اور بولے۔ ''اسے اپنی تخلیق کا معاوضہ نہ سمجھنا۔ یہ تصویر انمول ہے۔ اس چیک کو ایک حقیر نذرانہ سمجھنا۔''

ساحل عمر نے شکریہ کہہ کر ان کے ہاتھوں سے چیک اٹھا لیا اور بغیر دیکھے تہہ کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس نے تصویر پیک کر کے ان کے حوالے کر دی اور وہ دونوں تصویر لے کر چلے گئے۔

باہر کا گیٹ بند کر کے پلٹا تو اماں کو دروازے پر کھڑے پایا۔

''اماں کیا ہوا؟'' اس نے دور ہی سے پوچھا۔

اماں نے بجائے جواب دینے کے کان پر ہاتھ رکھا۔

''اچھا.....'' وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اماں کے نزدیک آ گیا اور بولا ''کس کا فون ہے؟''

''کوئی لڑکی ہے۔'' اماں نے بتایا۔

لڑکی کا نام سن کر اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ گھڑی میں گیارہ بج کر چھ منٹ ہو رہے تھے۔ ایک مخصوص وقت تھا لیکن یہ دن کا وقت تھا اور دن میں اس کا کبھی فون نہ آیا تھا۔ وہ سوچتا ہوا اپنے اسٹوڈیو کی طرف بڑھا۔

''ہائے رانجھن کہاں تھے؟'' ادھر سے مترنم ہنسی کے ساتھ کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''دوستوں کو چھوڑنے باہر تک گیا تھا؟'' اس نے بتایا۔

''ہم کون ہیں آپ کے؟'' سوال ہوا۔

''اب سے بارہ گھنٹے پہلے میری آپ سے پہلی مرتبہ بات ہوئی تھی۔ اتنی جلدی کوئی رائے قائم کر سکتا ہے۔ میں تو آپ کے نام تک سے واقف نہیں شخصیت تو دور کی بات ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''کسی کو جاننے کے لئے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

''اتنا سمجھ دار نہیں ہوں میں۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

''اچھا' میرے ناسمجھ رانجھن' میری ایک بات سنو۔''

''ہاں کہو۔''

میں نے کوریئر سے تمہارے لئے کچھ بھیجا ہے اسے قبول کرو' پھر میں رات کو اپنے وقت پر تم سے بات کروں گی۔ اچھا او کے۔'' اس نے ساحل عمر کا جواب بھی نہ سنا اور فون بند کر دیا۔

ساحل عمر ریسیور پکڑے کافی دیر سوچتا رہا کہ اس نے کیا بھیجا ہو گا لیکن اندازہ نہ کر پایا۔ ریسیور رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اماں اس وقت کچن میں تھیں۔ وہ دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھیں یوں تو ساحل عمر نے اماں کی مدد کے لئے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو صبح سے رات تک اماں کے ساتھ ہوتی تھی۔ سارے کام وہی کرتی تھی لیکن ساحل عمر کے لئے کھانا وہ خود تیار کرتی تھیں۔ کچن میں جا کر اس نے اماں سے دو چار ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ پھر وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا اور میوزک سننے لگا۔

کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب گھر کی بیل ہوئی تو وہ باہر گیا۔ گیٹ پر کوریئر کا ایک باوردی بندہ کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت گفٹ پیک تھا۔

''سر آپ کے لئے۔'' وہ ادب سے بولا۔

گفٹ پیک ریسیو کر کے وہ اندر آیا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس نے بڑے اطمینان سے پیک کو کھولا اندر سے جو کچھ نکلا وہ اسے حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔ تحفے کو دیکھ کر اسے یاد آیا کہ آج اس کی سالگرہ ہے۔

اس نے سالگرہ کا ایک خوبصورت کارڈ' اور بڑا حسین سا کیک بھیجا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی ذاتی تاریخ اس لڑکی نے کس طرح معلوم کر لی۔ اس نے سالگرہ منانے کا سلسلہ کئی سال سے بند کر رکھا تھا۔ ممی پاپا کے انتقال کے بعد وہ اپنی سالگرہ کا دن جیسے بھول ہی گیا تھا۔ والدین کی موت کے بعد سالگرہ منانے کو اس کا جی نہ چاہا..... لیکن آج اس لڑکی نے کیک اور کارڈ بھیج کر اس کی یادوں کے بند دریچوں کو کھول دیا تھا۔

اماں جو بڑی خاموشی سے یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے قریب آ کر ایک پلیٹ اور اس میں چمکتی چھری رکھ دی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ چند لمحے وہ خاموشی سے ساحل عمر کو دیکھتی رہیں۔ اس نے بھی ایک نظر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔

پھر اماں دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں۔ ''کیک کاٹو بیٹا، تمہیں سالگرہ مبارک ہو۔''

''اچھا اماں۔'' ساحل عمر نے چھری اٹھا کر کیک کاٹا' ایک چھوٹا سا پیس نکال کر اس نے اپنے ہاتھ سے اماں کو کھلایا۔ اماں نے بھی اسے اپنے ہاتھ سے کیک کھلایا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

ساحل عمر کو اچانک یہ احساس ہوا کہ اس کی ممی پاپا اس کے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔

اماں چائے بنانے کچن میں گئیں۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ساحل عمر بوجھل قدموں سے ٹیلیفون کی طرف بڑھا۔ ریسیور اٹھا کر اس نے کہا۔ ''جی۔''

''یار ساحل..... ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' ادھر مسعود آفاقی تھا۔

''کیا ہوا؟'' ساحل نے پوچھا۔

''ابھی فاروقی صاحب کا فون آیا تھا۔'' مسعود آفاقی نے بتایا۔ ''یار تم نے کس قسم کی تصویر بنا کر ان کے حوالے کر دی۔ ان کے تو ہوش اڑے ہوئے ہیں۔''

''آخر ہوا کیا؟ کچھ بولو تو.....'' ساحل عمر پریشان ہو کر بولا۔

جواب میں مسعود آفاقی نے جو کچھ بتایا..... اس پر کوئی ذی ہوش یقین نہیں کر سکتا تھا۔ خود ساحل عمر سناٹے میں آ گیا تھا۔ ''ایسے کیسے ہو سکتا ہے یار۔''

☆.....☆.....☆

ایک ناقابل یقین بات تھی۔

مسعود آفاقی نے نثار فاروقی کے حوالے سے بتایا کہ جب نثار فاروقی نے گھر پہنچ کر تصویری پیکنگ کھولی تا کہ گھر کے لوگوں کو یہ شاہکار تصویر دکھا سکیں اور پھر یہ طے ہو کہ اسے کمرے میں کس جگہ لگانی ہے تو وہ تصویر کا چہرہ دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئے۔ دلہن کی پیشانی پر بیٹھا وہ بچھو غائب تھا۔ بچھو کی جگہ اس کا سفید عکس موجود تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے دلہن کی پیشانی سے اس بچھو کو نوچ کر پھینک دیا ہو۔

نثار فاروقی ابھی حیران کھڑے اس تصویر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ان کی ایک بیٹی نے اچانک چیخ کر کہا۔ ''ڈیڈی بچھو۔''

نثار فاروقی نے ہاتھ سے تصویر چھوڑ دی اور بولے۔ ''کہاں ہے؟''

''ڈیڈی تصویر کے پیچھے۔'' بیٹی خوفزدہ ہو کر بولی۔

نثار فاروقی نے اپنی بیٹی کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کر کے احتیاط سے تصویر الٹ دی لیکن تصویر کے پیچھے بچھو موجود نہ تھا۔ انہیں خیال آیا کہ بیٹی کو ایسے ہی وہم ہوا ہے لیکن بیٹی نے ان کے اس خیال کی سختی سے تردید کی۔ وہ اس بات پر ڈٹی رہی کہ اس نے یقینی طور پر تصویر کے پیچھے بچھو دیکھا ہے۔ اگرچہ یہ ایک ناقابل یقین خیال تھا لیکن احتیاط کے طور پر کمرے کا کونا کونا چھان مارا گیا۔ بچھو کا کوئی سراغ نہ ملا۔

تب پریشان ہو کر نثار فاروقی نے مسعود کو فون کیا اور سارا قصہ بتایا۔ مسعود نے اس قصے کو

ساحل عمر کے گوش گزار کیا۔ ساحل کو یقین نہ آیا۔ اس نے ساری بات سن کر کہا۔ ''ایسے کیسے ہو سکتا ہے یار؟''

''میری خود عقل نہیں کام کر رہی۔'' مسعود نے فکر مند ہو کر کہا ''لیکن فاروقی صاحب خاصے پریشان تھے۔''

''ان سے کہو پریشان نہ ہوں۔ تصویر مجھے واپس کر دیں۔ ان کا چیک میری پینٹ کی جیب میں جوں کا توں پڑا ہے۔ یقین کرو میں نے اس کی رقم بھی نہیں دیکھی۔''

''او نہیں شہزادے..... وہ رقم کیلئے پریشان نہیں اتنی تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد انہیں تمہاری پینٹنگ ملی اور وہ انہیں ضرورت سے زیادہ پسند بھی آئی لیکن اس پینٹنگ کا حشر کیا ہوا۔'' مسعود نے کہا۔ ''ویسے یار' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اس بچھو کو ایک کاغذ پر بنا کر دلہن کی پیشانی پر چپکا دیا ہو اور وہ وہاں سے اکھڑ گیا ہو۔''

''اگر ایسا ہوتا تو پھر پریشانی والی بات نہیں تھی۔ میں تصویر پر دوسرا بچھو بنا کر چپکا دیتا لیکن وہ بچھو تصویر پر بنا ہوا تھا اور اس پر میں نے بہت محنت کی تھی۔ اس محنت کا نتیجہ عجیب پراسرار انداز میں نکلا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہوا ہے۔'' ساحل عمر پریشانی سے بولا۔

''میں نے فاروقی صاحب سے تصویر واپس لانے کو کہا ہے جیسے ہی وہ آتے ہیں۔ میں تصویر لے کر آتا ہوں تم گھر پر ہی ہونا؟'' مسعود نے پوچھا۔

''ہاں میں گھر پر ہوں۔ کہیں جا بھی رہا ہوتا تو ایسی خبر سن کر رک جاتا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ساحل عمر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

اس نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس پر اسرار واقعہ کی کوئی توجیہہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پراسرار واقعہ کی توجیہہ ہوتی کب ہے۔ ان معاملات میں عقل کہاں کام کرتی ہے۔ کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی اور وہ تو بچپن ہی سے اس قسم کے واقعات کا شکار تھا۔

بچپن کا وہ واقعہ ابھی تک اس کے ذہن پر نقش تھا۔ وہ چیتے سے مشابہ دھاریوں والی بلی اب بھی کبھی کبھی اس کے خوابوں میں چھلانگیں مارتی نظر آ جاتی تھی۔ اسے یہ بات آج بھی اچھی طرح یاد تھی کہ وہ چیتے کی شکل والی بلی کب اس کے پیچھے لگی تھی۔ وہ چھٹی کا دن تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کا وقت' ساحل عمر اپنے ایک دوست کے ساتھ کرکٹ کھیل کر آ رہا تھا۔ بیٹ اس کے کندھے پر تھا اور وہ ایک ہاتھ سے گیند اوپر اچھالتا اور اس کو کیچ کرتا اپنے دوست کے ساتھ باتیں کرتے چل رہا تھا کہ ایک دم لڑکھڑا گیا۔ اچانک ہی کوئی چیز اس کے پیروں میں آ گئی تھی۔

جب ساحل عمر نے سنبھل کر ادھر ادھر دیکھا کہ وہ کس چیز سے ٹکرایا تو اسے نزدیک ہی ایک بلی کھڑی ہوئی نظر آئی۔

وہ اس کو دیکھ کر عجیب انداز سے میاؤں' میاؤں کر رہی تھی۔ ساحل عمر نے بیٹ سڑک پر مار کر اسے دھمکانے کی کوشش کی تو وہ بجائے بھاگنے کے اس کے نزدیک آ گئی اور کسی پالتو بلی کی طرح اس کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ وہ بڑی تیزی اور سختی سے اپنا بدن اس کی ٹانگوں سے رگڑ رہی تھی اور

اس کے دائیں بائیں گھوم رہی تھی۔

ساحل عمر اگرچہ بلیوں سے نہیں ڈرتا تھا لیکن اس وقت اس کو خوف محسوس ہوا اور وہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ اس کا دوست بلی کے نزدیک آنے سے پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔

ساحل عمر بھاگتے ہوئے جب بھی پلٹ کر دیکھتا کہ وہ بلی اس کے پیچھے آ رہی ہے یا نہیں تو اس کو اپنے تعاقب میں پاتا۔ اس دن وہ بلی اس کے پیچھے پیچھے گھر کے گیٹ تک آئی اور اس کے گھر میں داخل ہو جانے کے بعد واپس لوٹ گئی۔

اس کے بعد تو وہ چیتے نما بلی مستقل اس کے پیچھے لگ گئی۔ وہ گھر سے کھیلنے کیلئے نکلتا تو اس بلی کو گیٹ پر اپنا منتظر پاتا۔ وہ اس کے ساتھ ہو لیتی۔ ایک بار "میاؤں میاؤں کر کے اس کی ٹانگوں سے بدن رگڑتی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یا آگے پیچھے چلنے لگتی۔

وہ صبح اسکول گاڑی میں جا رہا ہوتا تو وہ بھی سڑک کے کنارے کھڑی ہوتی یا بھاگتی ہوئی دکھائی دے جاتی۔ جب وہ گاڑی میں جا رہا ہوتا تو وہ بھی سڑک کے کنارے کھڑی ہوتی یا بھاگتی ہوئی دکھائی دے جاتی۔

پھر ایک دن اس کی ممی نے اس بلی کو ساحل عمر کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہوا یہ کہ اسکول کی چھٹی ہوئی تو ساحل کی ممی گاڑی کے باہر ساحل کی آمد کی منتظر تھیں کہ انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سامنے سے ساحل عمر چلا آ رہا ہے اور ایک بلی اس کے تعاقب میں ہے۔ کبھی وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹتی، کبھی اچھل کر آگے چلی جاتی۔ ساحل نزدیک پہنچتا تو وہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل جاتی۔ ساحل عمر لڑکھڑا جاتا۔ کبھی وہ اس کی دائیں ٹانگ سے اپنا جسم رگڑتی گزر جاتی اور کبھی بائیں ٹانگ پر پنجے آزمائی کرتی۔

"جب ساحل عمر گاڑی کے نزدیک پہنچا تو اس بلی نے ایک نظر اس کی ممی کی طرف دیکھا۔ میاؤں کی آواز نکالی اور ایک گاڑی کے نیچے گھس گئی۔

ممی نے حسب معمول اس سے بستہ لیا۔ ہلکا سا گلے لگایا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بٹھایا اور پھر گھوم کر اپنی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس کا بستہ پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"ساحل یہ بلی کون تھی؟" ممی نے ایک نظر اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کچھ اس طرح سوال کیا جیسے انہوں نے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا ہو۔

"ممی پتہ نہیں۔" ساحل عمر نے بے نیازی سے کہا۔ "یہ کافی عرصے سے میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔"

"لیکن تم نے مجھے کبھی بتایا نہیں، میں نے اسے پہلی بار تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔" وہ بولیں۔

"آپ نے اسے پہلی بار اس لئے دیکھا ہے کہ یہ آج پہلی بار اسکول گیٹ پر ملی ہے۔"

"ہیں" ممی نے چونک کر ساحل عمر کی طرف دیکھا۔ "اس سے پہلے کہاں ملتی رہی ہے۔"

''گھر کے گیٹ کے آس پاس گھومتی رہتی ہے جیسے ہی میں باہر نکلتا ہوں میرے پیچھے لگ جاتی ہے۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''آخر یہ تم سے چاہتی کیا ہے۔''

''ممی شاید مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' ساحل عمر نے یہ بات اتنی معصومیت سے کہی کے ممی بے اختیار ہنس پڑیں اس کا گال تھپتھپائے بنا نہ رہ سکیں۔ وہ بڑے پیار سے بولیں۔ ''نائی۔''

ساحل عمر بچپن میں ذہین ہی نہیں خوبصورت بھی تھا۔ خوبصورت تو وہ خیر سے آج بھی تھا لیکن بچپن میں اسکے چہرے پر جو بھولپن تھا اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ انتہائی خوبصورت اور چمکتی ہوئی نیلی آنکھیں۔ ہلکے براؤن بال سرخ و سفید رنگت' بچپن میں اسے جو بھی دیکھتا پیار کئے بنا نہ رہتا۔ اس میں ایک خاص کشش تھی۔

شاید یہی کشش اس بلی کو ساحل کے نزدیک کھینچ لائی تھی۔ وہ بلی گھر سے باہر اس کی منتظر رہتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ ساحل عمر کے ساتھ کبھی گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی وہ کبھی گھر کے کسی گوشے میں دکھائی دی تھی۔ وہ بس گھر کے باہر اس کا پیچھا کرتی تھی اور اس کے قدموں میں لوٹتی تھی۔ ممی نے ساحل کے پاپا عمر عابد سے اس بلی کا ذکر کیا تو وہ تھوڑے سے فکرمند ہوئے اور بولے ''کہیں وہ ہمارے بیٹے کو نقصان نہ پہنچا دے۔''

''ابھی تک تو اس نے کوئی نقصان پہنچایا نہیں ہے۔ بس وہ اس کی ٹانگوں میں گھستی ہے۔ اس کے گرد چکر کاٹتی ہے۔ آگے پیچھے چلتی ہے اور اسے گھر تک پہنچا کر اپنا رستہ لیتی ہے۔'' ممی نے بتایا۔

''تم نے دیکھا ہے اس بلی کو؟'' عمر عابد نے پوچھا۔

''ہاں' میں نے دیکھا ہے' بالکل چیتے جیسی شکل کی ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیوں پیچھے لگی ہے اس کے..... کیا ساحل اس کو کچھ کھلاتا پلاتا ہے۔''

''بقول ساحل وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' ممی نے ہنس کر بتایا۔

''اچھا۔'' عمر عابد بھی ہنسنے لگے۔ ''پھر جلدی اس بلی کا گھر معلوم کرو تاکہ ہم اس کا رشتہ لے کر چلیں۔''

''اس بلی کی حرکات بے ضرر تھیں۔ اس نے ساحل عمر کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ تو آج تک اس کے گھر میں بھی داخل نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر سے باہر ہی اس کے تعاقب میں رہتی تھی۔ آگے پیچھے گھومتی' اس کی ٹانگوں سے لپٹتی' اس کے قدموں میں لوٹتی' اس چیتے نما بلی کا اس تواتر سے ساحل عمر کا پیچھا کرنا باعث پریشانی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دو دن کی بات ہوتی تو اسے نظر انداز کر دیا جاتا لیکن اسے پیچھے لگے ہوئے دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس کی ممی پاپا اب فکرمند رہنے لگے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے بیٹے کا اس بلی سے کس طرح پیچھے چھڑوائیں۔''

''پھر ایک دن مولوی صاحب نے اس بلی کو ساحل کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے دیکھ لیا۔ مولوی صاحب گھر پر ساحل عمر کو قرآن شریف پڑھانے آتے تھے۔ ایک دن ان کی آمد پر ساحل نے

گیٹ کھولا تو وہ بلی جو گیٹ پر اس کی منتظر تھی چھلانگ لگا کر ساحل کے نزدیک پہنچ گئی اور اس کے چاروں طرف گھوم کر اپنا بدن اس کی ٹانگوں سے رگڑنے لگی۔ مولوی صاحب نے بغور اس بلی کو دیکھا اور پھر اپنی سائیکل لے کر اندر آ گئے۔

ساحل عمر گیٹ بند کر کے اندر جانا چاہ رہا تھا لیکن وہ بلی اسے گیٹ بند کرنے کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس بری طرح اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہی تھی کہ وہ گیٹ بند نہیں کر پا رہا تھا۔ اتنے میں ساحل کی ممی گھر کے دروازے پر آ گئیں۔ انہوں نے بلی کو دیکھا تو وہ بھاگتی ہوئی گیٹ پر آئیں۔ ممی کو آتا دیکھ کر وہ بلی چند لمحے کو ساکت ہوئی تو ساحل عمر نے جست لگا کر گیٹ بند کر دیا۔

کچھ دیر باہر سے میاں میاؤں کی آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

ممی گھر کے اندر چلی گئیں اور ساحل عمر مولوی صاحب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔

مولوی صاحب' ساحل عمر سے بلی کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ وہ بلی کو اس عجیب و غریب انداز سے لپٹتا دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ ابھی وہ ساحل سے بلی کے بارے میں بات ہی کر رہے تھے کہ عمر عابد اندر آ گئے۔

''مولوی صاحب مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' عمر عابد مولوی صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ان کا لہجہ فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔

''جی فرمایئے۔'' مولوی صاحب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''ابھی آپ نے اس بلی کو گیٹ پر دیکھا ہو گا یہ دو ماہ سے ساحل کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں؟'' عمر عابد خاصے پریشان تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں' میں ایک دو دن میں اس کا بندوبست کروں گا۔'' مولوی صاحب نے بڑے یقین سے کہا۔

''اور انہوں نے واقعی ایسا کر دکھایا' تیسرے دن انہوں نے ایک تعویذ اور شیشی میں پڑھا ہوا پانی لا کر دیا۔ تعویذ ساحل عمر کے بازو پر باندھ دیا گیا اور پڑھا ہوا پانی پندرہ دن تک پینے کی ہدایت کی۔

ساحل عمر دوسرے دن شام کو جب کرکٹ کھیلنے کیلئے باہر نکلا تو خلاف توقع بلی کہیں دکھائی نہ دی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا میدان میں پہنچ گیا۔ میدان میں پہنچا تو اچانک اسے وہ دکھائی دی۔ وہ چھلانگیں بھرتی ہوئی ساحل عمر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''ساحل وہ تمہاری دوست۔'' ایک لڑکے نے ساحل عمر کی توجہ بلی کی طرف دلائی۔

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔'' ساحل عمر بڑے سٹائل سے بیٹ کندھے پر رکھے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

وہ چیتا نما بلی چار قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ ساحل کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ آج تک ایسا نہ ہوا تھا۔ وہ بلی اسے دیکھ کر اس طرح جھپٹتی تھی جیسے جانی دشمن یا دیکھ کر کوئی مسافر۔

اس بلی نے بڑی بے چارگی سے اسے دیکھا۔ دو چار بار درد بھری میاؤں میاؤں کی آواز نکالی اور پھر ایک طرف دوڑتی چلی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہو گئی۔

پھر وہ بلی اسے کبھی نہ دکھائی۔ البتہ آج بھی کبھی کبھی وہ اس کے خوابوں میں چھلانگیں مارتی دکھائی دیتی ہے۔

"بیٹا کھانا نکالوں؟" اماں نے پوچھا۔

ساحل عمر ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا بچپن کی یادوں میں گم تھا۔ اماں کے پوچھنے پر سامنے دیوار پر لگی گھڑی پر اس نے نظر دوڑائی۔ دو بج رہے تھے۔ یہ اس کے کھانے کا وقت تھا۔ وہ آرٹسٹ ضرور تھا لیکن زندگی کے معاملات میں کوئی بے ترتیبی نہ تھی۔ اس کی زندگی میں بڑا نظم و ضبط تھا۔ اسے اچھی خاصی بھوک لگ رہی تھی۔ سامنے ہی کیک رکھا تھا۔ اس نے چھری سے تھوڑا سا کیک کاٹ کر منہ میں رکھا اور اماں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ہاں اماں کیوں نہیں۔" ابھی وہ کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ بیل ہوئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مسعود نثار فاروقی کو لے کر آ گیا ہے۔ اس نے گیٹ کھولا تو واقعی وہ دونوں گیٹ پر موجود تھے۔ مسعود کے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر تھی۔

ساحل نے مسعود سے پینٹنگ لے لی اور دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ پینٹنگ اس نے ایک صوفے کی پشت سے لگا کر کھڑی کر دی۔ نثار فاروقی کے چہرے پر خجالت سی تھی۔ وہ چور سے بنے ہوئے تھے۔ اتنی تمناؤں اور آرزوؤں کے بعد تو انہیں ساحل کی پینٹنگ نصیب ہوئی تھی اور وہ پینٹنگ چند گھنٹوں بعد ہی واپس کرنا پڑ رہی تھی۔

"سر آپ پریشان نہ ہو۔ آپ کا چیک میری جیب میں قطعاً محفوظ ہے اور شاید آپ کو یقین نہ آئے میں نے اب تک اس چیک کی رقم بھی چیک نہیں کی ہے۔ آپ کی یہ امانت بغیر دیکھے ہی لوٹا رہا ہوں۔ قبول فرمایئے۔" ساحل عمر نے اپنی جیب سے تہہ کیا ہوا چیک نکالا اور بہت احترام کے ساتھ انہیں پیش کر دیا۔

نثار فاروقی نے وہ چیک بغیر کسی پس و پیش کے اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ مسعود کو ان کے اس رویے پر بڑی حیرت ہوئی لیکن ساحل ذرا بھی حیران نہ ہوا۔

چیک واپس کر کے وہ اپنی پینٹنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے پینٹنگ پر ڈھکا ہوا کاغذ ایک جھٹکے سے الگ کر دیا۔

نثار فاروقی اور مسعود کی بیک وقت نظریں اس تصویر پر پڑیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو حیران نظروں سے دیکھنے لگے جبکہ ساحل عمر کے چہرے پر سوال ابھر آیا۔ یہ سوال چند لمحوں کیلئے اس کے چہرے پر جھلکا۔ اس نے مڑ کر دونوں کو دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس مسکراہٹ میں بڑی جان تھی۔

وہ تصویر جوں کی توں تھی۔ وہ بچھو اس کی پیشانی پر موجود تھا۔ ساحل عمر بہت نزدیک سے اپنی پینٹنگ کا معائنہ کر رہا تھا۔ تصویر سے بچھو کے الگ ہونے کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ حتیٰ کہ اس نے بچھو پر اپنی انگلی پھیر کر بھی دیکھا۔ اس کی مکمل طور پر تشفی ہو گئی۔

''مسعود تم نے تو مجھے فون پر کچھ اور بتایا تھا۔'' ساحل عمر اطمینان سے صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

''مجھے نثار صاحب نے جو بتایا تھا وہ میں نے تمہیں بتایا۔'' مسعود نے اپنی صفائی پیش کی۔

نثار فاروقی کی حالت غیر تھی۔ ان کا سانولا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ تصویر پر بچھو موجود تھا۔ یہ کیسے ہو گیا تھا۔ گھر پر تو یہ بچھو اس کی پیشانی پر نہ تھا اور یہ بات گھر کے تمام لوگوں نے نوٹ کی تھی۔ بلکہ ان کی بیٹی نے تو اس بچھو کو تصویر کی پشت پر چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ کیسا فریب تھا۔ کیا پورا گھر فریب نظر کا شکار ہو گیا تھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' نثار فاروقی نے بمشکل کہا۔ ''یہ سب کیا ہوا ہے میں نہیں جانتا۔''

''سر آپ ساری بات بھول جائیں۔ میری پینٹنگ مجھ تک پہنچ گئی۔ آپ کو آپ کی رقم واپس مل گئی۔ حساب برابر ہو گیا۔'' ساحل عمر یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

اب نثار فاروقی کیلئے وہاں بیٹھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ بھی کھڑے ہو گئے اور پھر خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھے۔

''میں انہیں گیٹ تک چھوڑ آتا ہوں۔'' مسعود نے آہستہ سے کہا اور ان کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ساحل عمر ان دونوں کے جانے کے بعد بڑے پیار سے اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ کو دیکھنے لگا۔ اس تصویر میں بڑی کشش تھی۔ کوئی خاص بات تھی۔ ایسی خاص بات کہ آدمی اس تصویر کو یک نظر دیکھ لے تو پھر اس پر سے نظر ہٹانا مشکل ہو جاتی۔ ایک تو دلہن بہت خوبصورت تھی دوسرے ٹیکے کی جگہ بیٹھا ہوا بچھو آدمی کو دم بخود کر دیتا تھا۔

تصویر دیکھتے دیکھتے اس نے طے کر لیا کہ وہ اس پینٹنگ کو کبھی اپنے سے جدا نہیں کرے گا۔

''یار شہزادے یہ کیا ڈرامہ ہے؟'' مسعود ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''چلے گئے؟'' ساحل نے پوچھا۔

''ہاں۔'' مسعود نے جواب دیا۔

''کچھ کہہ رہے تھے؟'' ساحل عمر نے سوال کیا۔

''نہیں کچھ نہیں بولے۔ البتہ پریشان اور شرمندہ شرمندہ سے ضرور تھے۔'' مسعود آفاقی نے بتایا۔

''میں تمہیں ایک بات بتاؤں' یقین کرو گے۔'' ساحل عمر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''ہاں بولو۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بچھو غائب ہونے کا قصہ سفید جھوٹ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ جوش میں آ کر تصویر

لے تو گئے لیکن بعد میں تصویر ان کو پسند نہ آئی۔ اس لئے ڈرامہ کر کے واپس کر گئے۔" ساحل عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ میں اس تصویر کی واپسی پر خوش ہوا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں اسے ویسے بھی دو چار دن اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس تصویر کو میں کسی کو نہیں دوں گا۔ چاہے کوئی اس تصویر کا معاوضہ ایک کروڑ روپے ہی کیوں نہ دینے کو تیار ہو جائے۔"

"یار میں اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوں۔" مسعود بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔

"ایک کروڑ روپے معاوضے والی بات کو؟" ساحل نے پوچھا۔

"او نہیں یار۔" مسعود آفاقی نے تصویر کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تصویر پسند نہ آنے کی بات کر رہا ہوں۔ وہ تمہارے شیدائی ہیں اگر انہیں تصویر پسند نہ آتی تو وہ فوراً چیک کاٹ کر نہ دیتے۔ دوسرے تصویر لے جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھے۔ مجھ سے مشورہ کرتے رہے کہ یہ تصویر اپنے گھر میں لگائیں یا اپنے آفس میں۔ پھر ایک بات اور ہے اگر انہیں تصویر واپس کرنا ہوتی تو ایسا بچکانہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تم مانو نہ مانو لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس تصویر سے خوفزدہ ضرور ہوئے ہیں۔"

"اچھا لعنت بھیجو اس ذکر پر آؤ اندر چلو۔ آؤ تمہیں کیک کھلاؤں۔" ساحل عمر نے تصویر اٹھالی اور ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

"ایک بات بتاؤ' کیا تم نے اپنی سالگرہ منائی ہے۔" مسعود نے چلتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔

"نہیں بھئی..... سالگرہ منانا تو کیا تمہیں نہ بلاتا۔" ساحل عمر نے وضاحت کی۔

"پھر کیک کہاں سے آ گیا؟" مسعود نے پوچھا۔

"کسی نے بھیجا ہے۔" ساحل عمر نے لطف لیتے ہوئے بتایا۔

"کس نے؟" مسعود نے پوچھا۔ وہ حیران تھا۔

"نام تو خیر سے مجھے بھی معلوم نہیں۔" ساحل عمر نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے' تم کیک کھاؤ' تمہیں نام سے کیا لینا ہے۔" ساحل عمر نے اس کے ہاتھ میں چھری دیتے ہوئے کہا۔

مسعود آفاقی نے کیک کا چھوٹا سا پیس کاٹ کر منہ میں رکھا اور انگلی چاٹتا ہو بولا۔

"شہزادے کیک تو زبردست ہے۔"

"مجھے امید ہے کہ وہ بھی زبردست ہو گی۔" ساحل عمر مسکراتے ہوئے بولا۔

"بھائی کون؟"

"وہی ٹیلیفون والی۔" ساحل عمر نے بتایا۔

"ہیں" مسعود آفاقی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ "اس نے بھیجا ہے یہ کیک؟"

''ہاں جی۔'' ساحل عمر نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔

''شکاری کو بتایا؟'' مسعود نے سوال کیا۔

''ناصر مرزا کو۔'' ساحل عمر نے وضاحت چاہی۔

''ہاں۔'' مسعود نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ملاقات ہو گی تو بتاؤں گا۔'' ساحل عمر نے کہا۔

''اور یار دیکھا تم نے۔'' مسعود کی آواز میں ہلکا سا خوف تھا۔ وہ اس تصویر کو جو ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر رکھی تھی بغور دیکھ رہا تھا۔ ساحل عمر بھی اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ اسے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔

''کیا ہوا؟'' ساحل نے پوچھا۔

''بھائی کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔'' مسعود کے لہجے میں خوف تھا۔

''ہوا کیا' بولو تو۔'' ساحل عمر پریشان تھا۔

''یار اس بچھو کو میں نے ہلتا ہوا محسوس کیا ہے؟'' مسعود نے بتایا۔

''اب تمہیں کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''یار میں سچ کہہ رہا ہوں ایک لمحے کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھو نے اپنا سر ہلایا ہو۔''

''لیکن بچھو تو اپنی جگہ جوں کا توں موجود ہے۔'' ساحل نے تصویر پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔'' مسعود آفاقی نے تصویر کے نزدیک جاتے ہوئے کہا۔

''لیکن جو میں نے دیکھا وہ بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ تم جانتے ہو میں فوٹو گرافر ہوں۔ میری نظریں بہت تیز ہیں۔''

''خدا کے واسطے مسعود مجھے الجھاؤ مت۔'' ساحل عمر نے احتجاج کیا۔

''تمہیں الجھا نہیں رہا میں خود الجھ گیا ہوں۔'' مسعود کی نظریں تصویر پر تھیں۔ ''ساحل یار تم نے کمال کیا ہے۔ یہ بچھو اس قدر شاندار بنایا ہے کہ ہر لحہ یوں لگتا ہے جیسے اب حرکت میں آ جائے گا۔ یہ تم نے کسی ریفرنس سے بنایا ہے؟''

''ہاں' ایک انگلش رسالے میں چھپی ہوئی تصویر سے بنایا ہے۔'' ساحل نے کہا۔ ''ذرا وہ ریفرنس دکھاؤ۔'' مسعود بولا۔

''آؤ' اسٹوڈیو میں آ جاؤ' وہیں پڑا ہے وہ ریفرنس'' یہ کہہ کر ساحل عمر نے اپنی پینٹنگ اٹھا لی اور وہ دونوں اسٹوڈیو میں داخل ہو گئے۔ مسعود ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور ساحل ریفرنس ڈھونڈنے لگا۔ جب دو چار منٹ تک ساحل کو ریفرنس نہیں ملا تو مسعود نے پوچھا۔ ''نہیں مل رہا؟''

''یار ابھی تک تو میرے سامنے ہی پڑا تھا۔ پتہ نہیں کدھر گم ہو گیا۔''

''چلو چھوڑو۔'' مسعود نے بے نیازی سے کہا۔

''ایک منٹ۔'' ساحل عمر کو جیسے کچھ خیال آیا۔ وہ اٹھ کر ٹیلیفون کے نزدیک پہنچا۔ ٹیلیفون انگلش کے دو موٹے رسالوں پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے ٹیلیفون اٹھا کر فرش پر رکھا اور ایک موٹا رسالہ اٹھا

کر اس کے ورقوں میں ریفرنس تلاش کرنے لگا۔ وہ ریفرنس اس رسالے میں رکھا نظر آ گیا۔

''مل گیا۔'' ساحل عمر نے رسالے سے ریفرنس نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو۔''

مسعود نے وہ ریفرنس اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ ایک ہاتھ تھا' ہاتھ پر وہ بچھو تھا اور پس منظر میں ناریل کے درخت تھے اور کچھ گول جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ یہ ہاتھ زنانہ تھا اور کسی افریقن عورت کا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ عورت اس بچھو کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کسی کو دکھا رہی ہو۔ ہاتھ کیونکہ قریب تھا اس لئے وہ بچھو بہت واضح تھا۔

''فوٹوگرافی کے اعتبار سے یہ ایک بہت اچھا ایکسپوژر ہے لیکن تمہارے بچھو میں جو جان ہے وہ اس میں نہیں ہے۔'' مسعود نے اس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور اس لڑکی کا ریفرنس کہاں ہے۔

''یہ لڑکی میں نے کئی ریفرنس دیکھ کر بنائی ہے۔ کہیں سے آنکھیں لی ہیں کہیں سے ہونٹ لئے ہیں کہیں سے ناک لی ہے اور کچھ میں نے اپنے خوابوں سے لیا ہے۔'' ساحل عمر نے انکشاف کیا۔

''خوابوں سے!'' مسعود نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں' میں نے اس لڑکی کو اپنے خوابوں میں کئی بار دیکھا ہے۔ اس تصویر میں تو اس کے حسن کا پچاس فیصد بھی عکس نہیں۔ وہ لڑکی مجھے کسی پہاڑی علاقے میں نظر آتی ہے۔ صاف آسمان' برف پوش پہاڑیاں' سبزی مائل پانی اور وہ لڑکی۔''

''وہ لڑکی جہاں نظر آتی ہے کیا وہ علاقہ تمہیں دیکھا ہوا لگتا ہے؟'' مسعود نے پوچھا۔

''نہیں' اس طرح کے علاقے میں میں آج تک نہیں گیا۔'' ساحل نے بتایا۔

''ایک بات میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی۔ یہ اتنی پیاری سی لڑکی کی پیشانی پر بچھو بٹھانے کی آخر تمہیں کیا سوجھی؟'' مسعود نے سوال کیا۔

''مسعود آفاقی' یہ تخلیق کا معاملہ ہے۔ یہ بٹن دبانے والوں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتا۔''

''اچھا۔'' مسعود آفاقی نے اس کے طنز کا برا نہیں مانا۔ وہ ہنس کر بولا۔ ''یار مجھے تو تو کوئی اہرام مصر کی بھٹکی ہوئی روح لگتا ہے اس طرح کا کام وہی کر سکتی ہے۔''

اس کی یہ بات سن کر ساحل عمر نے زوردار قہقہہ لگایا۔ مسعود بھی اس کے قہقہے میں شامل ہو گیا۔

''اچھا بھائی میں اب چلتا ہوں۔ اس ہفتے کی ملاقات ناصر مرزا کے یہاں ہے نا۔'' مسعود نے تصدیق چاہی۔

''ہاں بالکل۔'' ساحل عمر نے تصدیق کی۔

''شہزادے' میں تمہاری اس پینٹنگ کو ایکسپوز کرنا چاہتا ہوں۔'' مسعود نے پینٹنگ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شوق سے جب چاہے کر لو۔'' ساحل عمر نے خوشدلی سے کہا۔

مسعود کے جانے کے بعد اس نے اسٹوڈیو والے کمرے کو لاک کیا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر میں ہی اسے نیند نے آلیا۔

''وہ نہ جانے کب تک سوتا رہا کہ اماں نے اسے آ کر جگا دیا۔'' ساحل اٹھو آخر کب تک سوؤ گے۔''

''اماں کیا وقت ہوا ہے؟'' ساحل نے پوچھا۔

''آٹھ بج رہے ہیں رات کے۔'' اماں نے بتایا۔

''ہیں' اتنی دیر ہو گئی مجھے سوتے ہوئے۔''

''تو اور کیا؟'' اماں نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی آیا ہے تم سے ملنے۔''

''کون ہے؟'' ساحل عمر نے بیڈ چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی بالکل نیا بندہ ہے' اس سے پہلے نہیں دیکھا۔'' اماں نے بتایا۔

''اماں تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں سو رہا ہوں۔''

''بتا دیا تھا لیکن وہ واپس گیا ہی نہیں' کہنے لگا میں ان کے جاگنے کا انتظار کروں گا۔ جب وہ جاگ جائیں تو آ کر بتا دیجئے گا۔ میں یہیں دروازے پر کھڑا ہوں۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں ان سے ملے بغیر نہیں جا سکتا۔ تب میں نے سوچا کہ یہ دروازے پر کہاں کھڑا رہے گا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم کھول کر بٹھا دیا۔ وہ دو گھنٹے سے تمہارا منتظر ہے اور تم ہو کہ سوئے چلے جا رہے تھے۔ مجبوراً مجھے آ کر تمہیں اٹھانا پڑا۔ کسی مہمان کو اس قدر انتظار کرانا کوئی اچھی بات تھوڑی ہی ہے۔ کیوں ساحل؟'' اماں نے ساحل سے تائید چاہی۔

''اماں..... آپ بالکل صحیح فرما رہی ہیں۔'' ساحل کے پاس تائید کے بنا کوئی چارہ نہ تھا ''میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ مہمان کیلئے چائے وغیرہ بنوا دیں۔''

''ٹھیک ہے تم منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔'' اماں نے خوش ہو کر کہا۔

ساحل عمر جب فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ شخص اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا مالک شخص تھا۔ اس نے شلوار قمیض اور شیشے لگی کوٹی پہنی ہوئی تھی۔ سر پر ایک مخصوص ٹوپی تھی جس پر ایک پر لگا ہوا تھا۔ وہ شخص ایک نظر میں شمالی علاقہ جات کا رہنے والا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پروقار سنجیدگی تھی۔

''معاف کیجئے گا۔ آپ کو میرا خاصا انتظار کرنا پڑا۔ میں شرمندہ ہوں۔'' ساحل عمر نے معذرت چاہی۔

''اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔'' اس شخص نے دو قدم آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ بڑا مضبوط اور بھاری تھا۔ ''میں تو ان خاتون کا بڑا احساس مند ہوں کہ انہوں نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا لیا ورنہ اگر مجھے پوری رات باہر کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا تو کرتا۔''

''ایسا' آپ کو مجھ سے کیا کام آ پڑا۔ میں ایک معمولی آرٹسٹ ہوں۔ کوئی سرکاری افسر

نہیں۔'' ساحل عمر نے ہنستے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''آپ تشریف رکھئے۔''

میز پر ایک درمیانے سائز کا چرمی بیگ رکھا تھا اس نے اس کی زپ کھول کر ایک سفید رنگ کا بڑا لفافہ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کیلئے ایک تصویر لایا ہوں۔ یہ تصویر آپ کو پینٹ کرنا ہو گی۔''

ساحل عمر کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ وہ کوئی کمرشل آرٹسٹ نہ تھا۔ اس کا پیشہ بھی آرٹ نہ تھا۔ تصویر بنانا اس کا شوق تھا۔ وہ اپنی مرضی سے تصویریں بناتا تھا اور یہ شخص اس سے فرمائشی تصویر بنوانے آ پہنچا تھا۔ ایک اجنبی شخص اور کہتا تھا کہ یہ تصویر آپ کو بنانا ہو گی۔

ساحل عمر نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور انکار کرنے سے پہلے اس نے سوچا کہ ایک نظر اس تصویر کو دیکھ لے تا کہ یہ تو معلوم ہو سکے کہ وہ اس سے کیا بنوانے کا خواہش مند ہے۔

جب ساحل عمر نے وہ تصویر لفافے سے نکالی تو اس تصویر کو دیکھ کر ایک لمحے کو اسے سانپ سونگھ گیا۔

☆.....☆.....☆

ایک خوف سا اس پر طاری ہو گیا۔ اس تصویر نے ایک لمحے میں ہزاروں منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزار دیئے۔ اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اپنے سینکڑوں خواب اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔

اسے وہ چیتے نما بلی یاد آ گئی جو اسے دیکھتے ہی اس کے پیروں سے لپٹنے لگتی تھی۔ وہ بلی آج بھی اسے خوابوں میں جست لگاتی دکھائی دے جاتی تھی لیکن اب اس کا سائز بدل چکا تھا۔ اب وہ ایک مکمل چیتا بن چکی تھی اور یہ چیتا اکثر اسے خواب میں دکھائی دیتا تھا۔ بہت تیز دوڑتا ہوا جیسے کسی کا تعاقب کر رہا ہو۔

یہ شخص جس چیز کی تصویر بنوانے آیا تھا وہی تھا۔ جنگل میں ایک چیتا کھڑا ہوا تھا اس چیتے کی نظریں تصویر اتارنے والے کی طرف تھیں۔ یہ ایک دس بارہ سائز کی تصویر تھی۔ جس فوٹو گرافر نے بھی اتاری تھی خوب اتاری تھی۔ ساحل عمر نے جیسے ہی چیتے کی آنکھوں میں دیکھا "میاؤں میاؤں" کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں چند لمحوں کو سنائی دیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی پہچان کرائی ہو۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔

"جی ساحل عمر صاحب؟" اس شخص نے بڑے مودبانہ انداز میں اسے متوجہ کیا۔

"جی جناب۔" ساحل عمر نے تصویر سے نظریں ہٹا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"فرمایئے۔"

"اس تصویر کو آپ کتنے دن میں بنا لیں گے؟" اس نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" ساحل عمر نے اسے غور سے دیکھا وہ بھی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ ساحل عمر زیادہ دیر اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہ مسکرا دیا۔

"میرا نام بازغر ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"بازغر..... کیسا انوکھا نام ہے؟" ساحل عمر نے کہا۔

"بالکل آپ کی بنائی ہوئی تصویروں کی طرح۔" بازغر مسکرایا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی۔

"کیا آپ نے میری کوئی تصویر دیکھی ہے؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

''ساحل صاحب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ یہ تصویر کتنے دن میں بنالیں گے۔''
اس نے ساحل کا سوال سنا ان سنا کر دیا۔
''بازغر صاحب آپ نے یہ بات کیسے طے کر لی کہ میں اس تصویر کو بنانے سے انکار نہیں کروں گا۔'' ساحل عمر نے پوچھا ''میں کمرشل آرٹسٹ ہوں نہ پیشہ ور پینٹر..... کیا آپ یہ بات جانتے ہیں؟''
''میں سب جانتا ہوں بازغر نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ ''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ اس تصویر کو پینٹ کرنے سے انکار نہیں کریں گے۔''
''کیوں آخر..... ایسی کیا خاص بات ہے اس میں۔''
''یہ کیا ہے اس میں کیا انوکھی بات ہے یہ تو آپ خود بھی جان گئے ہوں گے۔ اگر آپ اس تصویر کو پینٹ کرنے سے انکار کر سکتے ہیں تو کر کے دکھایئے۔'' اس نے چیلنج کیا۔
یہ ایک انتہائی اشتعال انگیز بات تھی لیکن اس نے یہ بات اتنے دھیمے لہجے میں اتنے مہذبانہ انداز میں کہی کہ اس کے لہجے پر غصہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔
ساحل عمر ایک انتہائی نازک مزاج آرٹسٹ تھا۔ ایسی بات کسی اور نے کہی ہوتی تو وہ اب تک اس تصویر کے چار ٹکڑے کر کے اس کے ہاتھ میں تھما چکا ہوتا۔ اس کے اس چیلنج پر ساحل عمر نے چاہا کہ وہ انکار کر دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے تصویر کو دیکھتے ہی یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اسے ضرور پینٹ کرے گا اور یہ اس نے کیوں طے کر لیا تھا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔
''میں انکار نہیں کر سکتا۔ میں انکار کیوں کروں؟ مجھے اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ میں جن تصویروں کو بنانا پسند کرتا ہوں یہ ان میں سے ایک ہے'' ساحل عمر نے بڑی سادگی سے کہا۔
''شکریہ ساحل عمر۔ آپ بہت عظیم آرٹسٹ ہیں۔ میں اپنے گستاخ جملے کی معافی چاہتا ہوں۔'' بازغر نے بڑے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔
''کوئی بات نہیں مسٹر بازغر۔'' ساحل عمر نے مسکراتے ہوئے کہا ''ویسے میں آپ کے چیلنج کی وجہ اب تک نہیں سمجھ سکا۔''
''ساحل عمر صاحب یہ ایک عجیب و غریب چیتا ہے۔'' بازغر نے اس کا سوال پھر نظر انداز کر دیا۔ ''بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ اس کا نام تہمکال ہے۔''
''تہمکال.....! بڑا پراسرار نام ہے۔'' ساحل عمر نے حیران ہو کر کہا۔
بازغر نے جواب میں کچھ نہ کہا وہ چند لمحے خاموش رہا۔ اس کی نظریں ڈرائنگ روم کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیلی۔ اس نے ساحل عمر کی طرف اپنا چہرہ گھمایا اور بولا ''کیا میں آپ کا اسٹوڈیو دیکھ سکتا ہوں۔''
فوراً ہی ساحل عمر کی زبان پر لفظ ''نہیں'' آیا۔ اس کے اسٹوڈیو میں آج تک کوئی اجنبی آدمی داخل نہیں ہوا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ بازغر اس کے اسٹوڈیو میں داخل ہو لیکن وہ لفظ ''نہیں'' کو

زبان سے ادا نہیں کر پایا۔ اس نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ ''جناب! مجھے بہت خوشی ہو گی آپ کو اپنا اسٹوڈیو دکھا کر۔'' اسے اپنے اس جملے پر اپنے اس لہجے پر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ یہ انداز ساحل کے لئے بالکل اجنبی تھا۔

وہ بازغر کو اپنے ساتھ لے کر اٹھا۔ اس کا اسٹوڈیو لاک تھا۔ اس نے اپنا کمرہ کھولا۔ اندر جا کر لائٹ جلائی اور بازغر کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ''آیئے۔''

''اوہ..... شکریہ ساحل عمر آپ بڑے مہربان شخص ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے آج تک کسی اجنبی شخص کی اتنی پذیرائی نہ کی ہو گی۔'' بازغر اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنا چرمی بیگ گود میں رکھ لیا۔

چیتے کی تصویر والا لفافہ ساحل عمر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے وہ لفافہ ایک رسالے کے درمیان رکھ دیا۔ پھر بازغر سے مخاطب ہوا۔ ''مسٹر بازغر یہ تصویر آپ کو کب چاہئے اور اس کا سائز کیا ہو گا۔''

''یہ دونوں باتیں میں نے آپ پر چھوڑ دیں۔ خود فیصلہ کیجئے۔'' بازغر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ جب چاہیں بنا دیں۔''

''میں اس تصویر کو کافی بڑے سائز میں بناؤں گا۔ ہو سکتا ہے لائف سائز میں بناؤں۔ تقریباً ایک ماہ لگے گا۔ جلدی بھی بنا سکتا ہوں لیکن میں اس تصویر کو پورے سکون سے بنانا چاہتا ہوں۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''ٹھیک ہے جب تصویر بن جائے تو مجھے فون پر اطلاع کر دیجئے گا میں آ کر لے جاؤں گا۔ میرا فون نمبر لکھ لیجئے۔''

بازغر نے جو نمبر بولا وہ ساحل عمر نے ایک پنسل سے رسالے پر نوٹ کر لیا۔

''یہ آپ کا کوئی نیا شاہکار ہے؟'' بازغر نے بورڈ پر لگی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا جو ایک اخباری کاغذ سے ڈھکی ہوئی تھی۔

''جی میری بالکل نئی تصویر ہے میں نے اسے کل ہی مکمل کیا ہے؟'' ساحل عمر نے بتایا۔

''اوہ کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔'' بازغر نے بڑے موذیانہ انداز میں پوچھا۔

''جی ضرور۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر بورڈ کے نزدیک آیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ اس پر لگا کاغذ الگ کر دیا۔

بازغر اس تصویر کو دیکھتے ہی چونک اٹھا ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ غصے سے بولا۔ ''تو یہاں تک پہنچ گیا۔ تیری یہ جرات ہو گئی کہ تو رشاملوک کی پیشانی کا ٹیکہ بن گیا۔ ٹھہر میں ابھی تجھے بتاتا ہوں۔''

ساحل عمر ابھی سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ بازغر کو تصویر دیکھ کر اچانک کیا ہو گیا ہے کہ ایک دم اس کی نظروں کے سامنے منظر بدلا۔ بازغر جو چند لمحوں پہلے بڑے سکون سے بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ یکلخت اسٹول سے اٹھ کر تصویر کی طرف جھپٹا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس بچھو کو اپنے ہاتھ میں

پکڑنا چاہا۔

''ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ' یہ اصلی بچھو نہیں ہے۔'' ساحل عمر نے اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی لیکن ہوا یہ کہ بجائے بازغر کی غلط فہمی دور ہونے کے خود اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ اس کی نگاہوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ بازغر کے جھپٹنے ہی وہ بچھو بڑی تیزی سے پلٹ کر بھاگا اور بورڈ کے پیچھے جا کر کہیں گم ہو گیا۔ تصویر کی پیشانی پر اب محض اس کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ جیسے کسی نے اس بچھو کو بڑی صفائی سے نوچ کر پھینک دیا ہو۔

اسے فوراً نثار فاروقی کا خیال آیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اور ان کی بیٹی نے جو دیکھا وہ ٹھیک تھا۔ اس نے خواہ مخواہ انہیں جھوٹا سمجھا اور ان کے بارے میں الٹی سیدھی رائے قائم کر لی۔

بازغر بچھو کے بورڈ کے پیچھے جاتے ہی خود بھی بورڈ کے پیچھے پہنچ گیا وہ بڑی تیزی سے اس بچھو کو تلاش کر رہا تھا لیکن اب بچھو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ساحل عمر نے اس بچھو کو پلٹ کر تصویر کے پیچھے جاتے دیکھا تھا۔ اسے بورڈ کے پیچھے ہونا چاہیے تھا لیکن وہ وہاں نہ تھا۔ دونوں نے مل کر پورا کمرہ چھان مارا اور وہ کہیں نہیں تھا۔

بازغر کی حالت دیکھنے والی تھی۔ اس کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ ساتھ ہی کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ وہ کچھ ایسے جملے بول رہا تھا۔ ساحل عمر جن کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ بازغر جو بڑے شوق سے اس کا اسٹوڈیو دیکھنے آیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد زیادہ دیر نہیں رکا۔ وہ اپنا چرمی بیگ اٹھا کر بڑی تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ ساحل عمر اسے چھوڑنے گھر کے گیٹ تک آیا لیکن جب تک ساحل عمر گیٹ تک پہنچا وہ گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔

ساحل عمر گیٹ بند کر کے واپس اپنے اسٹوڈیو میں آیا اور تصویر دیکھ کر پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

وہ بچھو اس دلہن کی پیشانی پر ٹیکہ بنا جوں کا توں موجود تھا۔ بالکل تصویر کی طرح۔ ساحل عمر نے ڈرتے ڈرتے اسے چھو کر دیکھا۔ اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی لیکن ابھی کچھ دیر پہلے ساحل عمر نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کیا تھا؟

اس بچھو کو دیکھتے ہی بازغر کیوں غضبناک ہو کر اس پر جھپٹا تھا۔ اس نے ایک عجیب سا نام لیا جو اس وقت اس کے ذہن سے اتر گیا تھا۔ یہ لڑکی تو ایک طرح سے اس کی تخلیق ہے۔ کسی کی آنکھیں، کسی کی ناک اور کسی کے ہونٹ۔ یہ تو کوئی لڑکی نہیں۔ جب یہ کوئی لڑکی نہیں تو پھر اس کا کوئی نام کیسے ہو سکتا ہے۔

اور اس نے یہ مصیبت کیا پال لی ہے۔ اس بچھو میں اچانک جان کیسے پڑ جاتی ہے۔ یہ کہاں غائب ہو جاتا ہے اور پھر اپنی جگہ واپس کیوں آ جاتا ہے۔ بازغر کی اس سے کیا دشمنی ہے یہ بچھو کیا چیز ہے ساحل عمر جوں جوں سوچتا جا رہا تھا الجھتا جا رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے کوشاں ہے۔ ایک عجیب پراسرار سا چکر شروع ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا بیٹا..... خیر تو ہے؟'' اماں اسے اسٹوڈیو میں پریشان حال بیٹھا دیکھ کر دروازے

آ کھڑی ہوئیں۔

"کچھ نہیں اماں۔"

"کون تھا یہ؟"

"وہ اماں ایک تصویر بنوانے آیا تھا۔"

"کس کی تصویر؟" انہوں نے پوچھا۔

ساحل عمر نے رسالے سے لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ اماں نے لفافہ کھول کر تصویر باہر نکالی اور اسے دیکھتے ہی چونک گئیں۔

"میں یہ تو وہی بلی ہے جو بچپن میں تم پر عاشق ہو گئی تھی۔"

"اماں چشمہ لگا کر دیکھیں۔ یہ بلی نہیں چیتا ہے..... چیتا۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

"اتنی اندھی نہیں ہوں نظر آ رہا ہے مجھے یہ چیتا ہے۔ اسے اگر چھوٹا کر دو گے تو یہ وہی بلی بن جائے گا۔" اماں نے بڑے یقین سے کہا۔

"ہاں اماں تم نے صحیح پہچانا..... میں نے بھی اسے ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔" ساحل عمر نے کہا۔

اب اس بات میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ یہ چیتا اس بلی کا "انلارجمنٹ" تھا۔ اس چیتے کو ساحل عمر جانے کتنی مرتبہ خواب میں چھلانگیں مارتا دیکھ چکا تھا۔ اس چیتے کی تصویر میں بڑی دلکشی تھی۔ کوئی ایسی بات تھی کہ آدمی دوبارہ اسے نظر بھر کر دیکھنا چاہتا تھا اور پھر دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔

ساحل عمر سوچ رہا تھا کہ اس چیتے کو وہ کس طرح بنائے۔ اس کے پس منظر میں جنگل تھا۔ کیا وہ جنگل کو اسی طرح رہنے دے یا پیچھے سے جنگل ہٹا کر چیتے کو کسی پہاڑی پر کھڑا کر دے اور پیچھے بہت دور برف پوش پہاڑ دکھا دے لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اسے اس تصویر کا پس منظر بدلنے کا کیا حق ہے۔ بازغر اسے جو تصویر دے گیا ہے اسے وہی بنانا ہو گی یا پھر اس سے اجازت لینا ہو گی۔ بہت غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تصویر کو جیسی ہے ویسا ہی بنا دینا چاہیے۔ البتہ سائز اتنا بڑا رکھا جائے کہ اسے جو دیکھے وہ اسے جیتا جاگتا محسوس کرے۔

کھانا کھا کر اس کا جی چاہا کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ یوں وہ چہل قدمی کا باقاعدہ عادی نہ تھا لیکن کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ کچھ دور ٹہل آئے اماں کو بتا کر وہ باہر نکلا اور چورنگی کی طرف چل دیا۔ چورنگی اس کے گھر سے خاصے فاصلے پر تھی۔ اتنے فاصلے پر کہ بندے کی ٹھیک ٹھاک واک ہو جائے۔ چورنگی پر پان بھی اچھا ملتا تھا وہ چورنگی کی طرف جاتا تو پان ضرور کھاتا تھا۔ ایک پان اماں کے لئے بندھوا لاتا۔ اماں پان کھانے کی عادی نہ تھیں لیکن ساحل عمر کا لایا ہوا پان ضرور کھا لیا کرتی تھیں۔ یہ تو خیر پان تھا اگر ساحل عمر انہیں زہر بھی کھانے کو دیتا تو وہ خوشی سے کھا لیتیں۔

ساحل عمر نے گھر سے نکلتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس خاص وقت میں ابھی خاصا وقت تھا وہ آرام سے چہل قدمی کر کے واپس آ سکتا تھا اس لڑکی کا خیال آتے ہی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ پتہ نہیں کون ہے یہ لڑکی۔ جو کسی گرہ کی طرح بڑی مشکل سے کھلی تھی۔ ایک طویل عرصے

کے بعد اس نے لب کھولے بلکہ بقول اس کے زبان کھولی تھی۔ اس نے اس کی سانگرہ کا دن کیسے معلوم کر لیا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھی بہرحال اچھی باتیں کرتی تھی ساحل عمر کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اس کے سامنے آئے۔

وہ تو خیر اس کے سامنے نہ آئی لیکن بازغر اسکے سامنے ضرور آ گیا وہ سڑک پر لگے ایک بڑے سے درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے سے اچانک اس کے سامنے آ گیا تھا۔ اس طرح اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر ساحل عمر ایک لمحے کو خوفزدہ ہو گیا۔

''آپ مسٹر بازغر۔'' ساحل عمر نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ساحل صاحب پریشان نہ ہوں میں کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔''

''میرا انتظار؟'' ساحل عمر حیران ہوا۔

''جی آپ کا'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''تو آپ میرے گھر آ جاتے۔ آپ اس وقت بھی بڑی عجلت میں گھر سے نکل آئے تھے۔ میں پیچھے پیچھے گیٹ تک آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''ساحل صاحب..... میں اس تصویر کو خریدنا چاہتا ہوں۔'' بازغر نے اچانک موضوع بدل دیا۔ وہ کچھ اسی طرح کی گفتگو کرنے کا عادی تھا کہ کسی کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بڑی خوبصورتی سے گول کر جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ گھر آنے کے بارے میں کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے ایک نیا ہی مسئلہ کھڑا کر دیا۔

''کون سی تصویر؟'' ساحل عمر نے ایسے ہی سوال کیا۔

''اعور اور رشاملوک کی تصویر۔'' بازغر نے الجھی ہوئی بات کی۔

''اس طرح کی تو کوئی تصویر میرے پاس نہیں ہے۔'' ساحل عمر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''بچھو اور لڑکی کی تصویر۔'' بازغر نے آسان زبان میں بات کی۔

''اچھا وہ پینٹنگ۔'' ساحل عمر نے تفہیمی لہجے میں کہا۔

''جو معاوضہ کہو گے ادا کروں گا مگر تمہیں وہ تصویر میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچانا ہو گی؟''

''ایک کروڑ دے سکو گے۔'' ساحل عمر نے ایسے ہی مذاق میں کہا۔

''ایک کروڑ کم ہیں کچھ اور آگے بڑھو۔'' بازغر نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہیں' کیا واقعی آپ سنجیدہ ہیں۔'' ساحل عمر کی حیرت قابل دید تھی۔

''یہ بات کرنے کے لیے میں ایک گھنٹے سے یہاں کھڑا ہوں۔'' بازغر بولا۔

''اس تصویر میں ایسی کیا بات ہے جو آپ اس پر اتنی رقم خرچ کر دینا چاہتے ہیں۔''

''وہ اعور کا بچہ ہماری رشاملوک کی مانگ کا ٹیکہ بن جانا چاہتا ہے۔'' پھر وہی الجھی ہوئی گفتگو۔

''معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی بات بالکل نہیں سمجھا۔''

''سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔'' اس نے ملائم لہجے میں کہا۔

"لیکن میں سمجھنا چاہتا ہوں آپ نے اس پینٹنگ کی اس قدر قیمت لگائی ہے تو اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ضرور ہوگی۔"

"وجہ میں نے بتا دی۔"

"جو میری سمجھ میں نہیں آئی۔" بازغر نے ایک مرتبہ پھر خوبصورتی سے موضوع بدل دیا۔

"میں یہاں کچھ اور سوچ کر آیا تھا لیکن ہو کچھ اور گیا۔"

"مسٹر بازغر آپ کوئی معمہ وغیرہ تو نہیں نکالتے" بالآخر ساحل عمر کو کہنا پڑا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا۔

"جو بات کرتے ہیں وہ کسی معمے سے کم نہیں ہوتی۔" ساحل عمر ہنسا۔

"ساحل عمر صاحب میں پینٹنگ کے بارے میں آپ کا جواب سننا چاہتا ہوں۔" وہ سنجیدہ تھا۔

"اس پینٹنگ کے بارے میں میں مصمم ارادہ کر چکا ہوں کہ کسی کو فروخت نہیں کروں گا۔ چاہے کوئی مجھے اس کا معاوضہ ایک کروڑ سے زیادہ ہی کیوں نہ دے۔" ساحل عمر نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"آپ نہیں جانتے کہ آپ کس مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں۔" بازغر نے ڈرایا۔

"مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ میں اپنے فیصلے اتنی آسانی سے نہیں بدلا کرتا۔"

"اوہ..... میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔" بازغر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "آپ نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔ آپ نہیں جانتے کہ طاغوتی قوتیں آپکے گرد کیسا جال بن رہی ہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ جب آپ تھکال کی پینٹنگ بنا لیں تو مجھے فون کر دیجئے گا۔ میں آ کر لے جاؤں گا اور منہ مانگا معاوضہ دے جاؤں گا۔ سب کا آقا آپکو خوش رکھے۔" یہ کہہ کر وہ درخت کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ساحل عمر کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔ ساحل عمر اپنے رستے پر چل دیا۔ تھوڑا آگے جا کر جب اس نے درخت کی طرف دیکھا تو اسے بازغر نظر نہیں آیا۔ اتنی جلدی وہ کہاں گم ہو گیا۔ اس نے رک کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو وہ اسے سامنے چھوٹی سڑک پر کافی فاصلے پر تیز تیز قدموں سے جاتا نظر آیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس نے اتنا فاصلہ چند سیکنڈوں میں کیسے طے کر لیا۔

ساحل عمر پان کھا کر اور ایک پان لے کر گھر واپس آیا تو خاصا الجھا ہوا تھا۔ بازغر اسے اچھا خاصا پریشان کر گیا تھا۔ بچھو کی طرف اس کا جھپٹنا اور بچھو کا ایک دم تصویر کے پیچھے چلے جانا اور اس کے جانے کے بعد پھر اپنی جگہ پر واپس آ جانا اور بازغر کا گھر سے باہر اس کا انتظار کرنا۔ اس تصویر میں اس کی غیر معمولی دلچسپی اور غیر معمولی معاوضے کی پیشکش۔ یہ ساری باتیں اس کی الجھن میں اضافہ کر رہی تھیں۔

وہ اپنے اسٹوڈیو میں ایک اسٹول پر آ کر بیٹھ گیا۔ ٹیلیفون اٹھا کر اس نے اپنی گود میں لیا اور مسعود آفاقی کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری گھنٹی پر ٹیلیفون اٹھا لیا گیا ادھر سے مسعود کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو۔"

''یار مسعود وہ نثار فاروقی ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' ساحل عمر نے بات شروع کی۔

''میں سمجھا نہیں۔'' مسعود نے کہا۔

جواب میں ساحل عمر نے بازغر کی آمد سے لیکر اس کے جانے تک ساری روداد سنا دی۔

''تم نے خواہ مخواہ ان پر شک کیا۔'' مسعود نے ساری داستان سن کر کہا۔

''وہ بات ہی انہوں نے کچھ ایسی کہی کہ اس پر یقین آنا مشکل تھا ہاں اگر میں خود اپنی آنکھ سے بچھو کو پیچھے جاتے ہوئے نہ دیکھ لیتا تو اب بھی یقین نہ کرتا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اب تو یقین آ گیا کہ نثار فاروقی نے جو کچھ بتایا سچ بتایا تھا۔'' مسعود نے کہا ''شہزادے تم نے اس تصویر کو بیچ کیوں نہیں دیا۔ اتنے اچھے پیسے اب کون دے گا۔''

''مجھے یہ تصویر اب فروخت نہیں کرنی۔'' ساحل عمر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''یار' اس تصویر کا گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔'' مسعود آفاقی نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ اس تصویر میں کوئی اسرار ضرور ہے۔ انجانے میں مجھ سے کوئی انوکھا کام ہو گیا ہے لیکن میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں بچپن سے ہی اس طرح کی باتوں کا عادی ہوں۔ وہ چیتے کی شکل والی بلی پورا چیتا بن کر پہلے خوابوں میں نظر آئی تھی اب بازغر اس کی تصویر بنانے کو دے گیا ہے۔ یار اس تصویر میں بڑی کشش ہے۔ میں اسے ضرور بناؤں گا۔ ساحل عمر نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''بچپن والی بلی بڑی ہو کر چیتا بن کر تمہارے پاس پہنچ گئی۔ خوابوں والی کو تم نے خود ہی پینٹ کر لیا۔ اب وہ لمبی زبان والی رہ گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کہیں راستے میں ہی ہو گی۔ پہنچا ہی چاہتی ہے۔'' مسعود آفاقی نے اسے یاد دلایا۔

''او..... یار معاف کر دو کس کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس کا خیال آتے ہی جسم کا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔'' ساحل ایک جھرجھری لے کر بولا۔

''کیا تم نے ناصر مرزا سے بات کی۔'' مسعود نے پوچھا۔

''نہیں تو۔''

''یار ناصر سے بات کر لو وہ ان معاملات کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

''اب فون پر کیا بات کروں اس کے گھر تو جانا ہی ہے وہیں اطمینان سے بات کریں گے؟''

''چلو ٹھیک ہے' بہر حال اپنا خیال رکھو' اماں سے کہنا کہ وہ تم پر پڑھ کر پھونک دیں۔''

''وہ پہلے ہی مجھ پر کیا کم جھاڑ پھونک رکھتی ہیں۔ اگر میں نے ان کو کچھ بتا دیا تو وہ ہر وقت پھونکیں مارتی' میرے پیچھے گھومیں گی۔''

''یار اماں تم سے بہت محبت کرتی ہیں۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی جان تمہارے اندر ہے۔''

"اس میں کوئی شبہ نہیں۔" ساحل عمر نے تائید کی۔ "آج کل وہ میری شادی کے چکر میں ہیں۔ روز پیچھے پڑی رہتی ہیں۔"

"تو بھائی کر کیوں نہیں لیتے شادی۔" مسعود نے ہنس کر کہا۔

"میری بیوی ان کے لئے ملک الموت ثابت ہو گی۔" ساحل عمر نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"تمہارا مطلب ہے وہ انہیں پریشان کرے گی۔"

"اونہیں یار' بڑی بی میری شادی کے انتظار میں ہیں۔ میری شادی ہوتے ہی یہ چل بسیں گی۔" ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ محض تمہارا خیال ہے میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری شادی ہونے کے بعد وہ بچے کا انتظار شروع کر دیں گی۔" مسعود آفاقی نے ہنس کر کہا۔ "ویسے یار تم شادی کرتے کیوں نہیں ہو۔"

"لڑکی کہاں ہے؟"

"تمہارے لئے لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ کہو تو کوئی ماڈل گرل تمہاری طرف بھیج دوں؟"

"شادی کے لیے مجھے انوکھی لڑکی چاہیے۔"

"مثلاً جس کی آٹھ آنکھیں ہوں' آٹھ پاؤں ہوں' آٹھ سر ہوں' آٹھ گز کی زبان ہو۔"

"اب تم بہکنے لگے اچھا اللہ حافظ۔" ساحل عمر نے اس کا جواب سنے بغیر ہی ٹیلی فون بند کر دیا۔

ٹیلی فون بند کر کے اس نے اپنی گود سے اٹھا کر نیچے رکھا تو اچانک ہی اس کی آنکھوں کے سامنے اس لمبی زبان والی کی شبیہ اس کے سامنے لہرا گئی۔

بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھا تو ایک نئی مصیبت کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔ بچپن میں ایک چیتے نما بلی نے اس کا پیچھا کیا۔ بمشکل اس سے جان چھوٹی۔ پھر جب وہ پندرہ سولہ سال کا ہوا تو ایک دن ایک نئی مصیبت نے اسے آ گھیرا۔

وہ ایک خاص دن تھا اس دن مکمل سورج گرہن پڑنے والا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا بارہ یا ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔ ساحل عمر مکمل سورج گرہن کے شوق میں گھر سے باہر نکل آیا اور برآمدے میں کھڑے ہو کر ایک کالا شیشہ آنکھ پر رکھ کر سورج گرہن کا نظارہ کرنے لگا۔

اسی وقت کچھ ہوا۔ ایک دم اس کے جسم میں جھٹکا سا لگا اس کے ہاتھ سے شیشہ چھوٹ گیا اور اس کا رخ بھی بدل گیا شیشہ برآمدے کے فرش پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اچانک اس کو کیا ہوا۔ ایک دم اس کی نظر سامنے اٹھی تو اسے اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ سامنے آم کے درخت کے نیچے تھی ایک دم کالی بھجنگ لال انگارہ آنکھیں سفید چمکتے دانت اور ان دانتوں کے درمیان لٹکتی ہوئی ایک فٹ لمبی زبان۔ وہ بڑی تیزی سے کھڑی ہوئی اور اپنی سرخ زبان اندر باہر کر کے بانہیں پھیلائیں اور اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

ساحل عمر سورج گرہن دیکھنا بھول گیا وہ تیزی سے گھر کے اندر پہنچا اور اپنی ممی سے لپٹ

گیا۔ ممی نے ساحل عمر کی حالت دیکھی تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ آنکھیں وحشت سے پھٹی تھیں اور پورا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

''کیا ہوا میری جان؟'' وہ پریشان ہو کر بولیں۔

''ممی..... وہ..... وہ.....'' اس سے بولا نہ گیا تو اس نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا ہے وہاں؟ آؤ میرے ساتھ؟'' ممی اس کو اپنے ساتھ لگائے گھر سے باہر نکلیں۔

برآمدے میں کھڑے ہو کر انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اس وقت سورج مکمل گرہن میں آ چکا تھا۔ ایکدم اندھیرا چھا گیا تھا۔

سورج گرہن کے اثرات سے بچنے کے لیے وہ اسے فوراً واپس گھر میں لے آئیں۔ اس کے بیڈروم میں آ کر ایئر کنڈیشنر کھول دیا اور اماں جو ساحل عمر کی حالت دیکھ کر پیچھے پیچھے آ گئی تھیں۔ انہیں ممی نے جوس لانے کو کہا۔ اس اثناء میں وہ ساحل عمر کو اپنے قریب کر کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ جب جوس وغیرہ پی کر اس کی حالت سدھری تو ممی نے اس سے پوچھا۔

''بیٹا باہر تم نے کیا دیکھا تھا کہ اس قدر پریشان ہو گئے۔''

ساحل عمر نے سارا واقعہ من وعن سنا دیا۔ اس اثناء میں سورگرہن سے نکل آیا تھا۔ اب ہر سو روشنی پھیل چکی تھی۔ ممی' اماں کو لیکر باہر نکلیں۔ انہوں نے باہر لگا ہر درخت' ہر پتا چھان مارا لیکن زبان والی کا کہیں پتہ نہ لگا۔

بات آئی گئی ہو گئی چند دنوں کے بعد ساحل عمر سوتے میں ڈر گیا۔ آدھی رات کو اس کی چیخ سنائی دی۔ اس کے ممی پاپا دونوں اٹھ کر بھاگے۔ ساحل عمر سخت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے خواب میں لمبی زبان والی کو دیکھا تھا جو اس کے بیڈ کے نزدیک کھڑی تھی۔ لمبی زبان باہر کو لٹکی تھی اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا چینی کا پیالہ تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ ساحل عمر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ لمبی زبان والی خنجر سے اس کے جسم میں زخم لگا کر اس خالی پیالے کو اس کے خون سے بھرنا چاہتی ہو۔

اس کے بعد وہ تواتر سے اسے نظر آنے لگی۔ کبھی خواب میں تو کبھی جاگتے میں۔ ایکے ہاتھ میں چینی کا بڑا سا سفید پیالہ ہوتا اور ایک ہاتھ میں خنجر اور وہ اس کا خون نکالنے کے درپے ہوتی۔

ایک عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ مختلف عاملوں کو آزمایا گیا جھاڑ پھونک ہوئی۔ تعویذ گنڈے ہوئے۔ آٹھ نو مہینے کی کوششوں کے بعد کہیں جا کر اس لمبی زبان والی سے ساحل عمر کی جان چھوٹی۔

اس واقعہ کو گزرے ہوئے اگرچہ دس گیارہ سال ہو چکے تھے لیکن اب بھی جب کبھی اس کا خیال آ جاتا تو ساحل عمر کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے۔ کبھی کبھی اس کے دل میں خیال آتا کہ وہ اس منحوس شکل عورت کی تصویر بنائے لیکن ایسا سوچ کر ہی وہ کانپ اٹھتا۔ کوئی چیز اندر سے اسے منع کرتی۔ خبردار! اس کی تصویر ہرگز نہ بنانا ورنہ وہ گلے پڑ جائے گی۔

اس وقت بھی اس کے خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اس نے اپنی تازہ بنائی ہوئی تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بچھو اپنی تمام تر خطرناکی کے ساتھ اس حسین دلہن کی پیشانی پر موجود تھا۔ ساحل عمر نے کمرے سے نکلنے کے لئے لائٹ بجھائی تو اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی کا اچانک بجنا' لائٹ کا بجھنا اور منحوس شکل عورت کا خیال۔ ساحل عمر ایک دم چونک اٹھا۔ ایک لمحے کو اس پر لرزا سا طاری ہو گیا۔ وہ لائٹ آن کر کے واپس پلٹا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔

اب بھی گھنٹی بج رہی تھی' وہ جان گیا کہ اس وقت کس کا ٹیلی فون آیا ہے ریسیور اٹھا کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور دھیرے سے بولا۔ ''جی۔''

''ہائے رانجھن' تمہارے اس جی پر ہزار بار قربان' اس قدر خوبصورت انداز میں جی کہتے ہو کہ بس جی چاہتا ہے کہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاؤں تمہیں دیکھوں اور دیکھ کر جی اٹھوں۔ کہو سالگرہ کا تحفہ پسند آیا۔'' ساتھ ہی اس کی کھنک دار ہنسی سنائی دی۔

''ہاں بڑا مزے دار تحفہ تھا کھا کر بڑا مزہ آیا۔ ایک بات پوچھوں؟'' وہ بولا۔

''جانتی ہوں کیا پوچھو گے۔ یہی نا کہ مجھے تمہاری سالگرہ کا کیسے معلوم ہوا۔''

''ہاں یہی پوچھنا چاہتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ تمہیں میری تاریخ پیدائش کا کیسے پتہ چلا۔''

''آدمی کو کسی بات کی جستجو ہو' سچی لگن ہو' تلاش میں خلوص ہو تو ہر آرزو پوری ہو جاتی ہے۔ میرے رانجھن تمہیں یاد نہیں کہ تم نے تین چار سال پہلے کسی میگزین کو انٹرویو دیا تھا۔ اسی انٹرویو میں تم نے اپنی ڈیٹ آف برتھ بھی بتائی تھی۔ وہ پرانا رسالہ ایک دوست کے یہاں اچانک میرے سامنے آ گیا۔ بس میں نے وہاں سے تمہاری ڈیٹ آف برتھ نوٹ کر لی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی۔ پھر توقف کر کے بولی۔ ''میری ذہانت کے قائل ہو گئے نا۔''

''میں مان گیا تمہیں'' ساحل عمر خوش ہو کر بولا۔ ''اپنا نام بتانا پسند کرو گی؟''

''میں بے نام ہوں۔ تم میرا جو چاہے نام رکھ لو۔ جس رنگ میں چاہے رنگ لو۔'' وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

''ناگن کہوں؟'' ساحل عمر نے چھیڑا۔

''ہاں کہو..... لیکن اتنا یاد رکھنا سچ مچ ناگن بن جاؤں گی تمہیں ڈس لوں گی۔''

''بڑے خطرناک ارادے ہیں۔''

''میرے ارادے واقعی خطرناک ہیں جب ملو گے تو پتہ چلے گا۔''

''نام تک چھپاتی ہو اور بات کرتی ہو ملنے کی' کیا خوب چیز ہو؟'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''ہائے رانجھن' ناراض کیوں ہوتے ہو بتائے دیتی ہو اپنا نام' میرا نام ورشا ہے ورشا۔''

''ورشا.....'' وہ حیرت زدہ ہوا۔ ''ورشا ہو' کہاں کہاں برسی ہو؟''

''جہاں برستی ہوں کھیت کھلیان ایک کر دیتی ہوں۔ ہر چیز بہا لے جاتی ہوں' اجاڑ کر رکھ دیتی ہوں۔'' اچانک اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس کے لہجے میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ اس کے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''گویا جنونی ہو؟'' وہ سنبھل کر بولا۔

''صحیح سمجھے' میں واقعی جنونی ہوں اور آج کل تمہارے جنون میں مبتلا ہوں۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ بولو' ہم کب ملیں گے۔'' اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''جب تم چاہو۔'' یہ بات بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گئی۔

''ٹھیک ہے پھر میں کل آ رہی ہوں تمہارے پاس میرا انتظار کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے دن وہ عجب انداز سے اس کے سامنے آئی۔ دوپہر کے وقت اسے کوریئر سے ایک لفافہ ملا۔ لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک تصویر نکلی۔

ایک لڑکی کیمرے کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ اس کے چست لباس میں پیٹھ پر ایک پان بنا ہوا تھا اور اس پان سے گوری جلد نظر آ رہی تھی۔

اس جلد پر جو چیز نظر آ رہی تھی اسے دیکھ کر وہ پتھر کا ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

پیٹھ پر جہاں پان بنا ہوا تھا اور جس سے اس کی گوری جلد جھلک رہی تھی۔ اس جلد پر ایک بچھو بنا ہوا تھا۔ جہاں بچھو بنا ہوا تھا وہاں کھال کا رنگ ہلکا براؤن سا تھا۔ بچھو کا منہ نیچے کی طرف تھا اور اس کا سائز اصل بچھو جیسا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی بلاک کے ذریعے جلد پر چھاپا گیا ہو۔

وہ لڑکی جو بھی تھی اس کی صورت کیمرے کی طرف نہ تھی۔ اس کی تصویر کمر کے نیچے تک تھی۔ وہ شاید کسی میز یا اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت چست قمیض پہنے ہوئے تھی جو پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ پسینے میں بھیگی ہونے کی وجہ سے قمیض جلد سے چپک گئی تھی۔ جہاں جہاں قمیض جلد سے چپک گئی تھی وہاں جلد صاف نظر آ رہی تھی۔ خمدار اور نازک کمر تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سر کی پشت پر رکھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ نیل پالش لگے لمبے اور ترشے ہوئے ناخن خوبصورت مخروطی انگلیاں۔ ایک انگلی میں سرخ اور سفید رنگوں والے نگوں کی نازک سی انگوٹھی۔ وہ ایک انوکھی تصویر تھی۔ سب سے انوکھی بات پیٹھ پر بنا بچھو کا نشان تھا جسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو اپنا آپ بھول گیا تھا۔ پتھرا گیا تھا۔ یہ ایک ایسی تصویر تھی جو اس کی پینٹنگ کے لئے آئیڈیل تھی۔ یہ انہیں تصویروں میں سے ایک تھی جنہیں دیکھ کر وہ بنانے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔

اس تصویر کو دیکھ کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے ضرور پینٹ کرے گا۔ فی الحال تو اسے چیتے کی تصویر بنانی تھی جس کے لئے اس نے بازغر سے وعدہ کر لیا تھا۔ چیتے کی تصویر میں بظاہر کوئی انوکھا پن نہ تھا لیکن وہ چیتا بذات خود انوکھا تھا۔ اس کا نام بھی کیا خوب تھا..... جہکال.....

دوسرے دن سے اس نے چیتے کی پینٹنگ پر کام شروع کر دیا۔ بچھو اور دلہن والی تصویر اس نے اپنے اسٹوڈیو سے نکال لی اور اسے فریم کروا کے اپنے بیڈروم میں لگا لی۔ ایسی جگہ کہ اگر وہ بیڈ پر لیٹا ہو تو تصویر عین اس کی نظروں کے سامنے ہو۔ جب وہ صبح سو کر اٹھے' پلکوں کی جھالر اٹھے تو اس کی دید ہو۔ اس پینٹنگ میں اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے عشق ہوتا جا رہا تھا' اس تصویر سے' اس تصویر والی سے جو اس کے خوابوں میں دکھائی دیتی تھی۔

اس تصویر کو اس نے سینکڑوں تصویروں میں سے نکالا تھا۔ جو شکل وصورت اسے خواب میں دیکھ کر اس کے ذہن میں رہ جاتی تھی۔ اس یادداشت کے سہارے اس نے سیکڑوں تصویریں دیکھ کر اس کا انتخاب کیا تھا۔ کہیں سے آنکھیں لی تھیں، کہیں سے ناک لی تھی، کہیں سے ہونٹ چرائے تھے کہیں سے چہرے کی گولائی لی تھی۔ پیشانی، بھنویں، پلکیں، زلفیں، کان، گردن..... کون سی ایسی چیز تھی جس پر اس نے غور نہیں کیا تھا۔ بظاہر یہ ایک خیالی تصویر تھی لیکن اصل لڑکی بھی تو خیالی تھی۔ محض ایک تصویر.....

ساحل عمر نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے؟ وہ اسے خوابوں میں نظر آتی تھی۔ یہ خواب بڑے واضح اور صاف ہوتے تھے۔ وہ لڑکی اسے مختلف انداز میں نظر آتی تھی۔ کبھی وہ اسے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ پتھر پر اس کا سفید ریشمیں لباس پھیلا ہوا تھا اور ساتھ ہی جھاگ اڑاتا تیز رفتار چشمہ بہہ رہا تھا۔ کبھی وہ پہاڑوں کے درمیان چھوٹے سے راستے پر دکھائی دیتی۔ سفید ریشمیں لبادہ۔ جاتے جاتے وہ اچانک مڑ کر دیکھتی۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ایک دم روشنی سی ہو جاتی۔ ہیرے سے نگینگا اٹھتے، ہونٹوں پر جان لیوا مسکراہٹ پھیل جاتی۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں میں گم ہو جاتی۔ کبھی وہ اس لڑکی کو جھیل کنارے بیٹھا دیکھتا۔ وہ جھکی ہوئی جھیل کے پانی میں کچھ دیکھ رہی ہوتی۔ جیسے پانی میں اپنا عکس دیکھ رہی ہو۔ آئینہ دیکھ رہی ہو، اپنے حسن پر ناز کر رہی ہو۔

وہ لڑکی ہفتے دو ہفتے میں اس کے خوابوں میں ضرور آ جاتی تھی لیکن جب اس نے یہ تصویر مکمل کی تھی تب سے وہ ایک بار بھی اسے نظر نہ آئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا تھا۔

پھر ایک رات وہ اسے اچانک نظر آئی۔ وہ بڑی اذیت میں تھی۔

اسی رات ساحل عمر تصویر کو دیکھتے دیکھتے سو گیا تھا۔ تب اس نے اسے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ پتھر پر کھڑی تھی۔ چشمے کا پانی اس کے پیروں کو چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو۔ اب تک وہ لڑکی جتنی بار بھی نظر آئی تھی۔ وہ کبھی ساحل عمر سے مخاطب نہ ہوئی تھی بلکہ ساحل عمر نے خود کو اس کے ساتھ کھڑے ہوئے آج تک نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے تنہا نظر آتی تھی لیکن آج کے خواب میں وہ اکیلی نہ تھی۔ ساحل عمر بھی کہیں سے گھومتا گھماتا اس چشمے پر نکل آیا تھا اور اسے پتھر پر کھڑا دیکھ کر اس کے نزدیک چلا گیا تھا اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر اس سے پوچھا تھا۔

"کیا ہوا تمہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم کیا ہوا ہے۔ میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"آخر کیا کیا ہے میں نے؟" ساحل عمر فکر مند ہو کر بولا۔ "مجھے کچھ تو بتاؤ۔"

"میرے جسم میں آگ سی لگی ہے۔ اسی لئے میں یہاں پتھر پر کھڑی ہوں۔ ٹھنڈا پانی میرے پیروں کو لگ رہا ہے۔ اس پانی کی وجہ سے مجھے سکون مل رہا ہے لیکن یہ سکون عارضی ہے۔ چشمے سے باہر آؤں گی تو پھر وہ نیلی آگ مجھے اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ یہ تم نے کیا کر دیا ہے۔

مجھے اس اذیت سے نجات دلاؤ۔'' اس نے بڑے کرب بھرے لہجے میں کہا۔

''لیکن کیسے؟ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میں تمہیں تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔''

''مجھے نہیں معلوم یہ سب کیوں ہوا ہے لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ یہ آگ تم نے لگائی ہے۔''

''میں نے لگائی ہے تو میں اسے بجھا دوں گا۔تم بتاؤ تو سہی یہ آگ کیسے بجھے گی۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ اذیت سے بولی۔ ''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نیلی آگ میرے وجود کو پگھلا کر رکھ دے۔''

''نہیں میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر نے اس پتھر کی طرف چھلانگ لگائی جہاں وہ لڑکی کھڑی تھی لیکن وہ اس پتھر تک نہ پہنچ سکا۔ وہ چشمے میں گر گیا اور تیز رفتار چشمہ اسے بہا کر لے چلا۔ اس نے چشمے سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں چلائے تو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

آنکھ کھلی تو اس نے خود کو اپنے کمرے میں پایا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اس پر ایک گھبراہٹ سی طاری تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن کیا۔ کمرے میں ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ چھت کا پنکھا بھی چل رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا بدن بھیگا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر پنکھا تیز کیا اور بیڈ پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

پھر ساحل عمر نے اس تصویر پر نظر ڈالی۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں وہ کچھ زیادہ ہی پر اسرار محسوس ہو رہی تھی۔ تصویر جوں کی توں تھی، اس میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ خواب والی لڑکی کو آج اس نے بہت قریب سے دیکھا۔ اس تصویر اور لڑکی کی صورت میں کوئی فرق نہ تھا۔ فرق اگر تھا تو صرف اتنا کہ تصویر میں وہ دلہن کے روپ میں تھی اور خواب میں ایک سفید ریشمیں لبادے میں نظر آتی تھی۔ نین نقش یہی تھے البتہ چہرے کے رنگ روپ میں تھوڑا فرق تھا۔

وہ خواب میں اس لڑکی کو پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے ایسی کیا غلطی سرزد ہوئی ہے کہ وہ اذیت میں مبتلا ہو گئی۔ یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اس کا اس لڑکی سے کیا ربط تھا۔ اب تک ساحل عمر نے اسے تنہا دیکھا تھا۔ مختلف انداز میں مختلف جگہوں پر۔ اس طرح خواب میں کسی اجنبی لڑکی کا دکھائی دینا کوئی ایسا پریشان کن مسئلہ نہ تھا۔ بہت سے لوگوں کو ایک ہی خواب ایک ہی انداز میں برسوں دکھائی دیتا رہتا ہے لیکن خواب میں پہلی بار خود کو اس لڑکی کے ساتھ دیکھنا اور اس طرح بات کرنا جیسے وہ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ پھر اس کا اذیت میں مبتلا ہونا اور یہ بتانا کہ یہ اذیت اس کی وجہ سے اسے ملی ہے۔ کوئی نیلی آگ اسے جلا رہی ہے۔ آگ تو سرخی مائل پیلی ہوتی ہے۔ یہ نیلی آگ کہاں سے آ گئی۔ اس سے آخر ایسی کیا غلطی سرزد ہوئی۔ اگر کوئی غلطی ہوئی بھی تو وہ اس سے کس طرح متاثر ہو گئی۔ یہ بات سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔

ساحل عمر کمرے کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں پہنچا۔ اسے پیاس لگ رہی تھی۔ فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال کر دو گلاس ٹھنڈا پانی پیا۔ ایک نظر اماں کے کمرے کی طرف ڈالی۔ ان کے کمرے کی لائٹ جلی ہوئی تھی۔ اس وقت دو بجے کا عمل تھا۔ وہ شاید تہجد کی نماز کے لیے اٹھی ہوں۔ وہ جلدی سے پانی پی کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اگر انہوں نے اسے اتنی رات گئے اپنے کمرے سے باہر دیکھ لیا تو سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور اس وقت وہ کسی بھی طرح کے سوال جواب کے موڈ میں نہ تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے ٹیبل لیمپ بجھا کر ٹیوب لائٹ جلائی اور یونہی بے خیالی میں ٹہلنے لگا۔ اس کا دماغ اس معمے کو حل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ محض خواب ہو‘ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو...... لیکن اس بات پر اس کا یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس لڑکی کا کربناک چہرہ‘ نیلی آگ کا ذکر‘ اس تکلیف کا اسے مورد الزام ٹھہرانا‘ سب سچ معلوم ہو رہا تھا لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس بات کا کس طرح پتہ چلائے جس کی وجہ سے لڑکی کرب میں مبتلا ہوئی ہے۔

یہ سوچتے سوچتے وہ اس تصویر کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظر اس کی پیشانی پر بنے بچھو پر تھی۔ تب اسے اچانک بازغر یاد آیا۔ وہ اس بچھو کو دیکھ کر کیسا طیش میں آ گیا تھا۔ وہ بے اختیار اس بچھو پر جھپٹا تھا۔ اس نے ایک دو اجنبی نام بھی لیے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ یہ بچھو دوڑ کر تصویر کے پیچھے چلا گیا تھا اور باوجود کوشش کے مل نہیں سکا تھا۔

اوہ‘ اب سمجھ میں آیا۔ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ اس نے اس لڑکی کی پیشانی پر ٹیکہ بنانے کے بجائے بچھو بٹھا دیا۔ تصویر انوکھی ضرور ہو گئی لیکن وہ بچھو لڑکی کی اذیت کا باعث بن گیا۔ اس خیال نے آہستہ آہستہ یقین کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا دل مطمئن ہوتا چلا گیا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فریم سے تصویر کو نکال کر اپنے اسٹوڈیو میں جا کر بورڈ پر لگایا اور ٹیوبوں سے مختلف رنگ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور برش اٹھا کر مختلف رنگوں کی آمیزش کرنے لگا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ اگرچہ اس نے یہ بچھو بڑی محنت سے بنایا تھا اور وہ اس کی توقع سے کہیں اچھا بن گیا تھا۔ بڑا زبردست‘ بہت جاندار لیکن اس بچھو کو صفحۂ ہستی سے مٹائے بغیر چارہ نہ تھا۔ اس بچھو کو کسی کی پیشانی کا ٹیکہ بنا کر اس نے بہت زیادتی کی تھی۔ وہ نازک سی لڑکی اگر اس بچھو کو اپنی پیشانی پر محسوس کر کے کسی کرب میں مبتلا تھی تو وہ حق پر تھی۔ ہماری ناک پر اگر مکھی بھی بیٹھ جائے تو ہم کیسے بے چین ہو جاتے ہیں۔

برش پر رنگ لگا کر وہ بچھو کو مٹانے لگا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس بچھو کو مٹا کر اس کی جگہ ایک خوبصورت ٹیکہ بنائے گا۔ تب اس دلہن کی کچھ اور ہی شان نکل آئے گی۔

ابھی اس نے اسٹروک لگانے کے لئے برش بچھو کے نزدیک کیا ہی تھا کہ اسے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کر لینا پڑا۔

اس بچھو نے ایک دم سر اٹھایا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بڑی تیزی سے پلٹ کر تصویر کے

پیچھے چلا گیا تھا۔

ساحل برش میز پر پھینک کر فوراً بورڈ کے پیچھے گیا کہ دیکھ سکے کہ وہ بچھو کدھر جا رہا ہے لیکن اتنی دیر میں وہ بچھو جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ساحل عمر اسے ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔ اس نے کمرے کا ہر گوشہ، ہر کونہ تلاش کر لیا لیکن اس بچھو نے نہ ملنا تھا نہ ملا۔

اماں ناشتہ بنا کر ساحل عمر کو اٹھانے کے لیے اس کے کمرے کی طرف جانے لگیں تو انہوں نے اس کے اسٹوڈیو نما کا دروازہ کھلا پایا۔ انہوں نے اندر جھانک کر دیکھا تو ساحل عمر ادھر ادھر کچھ تلاش کرنے میں مصروف تھا۔

''بیٹا خیریت تو ہے یہ تم صبح ہی صبح کمرے میں کیا تلاش کر رہے ہو؟'' اماں نے دروازے پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

''اماں! بس خیریت نہیں ہے۔ ذرا تم اندر آ کر دیکھو۔'' اس نے اپنی پریشانی بیان کی۔

''ہائے کیا ہوا؟'' اماں نے فوراً اپنا دل تھام لیا اور بہت سنبھل سنبھل کر آگے بڑھیں۔ جب ساحل عمر کے نزدیک پہنچیں تو انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''ہاں کیا ہوا؟''

''اماں یہ دیکھو۔'' اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے بھیا وہ بچھو کہاں گیا؟'' وہ حیران ہو کر بولیں۔

''اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' اماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں اماں کہ اس دلہن کی پیشانی پر میں نے جو بچھو بنایا تھا وہ میری آنکھوں کے سامنے چل کر اس بورڈ کے پیچھے کہیں غائب ہو گیا۔'' ساحل عمر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اماں کا تو یہ سن کر حال برا ہو گیا۔ وہ بھاگ کر فوراً کمرے سے نکلیں اور دھپ سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور وہیں سے چلائیں۔ ''ساحل بیٹا فوراً باہر آ جاؤ۔''

''اماں آ رہا ہوں۔ ذرا ایک نظر اور ڈال لوں۔''

پھر وہ جب کمرے سے باہر آیا تو اماں دل پکڑے وحشت بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگیں اور بولیں۔ ''ساحل وہ بچھو کیا واقعی غائب ہو گیا۔ تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں اماں، وہ بچھو واقعی غائب ہو گیا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''بھیا تمہیں اس بات سے ڈر نہیں لگ رہا۔''

''ہاں اماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دیکھو میں کانپ رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بیٹا تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ہائے پتہ نہیں وہ کیا چیز تھی میں تو اسے پہلی دفعہ دیکھ کر ہی ڈر گئی تھی۔ ساحل اب کیا ہو گا؟''

"اماں کچھ نہیں ہوتا..... آؤ ناشتہ کر لو۔" ساحل عمر نے بڑے اطمینان سے کہا اور پھر وہ ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

چائے پیتے ہوئے اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے اماں سے پوچھا۔ "اماں مرجینا ہے؟"

"وہ تمہارے بیڈروم کی صفائی کر رہی ہے۔" اماں نے بتایا۔

ملازمہ کا اصل نام تو شاہدہ تھا لیکن ساحل عمر نے اس کا نام مرجینا رکھا ہوا تھا۔ وہ سانولے رنگ کی ایک نوجوان لڑکی تھی۔ پہلے اس گھر میں اس کی ماں کام کرتی تھی لیکن جب سے وہ بیمار رہنے لگی تھی تو شاہدہ نے کام شروع کر دیا تھا۔ اماں کو اس کا کام اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے پھر اسے مستقل کر لیا۔ ساحل عمر نے اس کا نام مرجینا کیوں رکھا تھا۔ یہ بات خود اسے بھی معلوم نہ تھی۔ بس پہلے دن جیسے ہی اس نے اسے دیکھا مرجینا کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اماں نے بھی اس نام قبول کر لیا۔ وہ بھی اسے مرجینا کہہ کر بلانے لگیں اور شاہدہ اس نئے نام پر خوش خوش دوڑی چلی آتی۔

"اماں ذرا اسے بلا کر میرے اسٹوڈیو کی صفائی کروا دو۔" ساحل عمر نے کہا۔

"اچھا بلاتی ہوں۔" اماں یہ کہہ کر اٹھنے لگیں۔

"پر ایک بات سنو اماں..... اسے کوئی کہانی سنانے نہ بیٹھ جانا ورنہ وہ کمرے میں گھسے گی بھی نہیں۔"

"اتنا میں سمجھتی ہوں۔" اماں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں اتنا ضرور کہہ دینا کہ کوئی کیڑا مکوڑا نظر آئے تو مجھے فوراً بلا لے۔" ساحل عمر نے رعایت کی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ جاتے ہوئے بولیں۔

مرجینا نے ساحل عمر کے اسٹوڈیو کی ایک ایک چیز صاف کر دی لیکن اسے لال بیگ کے سوا وہاں کوئی کیڑا نہ دکھائی دیا۔

ساحل عمر نے بچھو کی جگہ پر کر کے اس کی پیشانی پر ٹیکہ بنا دیا۔ ٹیکہ بن جانے کے بعد اس لڑکی کی پیشانی جگمگا اٹھی۔ دو تین گھنٹے کی محنت کے بعد وہ تصویر فریم ہو کر پھر اپنی جگہ پہنچ گئی۔ اب وہ مکمل دلہن لگ رہی تھی۔ اسے اس روپ میں دیکھ کر ساحل عمر کے دل کو خاصا سکون محسوس ہوا ماں نے اسے دیکھا تو وہ اسے دیکھتے ہی نہال ہو گئیں بولیں۔ "ہائے کتنی پیاری دلہن ہے۔ کاش میرے ساحل کو ایسی دلہن مل جائے۔"

"اماں آپ کے ساحل کو ایسی دلہن مل سکتی ہے۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

"کہاں؟ جلدی بتاؤ میں آج ہی اس کے پاس جاتی ہوں۔"

"اماں رات کا انتظار کر لو۔" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"رات کو کیا ہو گا؟" اماں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''رات کو یہ ہو گا اماں کہ وہ آپ کے خواب میں آ جائے گی۔ پھر اس سے پتہ پوچھ لینا۔''

''تم کبھی سنجیدہ نہیں ہو گے ساحل۔'' وہ تنک کر اٹھیں اور اس کے کمرے سے نکل گئیں۔

وہ بھی ان کے ساتھ ہی باہر نکلا لیکن اس نے انہیں نہیں روکا۔ وہ کچن کی طرف چلی گئیں۔ ساحل عمر کو بیٹھے بیٹھے ایک خیال آیا تھا۔ وہ اس خیال کی تصدیق کر لینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ اس نے انگریزی کا وہ رسالہ اٹھا لیا جس میں بچھو والے ریفرنس کی کٹنگ رکھی تھی۔ اس نے صفحات الٹ کر وہ ریفرنس نکال لیا۔

جب اس نے ریفرنس پر نظر ڈالی تو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ریفرنس میں ہر چیز موجود تھی۔ زنانہ ہاتھ بھی موجود تھا اور ہاتھ کے پس منظر میں جو کچھ تھا وہ بھی موجود تھا۔ اگر کوئی چیز نہیں تھی تو بچھو تھا۔

اس عورت کا ہاتھ جوں کا توں پھیلا ہوا تھا لیکن ہاتھ سے بچھو غائب تھا۔

یہ کیا ہوا؟ وہ پریشان ہو کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں ریفرنس پر تھیں۔ اس عورت کے ہاتھ پر کسی قسم کا نشان نہ تھا۔ پینٹنگ پر بچھو کا نشان رہ گیا تھا۔ اس ریفرنس پر کسی قسم کی خراش تک موجود نہ تھی۔ یہ ناقابل یقین بات تھی لیکن جو کچھ ہوا تھا اس کی نظروں کے سامنے ہوا تھا۔ اس میں کسی قسم کے شبہ یا وہم کی گنجائش نہ تھی۔ وہ بچھو اس کی پینٹنگ سے غائب ہوا تھا۔ اس نے خود اپنی آنکھوں سے تصویر کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ اصل تصویر سے بھی غائب تھا۔

آخر وہ کیا چیز تھا؟

اس کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔ اس کا جواب کسی کے بھی پاس نہ تھا۔

رات کو دس بجے کے قریب وہ ٹہلنے کے لیے نکلا۔ چورنگی تک گیا۔ وہاں پان والے سے پان خریدے اور پھر واپس گھر کی طرف چل دیا۔ جب وہ اس درخت کے نزدیک پہنچا جس کی اوٹ سے نکل کر اچانک بازغر اس کے سامنے آ گیا تھا تو اس نے درخت کی طرف بغور دیکھا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔

بازغر جاتے ہوئے ایک ٹیلی فون نمبر دے گیا تھا اور ہدایت کر گیا تھا کہ تصویر تیار ہو جانے کے بعد وہ اس نمبر پر اسے فون کر دے۔ وہ بھی بڑا عجیب اور پر اسرار شخص تھا۔ اس نے اس سے پہلے کبھی اس شخص کو نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بغیر پریشانی کے اس کے گھر پہنچ گیا تھا۔ چیتے کی تصویر پر اگرچہ اس نے کام شروع کر دیا تھا لیکن اس کے دل میں وسوسوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ ویسے اس تصویر پر کام کرتے ہوئے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔

گھر پہنچ کر کپڑے تبدیل کیے اور ڈیک پر ایک کیسٹ لگا کر اطمینان سے بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گھنٹی کی آواز سن کر اس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ گیارہ بجنے کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ یہ یقیناً ورشا کا فون ہے۔ جب اس نے اپنی تصویر بھیجی تھی اس کے بعد اس کا کوئی فون نہیں آیا تھا جبکہ ساحل عمر اسی رات اس کے فون کی توقع کر رہا تھا۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے اس نے ڈیک کی آواز خاصی دھیمی کر دی۔ پھر ریسیور اٹھا کر بڑی چاہت سے بولا۔ ''یس!''

"کہو رانجھن کیسے ہو؟" ادھر سے ورشا کی کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اتنے دن کے بعد کیوں فون کیا؟" ساحل عمر نے شکوہ کیا۔

"اوہ تو تمہیں اب میرے فون کا انتظار رہنے لگا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسی۔

"رانجھن خیریت تو ہے۔"

"جی اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔"

جواب میں وہ زور سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں اس کی آواز میں ایک عجیب قسم کی کشش تھی۔ ایسی کشش جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"کہو میں کیسی لگی؟" وہ بڑے مترنم انداز میں گویا ہوئی۔

"وہ تم کہاں تھیں وہ تو تمہاری تصویر تھی۔" ساحل عمر نے وضاحت کی۔

"چلو تصویر کے بارے میں ہی بتا دو۔"

"بہت زبردست..... جس فوٹو گرافر نے بھی بنائی خوب بنائی۔"

"میں چاہتی ہوں کہ اب تم اسے بناؤ۔" فرمائش ہوئی۔

"بنا دوں گا۔" ساحل عمر نے فوراً وعدہ کر لیا۔ "میں آج کل ایک پینٹنگ پر کام کر رہا ہوں وہ مکمل ہو جائے تو پھر اسے بنا دوں گا۔"

"کس کی پینٹنگ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جب مکمل ہو جائے گی تو تمہیں بتا دوں گا' آ کر دیکھ جانا۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"ہائے رانجھن..... مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی بھی تو کس انداز میں؟"

"ملنا نہیں چاہتیں؟" اس نے پوچھا۔

"کس کافر کو انکار ہے۔" اس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "میرا بس چلے تو ابھی تم تک پہنچ جاؤں۔"

"اب ایسی بھی کیا بے قراری۔" ساحل عمر ہنسا۔

"تمہیں چین ہے؟" اس نے ایک عجیب سوال کیا۔

"نہیں۔" ساحل عمر نے کہا' پھر بولا۔ "ورشا ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں پوچھو..... میر بارے میں ایک بات نہیں ہزار باتیں پوچھو۔ اتنا پوچھو کہ میں نہ رہوں۔ میں تو جانے کب سے ایسے شخص کو تلاش کر رہی ہوں جو مجھے پوچھے جو مجھے بوجھے۔" وہ عجیب انداز میں گویا ہوئی۔

"تمہاری پیٹھ پر وہ نشان کیسا ہے۔ بالکل بچھو لگتا ہے۔" اس نے پوچھا۔

"لگتا کیا ہے وہ ہے ہی بچھو۔ یہ نشان میری پیٹھ پر پیدائشی ہے۔" ورشا نے بتایا۔

"کیا بچھوؤں کے خاندان سے ہو؟"

"یہی سمجھ لو..... ذرا میرے ڈنک سے بچے رہنا۔" وہ ہنسی۔

''میں تمہیں کب دیکھوں گا؟'' اس نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے سوال کیا۔

''کل ہی۔'' اس نے فوراً ہی فیصلہ سنا دیا۔

''کہاں اور کیسے؟'' ساحل عمر نے خوش ہو کر پوچھا۔

''کل طاہرہ زیدی کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح ہو رہا ہے۔ میں وہاں آؤں گی۔ تم بھی آ جانا۔'' اس نے پروگرام بتایا۔

''میں عام طور پر اس طرح کی نمائشوں میں نہیں جاتا لیکن تمہارے لیے آؤں گا۔ وقت اور آرٹ گیلری کا بتاؤ۔''

ورشا نے آرٹ گیلری کا نام اور وقت بتا دیا۔

''لیکن میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟'' ساحل عمر نے کہا۔ ''میں نے صرف تمہاری تصویر دیکھی ہے اور وہ بھی پشت سے۔''

''میں تمہیں پہچانوں گی۔ تم پریشان نہ ہو۔ ویسے تم بھی مجھے پہچان لو گے۔'' میں کالی ساڑھی میں ہوں گی۔ ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہو گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون بند کر دیا۔

یہ اُس کی بڑی عجیب بات تھی۔ وہ اچانک ہی ٹیلی فون بند کر دیتی تھی۔ دوسری طرف سے ہونے والے سوال جواب کی پروا نہیں کرتی تھی بہر حال ساحل عمر ملاقات طے ہو جانے پر بہت خوش تھا۔ اس نے بڑی سرشاری سے ریسیور سیٹ پر رکھا اور ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ڈیک کی آواز ایک دم اونچی کر دی۔ پھر اسے خیال آیا کہ کہیں اماں نماز یا اور اد و وظائف میں مصروف نہ ہوں۔ اس نے آواز دھیمی کر دی اور اطمینان سے بیڈ پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ ورشا کیسی ہو گی۔

ورشا کو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ محض اس کی آواز سنی تھی اور صرف آواز سن کر کسی کی شکل و صورت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ اگرچہ بعد میں اس نے اپنی ایک تصویر ارسال کی تھی۔ اس تصویر سے بھی اس کی صورت کا اندازہ ناممکن تھا کیونکہ اس تصویر میں سر اور پیٹھ نمایاں تھے۔ اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ ورشا شکل وصورت کی معمولی ہو یا بدصورت ہو۔ تبھی اس نے سامنے کی تصویر نہیں بھیجی۔ ویسے وہ تصویر اپنے انداز کی وجہ سے منفرد تھی اور اس میں وہ جتنی نظر آ رہی تھی دلفریب تھی۔ وہ خود کیسی تھی' اس راز کے کھلنے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی کل معلوم ہو جانا تھا۔

میوزک سنتے سنتے اسے نیند آنے لگی تو اس نے ریموٹ کے ذریعہ ڈیک آف کر دیا اور سو گیا۔

نیند گہری ہوئی تو خوابوں کی دنیا روشن ہو گئی۔ وہ ایک انتہائی پر فضا مقام تھا۔ نیلا صاف آسمان' برف پوش پہاڑ' اونچے اونچے درخت' سرسبز شاداب علاقہ' بہتا ہوا شفاف دریا' وہ ایک پتھر پر بیٹھی دریا کے پانی سے کھیل رہی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور اتنی خوش تھی کہ وہ دریا کا پانی کسی پر اچھال رہی تھی۔

تب اس نے دیکھا کہ وہ جس پر خوشی میں پانی اچھال رہی ہے وہ کوئی اور نہیں خود ساحل عمر ہے اور وہ پانی کے چھینٹوں سے بچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے۔''

"مت پھینکو پانی، میرے کپڑے بھیگ رہے ہیں۔" ساحل عمر نے احتجاج کیا۔
"تو پھینکنے دو۔" وہ ایک ادائے بے نیازی سے بولی اور ایک مرتبہ پھر پانی اس کے اوپر اچھال دیا۔
"آج تم بہت خوش ہو، خیر تو ہے۔" ساحل عمر نے پوچھا۔
"ہاں آج میں بہت خوش ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"ایسی کیا خوشی مل گئی آخر؟" ساحل عمر نے پوچھا۔
"خوشی تو تمہی نے دی ہے، کیا تم نہیں جانتے۔" اس نے بتایا۔
"عجیب بات ہے میں نے تمہیں خوشی دی ہے؟ اس سے پہلے میں نے تمہیں رنج دیا ہے۔ نہ تو مجھے رنج دینے کی وجہ معلوم ہو سکی اور نہ اب خوشی کی وجہ معلوم ہے۔ کچھ بتانا پسند کرو گی؟" ساحل عمر نے پوچھا۔
"تم نے میرے ماتھے پر ٹیکہ سجا دیا۔ ایک عذاب سے مجھے نجات دلا دی۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور میرے لیے کیا ہو سکتی ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا۔"
"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ صحیح تھا، اس بچھو نے تمہیں پریشان کیا ہوا تھا؟"
"ہاں اور کیا؟"
"لیکن میں اسے مٹا نہ سکا۔ وہ فرار ہو گیا۔" ساحل عمر کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔
"کاش! تم اسے مار دیتے۔" وہ بولی۔
"وہ میرے ہاتھ لگتا جب نا۔ میں نے تو اسے فنا کرنے کے لیے برش اٹھا لیا تھا۔"
"وہ بہت خطرناک ہے۔" اس کے لہجے میں خوف تھا۔
"وہ گیا کدھر؟" ساحل عمر نے پوچھا۔
"میں نہیں جانتی۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ اب وہ تمہیں کہیں نظر آئے تو اس سے دور ہو جانا۔"
"اسے مار کیوں نہ دوں۔" اس نے پوچھا۔
"تم اسے نہیں مار سکتے۔ کاش تم اسے مار سکتے۔" اس نے عجیب بات کہی۔
"وہ ہے کیا بلا؟" ساحل عمر نے سوال کیا۔
"وہ اعور ہے۔" اس نے بتایا۔
"یہ اس کا نام ہے۔" ساحل عمر نے پوچھا۔
"ہاں یہ اس خبیث کا نام ہے۔ وہ ایک شیطان کا بیٹا ہے۔"
"تم کیا ہو؟" ساحل عمر نے برارہ راست سوال کیا۔
"میں رشاملوک ہوں۔" اس نے اپنا نام بتایا۔
"رشاملوک۔" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "یہ نام میرا سنا ہوا ہے۔ اوہ ہاں یاد آیا۔ تمہارا اور بچھو کا نام بازغر نے لیا تھا۔ کیا تم بازغر کو جانتی ہو۔"

''اوہ تو جہکاں تم تک پہنچ گیا۔'' اس کے لہجے میں کسی قدر خوشی تھی۔

''وہ چیتے کی تصویر؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ہاں اسے جتنا جلد ممکن ہو سکے بنا دو۔ وہ بڑی خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ میرا محافظ ہے۔ وہ تمہاری بھی حفاظت کرے گا۔ اس کی تصویر جلد از جلد مکمل کر لو۔ وقت قریب آ رہا ہے۔''

''کیسا وقت؟''

''ایک خوشگوار وقت' ایک روشن لمحہ۔'' یہ کہہ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پتھر پر کھڑی ہو گئی پھر بولی۔ ''وہ مجھے لینے آیا ہے۔ میں جا رہی ہوں' میری ایک بات دھیان سے سن لو۔ اپنا خیال رکھنا' کسی کے فریب میں مت آ جانا۔''

تب اچانک ایک بادل کا ٹکڑا کہیں سے نمودار ہوا۔ وہ اس گہرے بادل میں چھپ گئی۔ ایک لمحے بعد وہاں کچھ بھی نہ رہا۔ خالی پتھر رہ گیا۔ بادل اسے اڑا کر لے جا چکا تھا۔

پھر ایک دم منظر بدل گیا۔ ساحل عمر نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا بچھو ایک پتھر سے اتر کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس بچھو کا سائز ایک بڑے کچھوے کے برابر تھا۔ وہ اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ وہ پلٹ کر بھاگا تو ایک پتھر سے اس کا پیر پھسل گیا۔ تبھی اس کی آنکھ کھل گئی' اس نے خود کو اپنے بیڈ پر پایا۔ کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ اس پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ ڈیک بند کرتے ہی کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باتھ روم گیا۔ پھر اس نے ٹھنڈا پانی پیا اور لائٹ بجھا کر دوبارہ لیٹ گیا۔ اس خواب کو دیکھ کر جہاں وہ خوف میں مبتلا ہوا تھا وہاں اسے اطمینان بھی تھا کہ رشاملوک اس کی وجہ سے جس اذیت میں مبتلا تھی اب وہ پریشانی دور ہو گئی تھی۔ اسے یہ بھی خوشی تھی کہ اس نے اس کی پریشانی کا صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ اسی سرشاری میں اسے دوبارہ بہت جلد نیند آ گئی۔

شام کو وہ وقت مقرر پر ورشا کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ گیا۔ تصاویر کا افتتاح ہو چکا تھا۔ آرٹ گیلری میں خاصا رش تھا۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد تھی۔ وہ بھی اسی رش میں شامل ہو گیا اور ایک ایک کر کے تصویروں کو دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ تصویر کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دائیں بائیں بھی ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ شاید کوئی کالی ساڑھی والی نظر آ جائے۔

ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے اس کے کانوں میں ورشا کا نام پڑا۔ اس نے بڑی بے نیازی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو لڑکے محو گفتگو تھے۔ اگرچہ دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے لیکن وہ ساحل عمر کے اتنے نزدیک تھے کہ ساری بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

''تم نے دیکھا یہاں ورشا آئی ہوئی ہے۔'' لہجے میں بڑی دلچسپی تھی۔

''کہاں ہے وہ قیامت؟'' دوسرا بے قرار ہو کر بولا۔

''میں نے ابھی اسے طاہرہ زیدی کے ساتھ دیکھا تھا۔'' پہلے والے لڑکے نے بتایا۔

''کیا غضب کی لڑکی ہے یار' میرا جی چاہتا ہے اس کا مجسمہ بناؤں۔'' دوسرا لڑکا بولا۔

''ہاں' بنا سکتے ہو مگر خواب میں۔''

اس بات پر دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

ان لڑکوں کے آگے بڑھ جانے کے بعد اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر ہال میں طائرانہ نظر ڈالی۔ وہ جہاں تک دیکھ سکتا تھا اس نے دیکھا مگر اسے کالی ساڑھی میں کوئی لڑکی نظر نہیں آئی۔ وہ پھر تصویریں دیکھنے میں لگ گیا۔

اب آخری دو چار تصویریں رہ گئی تھیں۔ ورشا ابھی تک اس کے سامنے نہیں آئی تھی جبکہ وہ اس کی موجودگی کے بارے میں ان لڑکوں کی زبانی سن چکا تھا۔ آخر وہ اس کے سامنے کیوں نہیں آئی تھی۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ اسے اچھی طرح پہچانتی ہے۔ اسی اثناء میں ایک دو خواتین کالی ساڑھی میں نظر آئی تھیں لیکن وہ اجنبیوں کی طرح اس کے پاس سے گزر گئی تھیں۔

جب وہ آخری تصویر دیکھ رہا تھا تو اس کے دل پر اداسی سی چھا گئی تھی۔ اسے آرٹ گیلری میں گھومتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اس اثناء میں اسے اپنے کئی شناسا ملے تھے لیکن اس نے ان سے واجبی سی گفتگو کر کے جلد اپنا پیچھا چھڑا لیا تھا تاکہ ورشا کو اس کے نزدیک آنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہو۔ اب وہ آخری تصویر جو باہر نکلنے والے دروازے کے نزدیک تھی آ پہنچا تھا اور وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

ورشا سے اسے اس طرح کے رویے کی امید نہ تھی۔ آخری تصویر دیکھ کر وہ مایوسانہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اچانک کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''رانجھن' بغیر ملے ہی چلے جاؤ گے۔''

ساحل عمر نے خوشی سے مڑ کر دیکھا۔

اسی وقت گولی چلنے کی آواز آئی۔

☆.....☆.....☆

یوں تو ورشا کا ملنا بھی کسی دھماکے سے کم نہ تھا لیکن اس وقت حقیقتاً ایک دھماکا ہوا تھا اور لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔

یہ دونوں دروازے کے نزدیک ہی تھے۔ اس لیے ورشا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر نکال لائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''ساحل جلدی سے یہاں سے نکلو'' اور وہ بڑی تیزی سے اس کے ساتھ باہر نکل آیا تھا۔

دوسرے دن گولی چلنے کی وجہ معلوم ہوئی۔ اصل میں طاہرہ زیدی کا ایک نوجوان سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات اتنی آگے بڑھی کہ اس نوجوان نے غصے میں آ کر ریوالور نکال لیا اور گولی چلا دی۔ وہ نوجوان ایک بڑے سیاست داں' ایک بڑے زمیندار کا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔ اسے طاہرہ زیدی کی ایک تصویر پسند آ گئی۔ اس نے طاہرہ زیدی سے اس تصویر کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔

اتفاق سے کچھ دیر پہلے ہی وہ تصویر بک چکی تھی۔ طاہرہ زیدی نے اس نوجوان سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''سوری سر' وہ تصویر تو فروخت ہو چکی۔''

''کتنے میں بکی ہے؟'' اس نوجوان نے بے نیازی سے پوچھا۔

''جی ساٹھ ہزار میں۔'' طاہرہ زیدی نے سادگی سے کہا۔

''میں اس کے ستر ہزار دینے کو تیار ہوں اور وہ بھی کیش ہاتھ کے ہاتھ۔'' اس نوجوان کے لہجے میں بڑا تکبر تھا۔ ''آپ مجھے جانتی ہوں گی۔ بات یہ ہے کہ مجھے جب کوئی چیز پسند آ جاتی ہے تو میں اسے چھوڑتا نہیں۔''

''آپ کسی منڈی میں نہیں آرٹ گیلری میں کھڑے ہیں ذرا خود کو سنبھال کر بات کیجیے۔'' طاہرہ زیدی نے بہت ملائمت سے کہا۔ ''رہ گئی یہ بات کہ آپ کون ہیں؟ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں آپ کو بالکل نہیں جانتی۔ تصویر کے بارے میں' میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ وہ میں فروخت کر چکی ہوں اب آپ مجھے اس کے ایک لاکھ روپے بھی دیں گے تو میں یہ تصویر آپ کے حوالے نہیں کروں گی۔''

''پھر محترمہ آپ میری بات پوری توجہ سے سن لیں' اگر یہ تصویر مجھے نہ ملی تو پھر کسی کو بھی نہیں ملے گی۔'' یہ کہہ کر وہ تصویر کی طرف بڑھا۔

طاہرہ زیدی یا وہاں موجود کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ کوئی

اس انتہائی احمقانہ قدم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تصویر کے سامنے جا کر آناً فاناً کندھے پر لٹکا ہوا ریوالور اتارا اور اس کے خول سے ریوالور نکال کر تصویر کے چہرے کا نشانہ لیا۔ ریوالور تانتے دیکھ کر لوگ فوراً ادھر ادھر ہٹ گئے۔ اس نے گولی چلانے میں دیر نہ کی۔ تصویر کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا۔ طاہرہ زیدی اپنی تخلیق کے ساتھ ایسا سفاکانہ سلوک دیکھ کر اپنے ہوش گنوا بیٹھی۔

وہ نوجوان اپنے حواریوں کے ساتھ پورے اطمینان کے ساتھ آرٹ گیلری سے باہر نکلا اور اپنی پجیرو میں بیٹھ کر اپنی راہ ہو لیا۔ اس کی راہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔

خیر گولی کی آواز سن کر جب ورشا اسے باہر نکال لائی تو اس نے پوچھا۔ ''رانجھن' تمہاری گاڑی کہاں کھڑی ہے؟''

''وہ سامنے۔'' ساحل عمر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ورشا کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اس کا جسم قیامت خیز تھا اور اس کا لباس ہیجان خیز۔ وہ کالی ساڑھی میں چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''اندر پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ میں آج کی شام برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آؤ ساحل پر چلیں۔'' اس کا نرم ملائم ہاتھ ابھی ساحل عمر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اس ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا اور تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ وہ جلد از جلد اس افراتفری کی فضا سے نکل جانا چاہتا تھا۔

''تم کہاں جاؤ گی' ساحل تو تمہارے پاس ہے۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''سمندر پر چلو۔'' اس نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

''میں کسی سمندر سے کم ہوں کیا؟'' ساحل عمر نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چند دنوں میں پتہ چل جائے گا کہ کتنے گہرے ہو؟'' وہ ہنس کر بولی۔ اس کی ہنسی میں بڑی کشش تھی۔ جب وہ ہنسی تو اس کے گالوں میں ننھے گڑھے پڑ گئے۔ وہ ان گڑھوں پر مرمٹا۔

''اتنا آسان نہیں ہے مجھے پالینا۔'' ساحل عمر نے بڑے یقین سے کہا۔

''کانفیڈنٹ چلو۔'' ورشا نے اس کے جملے کا کوئی اثر نہ لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' ساحل عمر نے کہا۔ ''ورشا ایک بات کہوں۔''

''ہوں۔'' اس نے پیار بھری ہوں کی۔

''تمہارا نام ورشا مناف کے بجائے ورشا ڈمپل ہونا چاہیے۔''

اس کی یہ بات سن کر وہ زور سے ہنس دی۔ اس کے رخساروں کے گڑھے اور نمایاں ہو گئے۔ پھر ایک دم ہی اس نے ایک عجیب سوال کر دیا۔ ''رانجھن میں تمہیں کیسی لگی؟''

''بالکل ہیر جیسی' کھیر جیسی' شیر جیسی۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔ وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔

''میں ورشا ہوں یا عید ہوں۔''

''تم کسی جھیل پر برستی چاندنی ہو۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

"شاعر ہو؟"

"تھا نہیں ہو گیا ہوں ابھی ابھی کسی کو دیکھ کر....."

"رانجھن' جھوٹ مت بولو۔"

"رانجھا بھی کہتی ہو اور جھوٹا بھی کہتی ہو۔"

ورشا مسکرا کر رہ گئی۔ کچھ بولی نہیں۔

کلفٹن کے ساحل پر پہنچ کر انہوں نے ایک سنسان سی جگہ تلاش کی اور وہ دونوں دیوار پر بیٹھ گئے۔ پاؤں انہوں نے پتھروں پر رکھ لیے۔ سورج ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا۔ سمندر کی لہریں کافی آگے تک آ کر پلٹ رہی تھیں۔ سامنے ایک فیملی لہروں سے کھیل رہی تھی۔ ان کے نزدیک ایک ہی اونٹ والا اپنا اونٹ لیے کھڑا تھا۔ ایک دو گھوڑے والے بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

لہریں لیتا سمندر' نھال نما سورج' سرخی مائل آسمان عجیب منظر تھا۔

"ورشا' تمہیں سمندر کیسا لگتا ہے؟"

"تم جیسا۔" اس نے بلا تکلف جواب دیا۔

"اور میں کیسا ہوں۔"

"سمندر جیسا۔"

"گویا میں اور سمندر اصل میں ایک ہیں؟" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"ہاں' ساحل اور سمندر جیسے چولی اور دامن' چاند اور چکور جیسے بادل اور برسات جیسے ساز اور آواز جیسے گھنگھرو اور پاؤں جیسے....."

"جیسے انسان اور شیطان۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

وہ بھی ہنس دی۔ سرخ ہوتی دھوپ میں اس کا سفید چہرہ ایک دم گلنار ہو رہا تھا۔ تیز ہوا اس کی ریشمیں زلفوں کو اس کے چہرے پر بکھیر رہی تھی۔ ساحل عمر اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔

"ساحل تمہیں ایک بات بتاؤں' مجھے شیطان بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔" اس نے ایک عجیب بات کہی۔

"واقعی کیا تم سنجیدہ ہو۔" وہ تھوڑا سا پریشان ہوا۔

"ہاں' ساحل یہ ہماری عورتیں بچھو اور سانپ سے بہت ڈرتی ہیں۔ بچھو اور سانپ تو بہت بڑی بات ہے چھپکلی دیکھ کر ان کی جان نکلتی ہے لیکن میں سانپ' بچھو سے بالکل نہیں ڈرتی' چھپکلی تو خیر کوئی چیز ہی نہیں میرے لیے....." یہ بات کہتے ہوئے اچانک اس کے چہرے میں تبدیلی آ گئی۔ کوئی ایسی تبدیلی کہ ساحل عمر کو اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا پڑیں۔ خوف کی ایک لہر اسے اپنے جسم میں سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

تب وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔ "ڈر گئے۔"

ساحل عمر ایک لمحے کو واقعی ڈر گیا تھا لیکن یہ ایسی بات تھی جو ظاہر نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ "ہاں بھئی ایسی لڑکی سے جو سانپ' بچھو سے نہ ڈرتی ہو اور جسے شیطان پسند ہو' ایسی لڑکی

سے ڈرنا ہی چاہیے۔" اس نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔
"وہ ذرا سورج کو دیکھو۔" ورشا نے بات کا رخ موڑا۔
ساحل عمر نے سامنے نظر کی۔ سورج بالکل لال ہو کر سمندر میں اترنے کو تھا۔
"سورج اپنے جلتے ہوئے بدن کے ساتھ وقت کے سمندر میں غروب ہو رہا ہے۔" وہ بولی۔ "بہت خوب..... تمہیں تو شاعرہ ہونا چاہیے۔" وہ خوشدلی سے بولا۔
"میں ہونا شاعرہ۔" اس نے تصدیق کی۔
"واقعی شاعروں میں جاتی ہو؟" اس نے پوچھا۔
"میں مشاعرے نہیں پڑھتی البتہ میری شاعری چھپتی ہے۔ جب تم میرے گھر آؤ گے تو تمہیں اپنی شاعری دکھاؤں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔
"تمہاری پیٹھ پر ایک نشان ہے وہ کیسا ہے؟" اس نے اب وہ سوال کیا جو بہت دیر سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔
"میری پیٹھ پر بچھو کا نشان ہے اور یہ پیدائشی ہے۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا۔
"تم تصویروں کی نمائش میں اتنی دیر بعد کیوں آئیں؟" اس نے ایک اور سوال کیا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔
"میں دیکھنا چاہتی تھی کہ تم مجھے خود سے پہچانتے ہو یا نہیں۔" ورشا مناف نے کہا۔
"لیکن تم مجھے کہیں نظر نہیں آئیں البتہ تمہارا ذکر ضرور سنا۔"
"میرا ذکر۔" ورشا نے حیران ہو کر کہا۔ "میرا ذکر کرنے والا وہاں کون آ گیا۔"
"دو لوگ تھے۔ ایک نے تمہاری آمد کا ذکر کیا۔ دوسرے نے اپنی آرزو بیان کی۔"
"آرزو وہ کیا؟" ورشا نے دلچسپی سے پوچھا۔
"شاید وہ مجسمہ ساز تھا تمہارا مجسمہ بنانے کا خواہش مند تھا۔" ساحل عمر نے بتایا۔
"کون تھا وہ بدمعاش۔" ورشا نے تیکھے لہجے میں کہا۔
"جو بھی تھا..... ویسے خواہش اس کی سچی تھی۔ تم ہو ہی ایسی جو دیکھے تمہیں پانے کی خواہش کرے چاہے مجسمے کی صورت میں پینٹنگ کی صورت میں یا شعر کی صورت میں۔"
"لیکن میں مجسمہ بننا چاہتی ہوں نا پینٹنگ بننا چاہتی ہوں اور نہ شعر بننا چاہتی ہوں۔"
"پھر کیا بننا چاہتی ہو؟" سوال ہوا۔
"تمہاری۔" مختصر اور محبت بھرا جواب ملا۔
"اتنی جلدی فیصلہ نہ کرو آج ہماری پہلی ملاقات ہے۔" ساحل عمر نے کہا۔
"تمہاری ہو گئی میں تمہیں کافی عرصے سے جانتی ہوں تمہاری پرانی عاشق ہوں۔"
"تم نے مجھے کہاں دیکھا؟"
"میں نے تمہیں پہلی بار تمہاری نمائش میں دیکھا۔ تمہیں یاد ہو گا تم نے اپنی ایک تصویر کی

نمائش کی تھی۔ وہ ایک انوکھی نمائش تھی۔ آرٹسٹ نمائش کے لیے بہت ساری تصویریں اکٹھا کرتے ہیں۔ کچھ نمائشیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کئی آرٹسٹ مل کر اپنے کام کی نمائش کرتے ہیں لیکن تم نے بڑی انوکھی نمائش کی۔ محض ایک تصویر۔ مگر وہ تصویر سو تصویروں پر بھاری تھی' پورا شہر اس تصویر کو دیکھنے کے لیے امڈ آیا تھا۔ وہ تصویر۔ ورشا مناف نے اسے معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''ہاں بہت اچھی طرح یاد ہے' ایک بہت بڑے ریچھ کے ہاتھوں پر لیٹی لڑکی۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''اور وہ بھی مسکراتی ہوئی۔'' ورشا مناف یہ کہہ کر ہنسی۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولی۔ ''میں تو اس تصویر کو دیکھ کر دیوانی ہو گئی تھی اور پھر جب میں نے اس تصویر کے خالق کو دیکھا تو عقل کے ساتھ دل بھی گنوا بیٹھی۔ اس دن فیصلہ کر لیا کہ تمہیں تم سے چھین لوں گی۔'' یہ کہہ کر ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''اوہ..... یہ عزائم ہیں تمہارے۔'' ساحل عمر تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

''میرے عزائم کی چھوڑ' اپنے دل کی کہو۔''

''تم مجھے اچھی لگی ہو؟'' اس نے پوری سچائی سے کہا۔

''ایسا کیا ہے مجھ میں؟'' اس نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ شاید وہ اپنی تعریف سننا چاہتی تھی۔

''تم عام نہیں خاص ہو' کیاب ہو' ذہین ہو' اچھی باتیں کرتی ہو' پرکشش لہجے کی مالک ہو' تمہاری مسکراہٹ' تمہاری ہنسی کا کوئی جواب نہیں' شاداب ہو' سمندر کی اونچی لہر ہو' سورج کی پہلی کرن ہو' کوئی حسین رقص ہو' پتھروں کا گیت ہو۔'' وہ ایک لمحے کو رکا۔ ورشا بڑی محویت سے اس کی بات سن رہی تھی۔ اس پر سرشاری چھائی تھی۔ توقف کر کے وہ پھر بولا۔ ''کچھ اور کہوں؟''

''ہاں کہتے رہو تم کہتے رہو' میں سنتی رہوں اور وقت پتھر بن جائے۔'' ورشا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''وقت تو ویسے ہی پتھر ہونے لگا ہے۔ کچھ ہی دیر میں تاریکی پھیل جائے گی۔ کچھ دکھائی نہ دے گا جب کچھ دکھائی نہ دے تو وقت گزرنے کا احساس بھی نہ رہے گا۔ یوں لگے گا جیسے ہر چیز ساکت ہو گئی ہو۔''

''آؤ چلو پھر یہاں سے چلتے ہیں۔ کہیں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہیں۔ پھر تم مجھے چھوڑ دینا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''تم کہاں جاؤ گی؟'' اس نے پوچھا۔

''وہیں' جہاں ہم ملے تھے؟'' اس نے بتایا۔

''آرٹ گیلری..... لیکن کیوں؟''

''وہاں میری گاڑی کھڑی ہے۔'' ورشا مناف نے بتایا۔

''تم کون ہو؟''

''میں ورشا مناف ہوں۔''

''نہیں تم کوئی پر تجسس کہانی ہو' لفظ لفظ حیرت' ہر لمحہ نیا انکشاف۔''

''کاش! تم افسانہ نگار ہوتے تو میں تم سے فرمائش کرتی مجھے لکھو۔''

''میں تمہیں پینٹ کروں گا اور ایسا پینٹ کروں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔'' اس نے پر شوق لہجے میں کہا۔

''سچ.....'' وہ شاداں ہو کر بولی۔

''بالکل سچ' سو فی صد سچ۔'' ساحل عمر نے بڑے یقین سے کہا۔ ''چلو' اب مجھے آئس کریم کھلاؤ۔''

آئس کریم کھا کر جب ساحل عمر نے ورشا مناف کو اس کی گاڑی میں بٹھایا اور وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے رخصت ہونے لگی تو اسنے اپنا خوبصورت ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''اب جلدی جلدی ملنا' دیکھو اب میں تمہارے بغیر رہ نہ پاؤں گی۔''

پھر وہ چلی گئی اور ساحل دور تک اور دیر تک اس کی گاڑی کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی گاڑی دوسری گاڑیوں میں گم ہو چکی تھی مگر وہ ابھی وہیں سڑک پر کھڑا تھا..... گم صم.....

تو کب کی جانے کے بعد اسے اپنی کوئی متاع عزیز گم ہونے کا احساس ہوا۔ اسے اپنا جسم خالی خالی سا لگا۔ اسے لگا جیسے کچھ ہو گیا ہے' کیا ہو گیا ہے' یہ اسے معلوم نہ تھا۔ کہیں اسے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی؟

ویسے وہ اس قابل تھی کہ اس سے محبت کی جائے۔ وہ حسین بھی تھی اور ذہین بھی تھی۔ اسے گفتگو کرنے کا فن آتا تھا۔ اس کا انداز دلربا تھا۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور لب گنگناتے تھے۔ وہ ایک سحر تھی۔ جادو تھی' فسوں تھی..... اور کیوں نہ ہوتی وہ آخر بیٹی کس کی تھی؟

وہ ایک ہندو ماں کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں کا نام برکھا دیوی تھا۔ بنگالن تھی اس کا تعلق کلکتہ سے تھا۔ ایک ایسی سرزمین سے جو اپنے جادو کے لیے مشہور ہے۔ سحر بنگال سے کون واقف نہیں۔ ورشا مناف کا نانا یعنی برکھا دیوی کا باپ کالی داس' نام کا داس نہ تھا' وہ واقعی کالی دیوی کا غلام تھا' اس کا پجاری تھا۔ جادو' ٹونے ٹوٹکے کا ماہر..... اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ کسی محبوب کو قدموں میں گرانا ہو' کسی شوہر کو مٹھی میں لینا ہو' میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرانا ہو' کسی سے انتقام لینا ہو' خاندانوں میں نفاق کا بیج بونا ہو' کوئی بھی منفی کام کرایا جا سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ الٹے سیدھے جاپ کرتا تھا بلکہ جو لوگ اس کے پاس اپنی تشنہ آرزوئیں لے کر آتے تھے ان سے بھی وہ ایسے عمل کرواتا تھا کہ وہ انسان نہ رہتے تھے شیطان بن جاتے تھے۔

کالی داس کی ہتھیلی کی پشت پر ایک بچھو گدا ہوا تھا۔ ایسا ہی بچھو برکھا دیوی کے بازو پر بنا ہوا تھا۔ کالی داس نے اس کی عجیب انداز میں پرورش کی تھی۔ اس نے اسے انتہائی زہریلا بچھو بنا دیا تھا۔ جس کے بھی ڈنک مار دے وہ پانی مانگے بغیر ہی چل بسے۔ اس نے زندگی بھر نمک سے احتراز کیا تھا۔ وہ آج بھی نمک نہیں کھاتی تھی۔ ایک خاص عمل کر کے اور نمک سے پرہیز کر کے اس کے جسم میں کچھ

اس طرح کے اثرات پیدا ہو گئے تھے کہ اگر کوئی سانپ بچھو اسے کاٹ لے تو برکھا کا کچھ نہ بگڑتا تھا۔

برکھا جب چودہ پندرہ سال کی ہوئی تو اس محلے میں جہاں وہ رہتی تھی قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے حسن میں بارود بھرا تھا۔ وہ کسی آتش فشاں سے کم نہیں تھی۔ جو بھی اسے دیکھتا' اس کی طلب میں لگ جاتا۔ وہ میٹرک پاس لڑکی تھی۔ کالی داس نے اسے یونہی نہیں پڑھایا لکھایا تھا۔ ایسے ہی اپنا سارا کا لاعلم اسے نہیں سکھایا تھا۔ وہ اس سے بہت بڑے بڑے کام لینا چاہتا تھا۔

تب کالی داس نے کلکتہ چھوڑ دیا۔ اس نے بمبئی کا رخ کیا۔ وہاں ایک بہتر علاقے میں اس نے چھوٹا سے فلیٹ خریدا۔ اسے آراستہ کیا۔ پھر کالی داس ایک انگلش اخبار کے دفتر پہنچا۔ ساتھ میں اس کی دختر تھی۔ کچھ برکھا کا حسن اور کچھ کالی داس کا عمل۔ دونوں نے مل کر ایڈیٹر کو رام کیا۔ دوسرے دن برکھا کی ایک تصویر اس اخبار کے فرنٹ پیج پر چھپ گئی۔ اس تصویر کے نیچے کیپشن لگایا گیا تھا۔ مستقبل کی ہیروئن اپنے فلسفر کی تلاش میں۔ وہ ایک زبردست تصویر تھی۔ برکھا حسین تو تھی ہی' اس تصویر میں وہ نیم عریاں بھی تھی۔ اس نیم عریاں حسن نے قیامت ڈھا دی۔

اس سے پہلے کہ کوئی پروڈیوسر اس کی طرف متوجہ ہوتا' اس اخبار کا مالک سروپ رائے اس تصویر کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا۔ سروپ رائے نے اخبار کے ایڈیٹر سے کچھ نہ کہا تاکہ اس کا بھرم برقرار رہے۔ اس نے اپنے اخبار کے ایک سب ایڈیٹر کو طلب کر لیا۔ اس سب ایڈیٹر شانتی لال سے جو اس کے اعتماد کا آدمی تھی' بالا ہی بالا برکھا کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں اور وہ اسی شام شانتی لال کو اپنے ساتھ لے کر کالی داس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ کالید اس کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا' اسے توقع نہ تھی کہ تصویر چھپتے ہی کوئی شخص اپنی عقل میز کی دراز میں رکھ کر اس کے گھر پر دوڑا چلا آئے گا اور وہ بھی ایک اخبار کا مالک۔ سروپ رائے محض ایک اخبار کا مالک نہ تھا' اس کے کئی بزنس تھے۔ اس نے ایک دو فلموں میں بھی سرمایہ کاری کی ہوئی تھی۔ وہ پچاس سال کا انتہائی بدصورت شخص تھا۔ اس کی آواز تک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بولتا تو یوں لگتا جیسے کوئی گدھا رینگ رہا ہو۔ بڑی مشکل سے اس کی بات سمجھ میں آتی۔

لیکن سروپ رائے کو بات کرنے اور اپنی بات سمجھانے کا بڑا سلیقہ تھا۔ اس شام بھی جب برکھا کالی ساڑھی باندھے' بغیر آستین کے چھوٹے سے بلاؤز میں اس کے سامنے آئی تو سروپ رائے نے کوئی بات نہ کی۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر پہلے سے ٹائپ شدہ کنٹریکٹ نکال کر برکھا کے باپ کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی بال پر ہی چھکا لگ گیا تھا۔ یہ ایک شاندار معاہدہ تھا جس کے تحت بنگلہ گاڑی مع ڈرائیور' دس ہزار روپے ماہانہ اور ایک فلم میں ہیروئن کا چانس دیا جا رہا تھا۔

کالی داس نے اس معاہدے پر آنکھ بند کر کے دستخط کر دیئے اور تیسرے دن سروپ رائے نے اپنے معاہدے پر عمل کرتے ہوئے ساحل سمندر کے ایک پوش علاقے کے بنگلے میں انہی منتقل کر دیا۔

سروپ رائے اپنے کو بڑا کائیاں سمجھتا تھا۔ سمجھتا کیا تھا وہ تھا بھی بڑا چلتا پرزہ۔ وہ ایک قلی کا بیٹا تھا لیکن آج اس کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ آج اس شہر کی سرکلر ریلوے کو خرید سکتا تھا اور یہ

پیسہ اس نے اپنی چالبازیوں سے کمایا تھا۔ جس اخبار کا وہ مالک تھا' اس اخبار کا کام محض بلیک میلنگ تھا۔ لوگوں کے راز جان کر انہیں اپنا مطیع بنانا' یہ تھا اس اخبار کا مشن۔

سروپ رائے ایک عیاش آدمی تھا۔ خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اس طرح کے معاہدے کرنا اس کا معمول تھا۔ معاہدہ دو تین سال کا کرتا تھا لیکن تین ماہ سے زیادہ وہ کسی لڑکی کو اپنے دل کے بنگلے میں نہ رکھتا تھا۔ جس طرح وہ اچانک لڑکیوں پر نوٹوں کی بارش کرتا تھا' بالکل ویسے ہی ایک دن اچانک ان کے سر سے چھت کھینچ لیتا تھا' وہ بیچاری فٹ پاتھ پر بیٹھی نظر آتی تھیں اور اس کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھیں۔

سروپ رائے برکھا کو پا کر بہت خوش تھا۔ پہلی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس معاہدے کو تین ماہ کے بجائے چھ ماہ چلنا چاہیے لیکن کالی داس کچھ اور سوچ رہا تھا' وہ اسے تین ماہ سے زیادہ کی مہلت دینا چاہتا تھا۔ سروپ رائے اس کا پہلا بڑا شکار تھا۔

سروپ رائے روز ہی بنگلے پر آتا تھا اور برکھا کو اپنے ساتھ مختلف پارٹیوں میں لے جاتا تھا۔ بڑے سرکاری عہدیداروں' بڑے بزنس مینوں اور بڑے سیاستدانوں سے ملاقات کے دوران وہ برکھا کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ اسے اپنی پرائیویٹ سیکرٹری ظاہر کرتا تھا۔ ہفتے میں ایک رات وہ بنگلے پر گزارتا تھا اور یہی رات برکھا کے لیے قیام کی ہوتی تھی۔ سروپ رائے کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ پیسہ بڑی چیز ہے اور پیسہ بری چیز بھی ہے جو آدمی سے اس کی مرضی کے خلاف بہت کچھ کرا لیتا ہے وہ بھی مجبور تھی۔ اس کے باپ نے کہا تھا کہ وہ بس تین ماہ صبر کرے' وہ تین ماہ میں اس کے نیچے سے زمین کھینچ لے گا۔

اس بنگلے میں آنے کے پندرہ دن بعد ایک بے چاند رات میں کالی داس نے سروپ رائے کی تصویر پر عمل شروع کیا۔ یہ تصویر برکھا نے بڑا اصرار کر کے سروپ رائے سے منگوائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ جب تم بنگلے پر نہیں ہوتے تو میں اس تصویر سے ہی باتیں کر لیا کروں گی اور وہ شاطر کھلاڑی اس بات کو سچ سمجھ بیٹھا تھا۔ اس نے دوسرے ہی دن اپنی ایک بڑی تصویر فریم کروا کر اس کے حوالے کر دی تھی۔

اب وہی تصویر فریم سے نکال لی گئی تھی۔ رات کے دو بجے تھے۔ کالی داس آلتی پالتی مارے اپنے ہاتھ میں اس کی تصویر لیے کسی جاپ میں مصروف تھا۔ جاپ سے فارغ ہو کر اس نے زمین پر ایک دائرہ کھینچا اور تصویر اس کے درمیان میں رکھ دی۔ برکھا نزدیک ہی بیٹھی تھی۔ باپ کے اشارہ کرنے پر وہ اٹھی اور ایک خالی سرنج جو میز پر رکھی تھی کالی داس کے حوالے کر دی۔ کالی داس نے سرنج اپنے ہاتھ میں لے کر برکھا سے اپنا بازو نزدیک لانے کے لیے اشارہ کیا۔ برکھا نے اپنا بازو جس پر گھونسا بنا ہوا تھا کالی داس کی طرف بڑھا دیا اور اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کالی داس نے سرنج ٹھیک پٹھوں کے منہ پر رکھی اور گوشت میں داخل کر دی۔ پھر اس نے آدھی سرنج کے قریب برکھا کا خون نکال لیا۔

پھر اس نے خون کو روئی کے ذریعے سروپ رائے کی پوری تصویر پر مل دیا اور برکھا کو

کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ برکھا کے کمرے سے چلے جانے کے بعد آدھے گھنٹے تک وہ تصویر پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا۔

کچھ ہی دیر میں کمرے کے مختلف کونوں سے بچھو نکل نکل کر آنے لگے۔ بچھوؤں کو دیکھ کر کالی داس اس دائرے سے کافی پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا جس میں سروپ رائے کی تصویر رکھی تھی۔ بچھو ایک ایک کر کے اس تصویر پر جمع ہونے لگے۔ جب اتنے بچھو اس تصویر پر جمع ہو گئے کہ وہ ساری بچھوؤں سے ڈھک گئی تو کال داس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ بڑی آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور اس نے کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا۔

پھر اس نے برکھا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ ابھی جاگ رہی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو کمرے میں جھانکتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا باپو؟''

''اعوروں نے اس اس کی تصویر کو گھیر لیا ہے۔ صبح تک کچھ نہ بچے گا۔'' کالی داس نے خوشی سے کہا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

صبح تڑکے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ابھی سورج نہ نکلا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی اس نے بند کمرہ کھولنا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا بند کمرے کی طرف چلا۔

تالا کھول کر وہ تیزی سے تصویر کی طرف بڑھا۔ اب تصویر پر ایک بچھو بھی نہ تھا۔ وہ تصویر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا بچھو اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔

اب وہاں سرپ رائے کی تصویر نہ تھی بس ایک سفید کاغذ تھا۔ تصویر کو بچھوؤں نے کھا لیا تھا۔

اس سفید کاغذ کو اس نے چار برابر کے ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور ماچس نکال کر ان کاغذ کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے جلانے لگا۔ پھر اس نے کاغذ کے ان ٹکڑوں کی راکھ ایک شیشی میں احتیاط سے جمع کر لی اور خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''جے کالی۔''

پھر یہ راکھ بھری شیشی کالی داس نے برکھا کے حوالے کر دی اور اسے بتا دیا کہ کیا کرنا ہے۔ اسی شام جب سروپ رائے اسے کسی تقریب میں لے جانے کے لیے آیا تو برکھا نے بڑے پریم سے اس کے لیے کافی بنائی' کافی میں اپنے باپو کی حسب ہدایت' اس کی تصویر کی دو چاول بھر راکھ ملائی اور اپنے ہاتھوں سے پلا دی۔ یہ تو خیر راکھ ملی کافی تھی اگر وہ اسے زہریلی کافی بھی پلا دیتی تو وہ پینے سے انکار نہ کرتا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔

پندرہ بیس دن کے اندر وہ راکھ سروپ رائے کے پیٹ میں جا کر خون میں سرایت کر گئی اور وہ جو خود کو بڑا شاطر کھلاڑی سمجھتا تھا' مات کھا گیا اور مات بھی ایسی کہ اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ اس کے ساتھ ہو کیا گیا ہے۔

تین ماہ کے اندر برکھا نے اس سے جو چاہا حاصل کر لیا اور وہ کسی معمول کی طرح کاغذات پر دستخط کرتا رہا۔ بنگلہ' گاڑی اور ایک لمبی رقم اپنے نام کرا لی۔

پھر وہ قاتل شام آئی۔ ابھی تک تو یوں ہوتا رہا تھا کہ سروپ رائے جب کسی لڑکی سے اکتا

جاتا تو وہ اپنے مسلح غنڈے بھیج کر اس لڑکی سے اپنا بنگلہ خالی کرا لیتا۔ وہ لڑکی اور اس کے لواحقین کو مار مار کر بنگلے کو تالا لگاتے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو جاتے۔ اس طرح لڑکی کے سر سے اچانک چھت کھینچ لی جاتی۔ ابھی وہ لڑکی اور اس کے گھر والے سمجھ ہی رہے ہوتے کہ یہ ان کے ساتھ ہو کیا رہا ہے کہ اتنے میں وہاں پولیس کی جیپ آ جاتی اور اتنے بڑے سیٹھ کے بنگلے پر دھرنا مار کر بیٹھنے والوں کو مشکوک جان کر پولیس اسٹیشن جانے کی دھمکی دیتی تو وہ لوگ اس نئی مصیبت سے بچنے کے لیے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت جانتے اور یوں تین ماہ کے بیش کسی بھیانک خواب کی صورت میں ظاہر ہوتے۔

لیکن آج اس کے الٹ ہوا' وہ ہوا جس کا سروپ رائے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس قاتل شام جب وہ برکھا کے بنگلے پر پہنچا تو دو گورکھا محافظوں نے جو بندوقوں سے لیس تھے اس کی گاڑی کو اندر جانے سے روک لیا۔

''تم اندر نہیں جا سکتا۔'' ایک گورکھا محافظ نے اپنی خونخوار مونچھوں کو مروڑ کر کہا۔

''کیا بکتا ہے تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں۔'' سروپ رائے اپنی بیٹھی آواز میں بولا۔

''تم کوئی بھی ہووے اندر نہیں جا سکتا' رانی جی نے منع کیا ہے۔''

''رانی جی.....! کون رانی جانی؟''

''برکھا رانی جی۔''

''اندر جا کر برکھا کو بولو کہ سروپ سیٹھ آئے ہیں۔''

''تم اور گاڑی میں بیٹھو' ہم رانی جی سے بات کر کے آتا ہے۔'' دوسرے گورکھا محافظ نے کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ..... پوچھو۔'' سروپ رائے غصے سے بولا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ گورکھا محافظ واپس آیا تو اس نے بڑی سختی سے مخاطب ہو کر کہا۔

''صاب' تم ادھر سے جاؤ' وہ تم کو نہیں جانتی۔''

''مجھ کو نہیں جانتی۔ یہ بنگلہ' گاڑی یہ سب ٹھاٹھ باٹ میں نے اس کو دیا ہے۔''

''یہ کوئی پاگل آدمی معلوم ہوتا ہے آؤ اندر آ جاؤ' گیٹ بند کر لیتے ہیں۔ یہ کچھ دیر خود ہی بھونک کر یہاں سے چلا جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے محافظ کو اندر لے گیا اور انہوں نے اندر جا کر واقعی گیٹ بند کر لیا۔ سروپ رائے سناٹے میں آ گیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا دل تھام لیا۔

پھر اس نے زور زور سے بیل بجائی' زور زور سے گیٹ پیٹا اور اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں گلوگیر ہو کر کہا۔ ''برکھا دروازہ کھولو' دیکھو ایسا مت کرو' مجھ سے اور جو چاہے لے لو مگر مجھے خود سے محروم نہ کرو' میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہارے بغیر مر جاؤں گا۔ تم نے جانے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔''

جواب میں اندر سے خونخوار کتے کے بھونکنے کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دی۔

اس نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ وہ روتا رہا اور کہتا رہا۔ ''بھگوان کے واسطے برکھا مجھے ایک بار اپنی شکل دکھا دو' مجھ سے میرا سب کچھ لے لو۔''

روتے روتے اس پر دل کا دورہ پڑا۔ اس کا ڈرائیور اسے اسپتال لے کر پہنچا مگر وہ اتنا شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔ جس طرح سروپ رائے دوسری لڑکیوں کے سر سے چھت کھینچ کر انہیں بے آسرا کر دیتا تھا ویسے ہی کالی داس نے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی اور اب وہ شمشان گھاٹ میں چندن کی لکڑیوں پر لیٹا جل رہا تھا۔

جو لوگ دوسروں کو جلاتے ہیں بالآخر خود انہیں بھی جلنا پڑتا ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔

اگرچہ بنگلہ' گاڑی اور بینک بیلنس خود اپنی مرضی سے سروپ رائے نے برکھا کو بخشا تھا' اس سلسلے میں کوئی پریشانی والی بات نہ تھی پھر بھی کالی داس نے اس بنگلے میں رہنا پسند نہ کیا۔ بنگلہ گاڑی بیچ کر اس نے ایک اچھے علاقے میں فلیٹ خرید لیا۔ گاڑی بھی دوسری لے لی۔

تین ماہ قبل جب سروپ رائے نے برکھا کو بنگلہ اور گاڑی دی تو گاڑی کے ساتھ ایک ڈرائیور بھی دیا تھا۔ اس ڈرائیور کا نام مناف تھا۔ یہ ڈھاکہ کا رہنے والا تھا اور ایک غریب مسلمان گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ بمبئی ہیرو بننے آیا تھا۔ وہ ایک پرکشش نوجوان تھا۔ ہیرو بننے کے قابل تھا لیکن قسمت میں اس کے فلم لائن نہ تھی۔ وہ ہیرو بننے کے بجائے ڈرائیور بن گیا۔ تھوڑا پڑھا لکھا تھا۔ مہذب اور شائستہ تھا۔ سروپ رائے اسے ذاتی طور پر بہت پسند کرتا تھا' اس لیے وہ اسے اپنی گاڑی پر ہی رکھتا تھا۔ اعتماد کا آدمی تھا۔ جب سروپ رائے کوئی نیا پنچھی پنجرے میں بند کرتا تو اپنی گاڑی کے ساتھ مناف کو ہی بھیجتا تھا اور جب پنچھی کو آزاد کرنا ہوتا تو یہ کام وہ مناف کے ذریعے کروایا کرتا تھا۔

مناف سروپ رائے کا کل وقتی ملازم تھا۔ جب اس نے گاڑی برکھا کے حوالے کی تو مناف بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں رہائش اختیار کر لی۔ ڈرائیور کے ساتھ وہ ایک طرح کا نگراں بھی تھا۔ وہ بنگلے اور بنگلے کے مکینوں پر نظر رکھتا تھا۔ لڑکی کہاں جا رہی ہے' کس سے مل رہی ہے' کون لوگ اور کس طرح کے لوگ بنگلے پر آتے ہیں۔ یہ سب رپورٹ مناف سروپ رائے کو پہنچایا کرتا تھا لیکن برکھا کے کیس میں مناف کی کھوپڑی بھی گھوم گئی۔ وہ سروپ رائے کو برکھا کے بارے میں رپورٹ دینے کے بجائے برکھا کو سروپ رائے کے بارے میں بتانے لگا۔

جس دن یہ لوگ بنگلے میں منتقل ہوئے اس کے دوسرے دن کی بات ہے۔ صبح ہی صبح سروپ رائے کا فون آیا۔ اسے مناف کی ضرورت تھی۔ اس نے برکھا سے کہا کہ وہ ذرا اسے جا کر پیغام دے دے۔ برکھا نے اس کے کوارٹر پر جا کر دروازے پر دستک دی تو اس نے فوراً ہی دروازہ نہ کھولا۔ شاید وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ بار بار دستک دینے پر کچھ دیر کے بعد جب وہ دروازے پر آیا تو راز کھلا کہ اس نے اتنی دیر سے دروازہ کیوں کھولا۔

اور یہ جو کچھ بھی ہوا بس اچانک ہی ہوا۔

مناف کو توقع نہ تھی کہ دوسرے دن ہی اتنی صبح وہ اس کے دروازے پر آ جائے گی اور نہ

برکھا کو یہ معلوم تھا کہ دوسرے دن ہی وہ اپنے ڈرائیور کو ایسی حالت میں دیکھ لے گی کہ اپنے ہوش گنوا بیٹھے گی۔

☆.....☆.....☆

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہوتا اور ہر ایک کے ساتھ نہیں ہوتا' زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آ جاتا ہے جب اچانک ہی دل کے فریم میں کوئی عورت یا مرد فٹ ہو جاتا ہے۔ ایسا ن کہ دل دھڑکنا بھول جاتا ہے۔

اس لمحے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ برکھا پر وہ لمحہ کسی بوند کی طرح برسا اور اسے شرابور کر گیا۔ مناف اس وقت نہا کر نکلا تھا۔ دستک کی آواز سن کر وہ تولیہ سر پر رگڑتا' تہبند باندھے دروازے پر آ پہنچا تھا۔ اس نے ایک دم دروازہ کھولا تو سامنے برکھا کو کھڑے پایا۔

سروپ رائے کا ٹیلی فون سن کر وہ ایسے ہی کمرے سے نکل آئی تھی۔ راستے میں اس نے اپنے لمبے ریشمیں بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا تھا اور ساڑھی کا پلو یونہی کمر کے گرد کس لیا تھا۔ اسکی سادگی غضب ڈھا رہی تھی۔

مناف نے اسے ایک نظر دیکھا تو نظریں نیچی کرنا بھول گیا۔

مناف ایک خوبصورت نوجوان تو تھا ہی..... لیکن اس کا جسم بھی کسی سنگی مجسمے کی طرح ترشا ہوا تھا۔ پانی کی بوندیں اس کے جسم پر جگہ جگہ پڑی ہوئی تھیں۔ سینہ کالے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ چار خانے کا کالا اور سرخ تہبند باندھے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ اسکا سر پر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے دروازہ کھولا تھا۔

برکھا کی اس پر نظر پڑی تو اس کا دل ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔ اسی وقت پریم دیوتا حرکت میں آیا۔ اسنے تیر چلایا جو برکھا کے دل میں ترازو ہو گیا۔ برکھا کے دل کی سلیٹ ابھی بالکل صاف تھی کہ مناف کا نقش اس پر منتقل ہو گیا۔

برکھا سروپ رائے کا پیغام دے کر فوراً وہاں سے چلی آئی۔ اس نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے دل پر کیا بیت گئی ہے لیکن یہ ایسی بات تھی جو چھپائے نہ چھپ سکتی تھی۔ اگرچہ مناف کے دل میں بھی آگ بھڑک اٹھی تھی لیکن وہ اپنی اوقات جانتا تھا لہٰذا اس نے اپنی اس آگ کو زیادہ ہوا نہ لگنے دی..... لیکن یہ وہ آگ تھی جو بجھائے نہ بجھ سکتی تھی۔

محبت کی آگ پر محبوب کی دید اور قربت پٹرول کا کام کرتی ہے۔ تین ماہ کسی محبت کے پھلنے پھولنے کے لیے بہت ہوتے ہیں۔ پھر اگر اسی دوران کوئی رات ایسی بھی آ جائے جو سیلاب بلا بن کر ان پر ٹوٹے اور جذبات کے کمزور بند خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔

اس دن رات کو برکھا ایک تقریب میں سروپ رائے کے ساتھ رہی۔ یہ ایک بڑے لوگوں کی پارٹی تھی۔ اس پارٹی میں برکھا کو ساتی گری بھی کرنا پڑی۔ اب یہ کوئی اس کے لیے مشکل کام نہ تھا لیکن اس پارٹی میں ایک مشکل یہ ہوئی کہ پینے والے نے ضد کر کے اسے بھی تھوڑی سی پلا دی۔

برکھا کے لیے یہ تھوڑی بھی بہت تھی۔

سروپ رائے نے اس کے ڈگمگاتے قدموں کو دیکھا تو اسے لے کر وہاں سے نکل آیا۔ پھر وہ راستے میں اپنے گھر پر اتر گیا اور مناف برکھا کو لے کر بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

بنگلے پر پہنچ کر اس نے بمشکل برکھا کو گاڑی سے اتارا اور اس کے بیڈروم تک پہنچایا۔ اتنے میں بادل گرجنے لگے اور بارش شروع ہو گئی۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ برکھا کا باپ کالی داس اپنے کمرے میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔ وہ جلدی سونے کا عادی تھی۔ مناف جب برکھا کو بیڈ پر سیدھا لٹا کر اس کے کمرے سے باہر نکلنے لگا تو اسی وقت زور سے بجلی کڑکی برکھا خوفزدہ ہو کر چیخی اور بیڈ سے اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے اس کی طرف چلی' مناف اگر دوڑ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ نہ لیتا تو وہ زمین پر گر جاتی۔

پھر اس کے بعد بارش کچھ اس طرح ٹوٹ کر برسی کہ زمین آسمان ایک ہو گئے۔

اس رات کی بات نہ سروپ رائے جان سکا نہ برکھا کا باپ کالی داس۔ بنگلہ اور گاڑی بیچ کر جب کالی داس اس علاقے سے نکلا تو مناف اس کے ساتھ ہی تھا۔ کالی داس اسے پسند کرنے لگا تھا۔ اگرچہ مناف مسلمان تھا اس کے باوجود اسے چھوڑنے کے لیے راضی نہ تھا۔ اصل میں بمبئی شہر کالی داس کے لیے اجنبی تھا جبکہ مناف اس کے چپے چپے سے واقف تھا اور اس نے بنگلہ برکھا کے نام کرانے سے اسے فروخت کرنے تک بھرپور مدد کی تھی۔ کالی داس' مناف کے بغیر ادھورا تھا اور یہی حال اس کی بیٹی کا تھا وہ بھی اس کے بغیر ادھوری تھی۔

پھر اس رات ایک عجب تماشا ہوا۔

اس رات برکھا اپنے باپو کے پاؤں دبا رہی تھی اور اس کا باپو کالی داس بڑی آسودگی سے آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ تب برکھا نے وہ بات کہی جو اس کی روح میں شگاف ڈال گئی۔

''باپو ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانو گے۔''

''نہیں کہو چندا تمہاری بات نہیں سنوں گا تو پھر کس کی سنوں گا۔''

''باپو میں مناف کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اس سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔'' برکھا نے انتہائی خطرناک بات بڑے اطمینان سے کہہ دی۔

یہ بات سن کر کالی داس کے جسم میں ایک جھٹکا سا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے بہت سے بچھو اس کے جسم پر چڑھ آئے ہوں۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنے پیر پیچھے کھینچ لیے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''کیا کہا تو نے؟ اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''ایسے گندے شبد نکالنے سے پہلے تو ستی کیوں نہ ہو گئی۔''

''باپو' کیا کہتے ہو۔ ابھی میرا بیاہ ہوا ہے نہ میرے پتی کا دیہانت ہوا' نہ میں بیوہ ہوئی پھر میں ستی کس پر ہوں۔ باپو تم تو جانتے ہو کہ ہندو ناری بیوہ ہونے کے بعد پتی کی چتا کے ساتھ جلتی ہے۔ ستی ہوتی ہے۔''

''میں تجھے بیاہ سے پہلے ہی بیوہ کر دیتا ہوں تو مجھے جانتی نہیں ہے۔'' وہ سانپ کی طرح

پکارا۔

وہ اصل میں دونوں ہی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ باپ ایسا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو کالی ماں کے چرنوں میں بھینٹ تو چڑھا سکتا تھا لیکن ایک مسلمان مرد کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ نہیں دے سکتا تھا اور وہ ایسی بیٹی تھی جو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے باپ کو تو چھوڑ سکتی تھی لیکن اپنے محبوب کو چھوڑنا اس کے بس میں نہ تھا۔ دونوں نے مل کر بڑی خاموشی سے منصوبہ بندی کی اور بینک سے پانچ لاکھ روپے نکلوا کر وہ راتوں رات بمبئی کی حدود سے نکل آئے۔

صبح جب کالی داس سو کر اٹھا تو اس کے دل کی دنیا لٹ چکی تھی۔ ایک پرچہ اس کے تکیے کے پاس رکھا ہوا تھا۔ برکھا نے لکھا تھا۔ ''باپو مجھے چھما کر دینا' میں مناف کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میں اب اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ کی بیٹی برکھا۔''

کالی داس نے خط پڑھ کر غصے میں اسے چاک کر دینا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے وہ پرچہ تہہ کر کے ڈال دیا اور آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ''برکھا! تو کالی داس کو نہیں جانتی۔ تو نے بینک بیلنس تھی۔ جسے اس گھر کا ڈرائیور لوٹ کر لے گیا تھا۔ اس نے سوچا۔ اصل قصوروار تو مناف ہے۔ وہ اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ اسے ایسا مزہ چکھائے گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔

برکھا اور مناف دہلی پہنچ کر زندگی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ دہلی میں مناف کے کچھ دور کے رشتے دار تھے اس لیے اس نے دہلی کا رخ کیا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ڈھاکا نہیں گیا تھا اسے معلوم تھا کہ کالی داس اپنی بیٹی کے یوں ہاتھ سے نکل جانے پر ہرگز چین سے نہیں بیٹھے گا اور ڈھاکا کا پتہ معلوم کر لینا اس کے لیے کچھ مشکل نہ ہوگا۔ اس لیے اس نے ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔ وہ سیدھا دہلی پہنچا۔ دہلی میں اس کے رشتے کے چچا تھے۔ ان کے یہاں قیام کیا۔ انہیں ساری صورت حال بتائی۔ انہیں صاف صاف بتا دیا کہ وہ بمبئی سے ایک ہندو لڑکی لے آیا ہے۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی مسلمان ہونے کے لیے راضی ہے۔

برکھا مسلمان ہو گئی۔ دونوں کا نکاح ہو گیا۔ انہوں نے دریا گنج میں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ ان کے پاس پانچ لاکھ روپے تھے جس زمانے کی یہ بات ہے اس وقت پانچ لاکھ روپے ایک خاصی رقم تھی۔ ایک ماہ انہوں نے خوب سیر کی۔ برکھا اس کے ساتھ بہت خوش تھی۔ مناف کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اسے دینے والے نے چھپر پھاڑ کر دیا تھا۔ ایک حسین لڑکی اور بھاری رقم۔

سیر و تفریح کے بعد مناف نے ایک بڑا جنرل اسٹور کھول لیا۔ دو لڑکے ملازم رکھ لیے۔ وہ خاصی تھا خوش اخلاق تھا۔ لوگوں سے گفتگو کا سلیقہ جانتا تھا۔ لہٰذا بہت جلد اس کا جنرل اسٹور چل پڑا۔

ایک سال کے بعد ان کی پرسکون زندگی میں شور و غوغا اٹھا۔ ایک پیاری سی بچی نے جنم

لیا۔ اس کا نام برکھا نے کرن رکھا۔ کرن کے بعد تو جیسے لڑکیوں نے ان کا گھر دیکھ لیا۔ لڑکیوں کا گھر دیکھ لینا تو خیر سے کوئی عذاب ناک مسئلہ نہ تھا۔ عذاب ناک مسئلہ تو اس وقت بنا جب کالی داس ایک دن اچانک ان کے گھر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

دوپہر کا وقت تھا کہ کسی نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ مناف اس وقت گھر پر ہی تھی۔ وہ دوپہر کا کھانا گھر پر ہی کھاتا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جنرل اسٹور کا رخ کرتا تھا۔ مناف نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ایک قیامت کو کھڑے پایا۔

کالی داس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”حرام خور تو کیا سمجھتا تھا کہ میں تجھے ڈھونڈ نہ پاؤں گا۔ تو بڑا کمینہ نکلا۔ جس ہانڈی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ بول کہاں ہے میری بیٹی۔ بلا اس کو باہر اس جنم جلی کی ذرا میں شکل دیکھ لوں اور اسے اپنی صورت دکھا دوں۔ فیصلے کی گھڑی اب زیادہ دور نہیں، چل جلدی کر۔“

مناف کا ذہن ایک دم ماؤف ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ یہ منحوس کالی داس اچانک کہاں سے آ ٹپکا۔ اب وہ کیا کرے، کیا وہ اندر جا کر دروازہ بند کر لے اور پھر ساری صورت حال برکھا کو بتائے یا یہیں سے آواز دے کر برکھا کو دروازے پر بلائے۔ تب اس کے دماغ میں یہ خیال بجلی کی طرح کوندا کہ اسے اندر جا کر دروازہ بند کر لینا چاہیے تاکہ یہ منحوس گھر میں داخل نہ ہو سکے۔ ایسا سوچ کر وہ گھر میں داخل ہوا اور پھر اس نے بہت تیزی سے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

”جا جو کہتا ہوں وہ کر اسے جنم جلی کو لا باہر بلا کر۔“ کالی داس نے سخت لہجے میں کہا۔

تب مناف نے گھبرا کر وہیں سے آواز لگائی۔ ”اے برکھا باہر آؤ۔“

اس کی آواز سن کر برکھا فوراً باہر آئی۔ اس نے برآمدے سے باہر دوروازے کی طرف دیکھا تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ وہ آگے آ سکی نہ پیچھے جا سکی۔

اس وقت کالی داس نے اپنے کرتے کی جیب سے کچھ نکالا اور جس طرح کسی کو پتھر مارتے ہیں ویسے ہی اس نے کوئی چیز پھینک کر ماری لیکن کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ البتہ برکھا اس عمل کے بعد فوراً وہیں کھڑی کھڑی گر پڑی۔ یہ دیکھ کر اس نے بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اس وقت میں جاتا ہوں۔ رات کو ٹھیک بارہ بجے آؤں گا اور برکھا کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ پہلے اس سے اپنا حساب چکالوں پھر تجھ سے نمٹوں گا۔“

پھر وہ مڑا اور تیز تیز قدموں سے گلی عبور کر گیا۔ اس کے جانے کے بعد مناف نے فوراً دروازہ بند کیا۔ اس مرتبہ دروازہ بند کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ برکھا برآمدے کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ مناف اس کے نزدیک پہنچا تو وہ اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اٹھ گئی۔

”باپو چلے گئے۔“ وہ بمشکل بولی۔

”ہاں۔“ مناف کا دم ابھی اندر ہی تھا۔ اس نے اپنا سانس باہر نکالا۔

”یہ بہت برا ہوا۔“ برکھا اسے بے نور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر

زردی کھنڈ گئی تھی۔ اس کا شاداب چہرہ برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا تھا۔ ''میرے دل کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں باپو نہ آ پہنچے۔ بالآخر ایسا ہی ہوا' وہ آ پہنچا۔''

''باپو نے یہ گھر کیسے ڈھونڈ لیا مجھے حیرت ہے۔'' مناف واقعی حیرت زدہ تھا۔

''باپو سب کچھ کر سکتا ہے اس کے لیے یہ کام مشکل نہیں۔ اس کے لیے اس نے کوئی جاپ کیا ہوگا۔''

''اب کیا ہوگا۔ وہ رات کا کہہ کر گیا ہے۔ چلو برکھا جلدی کرو۔ ابھی رات بہت دور ہے۔ ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔''

''اب کچھ نہیں ہو سکتا مناف..... بہت دیر ہو چکی۔ میں اب اس کی گرفت میں ہوں۔ اس گھر کی چار دیواری سے قدم باہر نکالوں گی تو میرا کلیجہ کٹ جائے گا۔ مجھے خون کی ایک الٹی آئے گی اور میں چل بسوں گی۔ وہ رات کو آئے گا۔ میرا ہاتھ پکڑے گا اور لے جائے گا۔ مجھے لے جانے سے پہلے وہ تمہارا حساب کتاب کرے گا۔ وہ تمہیں کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ ایسا کرو تم کرن کو لے کر نکل جاؤ۔ میں زندہ رہی تو تم سے آ ملوں گی ورنہ پھر اس کو آخری ملاقات سمجھنا۔'' برکھا کے لہجے میں ایسا دکھ تھا کہ مناف کا دل بھر آیا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''نہیں برکھا..... میں کہیں نہیں جاؤں گا ہم ساتھ جئے ہیں تو ساتھ ہی مریں گے۔''

''ہماری بیٹی کرن کا کیا ہوگا؟'' وہ فکر مند ہو کر بولی۔

''اسے میں چچا کے گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' مناف نے تجویز پیش کی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کرن کے ساتھ اس گھر میں جتنی نقدی اور زیورات وغیرہ ہیں وہ بھی میں باندھ کر دے دیتی ہوں۔ چچا کے حوالے کر آنا۔ ویسے اگر تم واپس نہ آؤ تو اچھا ہے۔ میں.....'' برکھا جملہ پورا نہ کر سکی۔ مناف نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''بس جلدی سے کرن کو تیار کر دو اور جو دینا ہے دے دو۔ میں چچا کے حوالے کر کے فوراً واپس آتا ہوں۔ اتنی دیر میں تم اپنے باپو کے عمل کا توڑ سوچو۔ آخر تمہیں بھی تو بہت کچھ آتا ہے۔''

برکھا خاموشی سے اٹھی۔ اس نے جلدی جلدی گھر میں رکھی نقدی اور زیورات کو سمیٹا۔ کرن کے کپڑے اکٹھا کیے۔ اس کی ضرورت کا سامان جمع کیا اور یہ سب ایک بیگ میں رکھ کر مناف کے حوالے کیا۔ پھر اس نے اپنی سوتی ہوئی بیٹی کو چوما اور مناف کی گود میں دے کر بولی۔ ''جاؤ جلدی کرو۔''

کرن کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے باپ سے چمٹ گئی۔ برکھا ان دونوں کو چھوڑنے کے لیے دروازے تک آئی۔ کرن اپنے باپ کے کاندھے سے لگی برکھا کو دیکھ رہی تھی۔ برکھا اسے اپنی نظروں میں بھر لینا چاہتی تھی۔

ابھی مناف دو چار قدم آگے ہی بڑھا تھا کہ اسے احساس ہوا جیسے وہ جلتی آگ پر چل رہا ہو۔ پھر ایک دم ہی اس کی قمیض کے پچھلے دامن میں آگ بھڑک اٹھی۔ برکھا نے آگ لگتی دیکھی تو وہ

فوراً چیخی۔ ''مناف آگے مت جانا۔''

مناف کو خود آگ کا احساس ہوا تھا برکھا چیخی تو وہ فوراً ہی پلٹ کر گھر میں واپس آ گیا۔ برکھا نے آگے بڑھ کر اس کے دامن کو دونوں ہاتھوں میں لے کر مسل دیا۔ تھوڑا دامن جل گیا لیکن آگ بجھ گئی۔

''باپو پکا کام کر کے گیا ہے۔ ہم میں سے اب کوئی بھی باہر نہیں جا سکتا۔'' برکھا نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آگ بجھانے کی وجہ سے اس کے ہاتھ ایک دم سرخ ہو گئے تھے۔ پھر وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔ ''اچھا باپو تو اگر میرا باپ ہے تو اتنا یاد رکھ میں بھی تیری بیٹی ہوں اب تو نہیں یا میں نہیں۔''

مناف نے برکھا کا چہرہ دیکھا تو وہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اس نے برکھا کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''برکھا' میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

برکھا نے ایک نظر مناف کو دیکھا اور بولی۔ ''تم پریشان مت ہو' کرن کو لے کر کمرے میں چلے جاؤ اور اندر سے دروازہ بند کر لو۔ اس وقت تک باہر مت آنا جب تک میں تمہیں باہر آنے کا نہ کہوں۔''

''اور اگر ان کو دودھ وغیرہ کی ضرورت ہوئی تو؟''

''میں سب تمہیں دے دوں گی لیکن تم نے کمرے سے باہر قدم نہیں نکالنا ہے۔''

مناف کرن کو لے کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ اس نے برکھا کی ہدایت کے مطابق کمرہ اندر سے بند کر لیا اور کرن کو بیڈ پر لے کر لیٹ گیا۔ کرن اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر کھیلنے لگی۔

برکھا نے صحن کے کونے میں کھڑی جھاڑو کو اٹھایا اور بیچ صحن میں کھڑے ہو کر جھاڑو کی ایک سینک نکالتی' آسمان کی طرف منہ کر کے کچھ پڑھتی اور اس سینک کو زمین پر پھینک دیتی۔ اس طرح آہستہ آہستہ پوری جھاڑو کی سینکیں صحن میں بکھر گئیں۔ جب جھاڑو ختم ہو گئی تو اس نے پھر ایک ایک کر کے ان سینکوں کو اکٹھا کیا اور دوبارہ جھاڑو کو رسی سے باندھ کر باتھ روم کی کنڈی سے لٹکا دیا اور وہ زمین پر آسن جما کر بیٹھ گئی۔ اب اس کی نظریں سامنے ٹنگی جھاڑو پر تھیں اور وہ منہ سے کچھ عجیب سے لفظ نکال رہی تھی۔

بڑی دیر تک وہ اس کام میں لگی رہی۔ یہاں تک کہ سورج ڈھل گیا۔ جب اندھیرا ہو گیا تو اسنے صحن میں لگی لائٹ جلائی او رمناف کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا' مناف نے دروازہ کھولا تو برکھا بولی۔ ''مناف تم ایسا کرو کہ کرن کے لئے دودھ تیار کر لو ور اپنے اور میرے لیے کھانے کے لیے کچھ پکا لو۔ میں کچن میں داخل نہیں ہو سکتی۔ تم یہ کام جلد از جلد کر کے کمرے میں واپس چلے جاؤ۔''

''ٹھیک ہے۔'' مناف نے کہا اور اس کی حسب منشا سارا کام نمٹا لیا۔ پھر دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ مناف نے کرن کو دودھ پلایا۔ کرن دودھ پی کر سو گئی تو مناف نے دروازے سے باہر جھانکا۔

برکھا صحن میں زمین پر بالکل چت لیٹی تھی۔ مناف کو احساس ہوا جیسے وہ بے ہوش پڑی

ہے۔ بھاگ کر اس کے پاس پہنچا تو برکھا نے اپنی بند آنکھیں فوراً کھول دیں اور اسے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی واپس پلٹ آیا اور اس نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

مناف کے دروازہ بند کر لینے کی آواز سن کر اس نے لیٹے لیٹے بایاں پاؤں اوپر اٹھایا اور اس طرح سیدھا کر لیا جیسے کسی چیز کو سہارا دے رکھا ہو۔ پھر وہ عجیب عجیب لفظ بولنے لگی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد وہ اچانک اٹھی اور دوسرے خالی کمرے میں چلی گئی۔ اندر جا کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دیوار کی طرف رخ کر کے رقص کرنے لگی۔ یہ کوئی باقاعدہ رقص نہ تھا بلکہ وہ ایک خاص لفظ منہ سے نکال کر جسم کو حرکت دیتی تھی اور پھر ساکت ہو جاتی تھی۔

''ٹک دھم دھم..... دھم ٹک..... جے کالی..... جے کالی واہ۔''

ایک گھنٹے تک وہ اس طرح کے لفظ بول کر رقص کرتی رہی۔ پھر ایک دم ہی اس کی حالت بدلنے لگی۔ اب اس کے رقص میں خاصی تیزی آ گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سیاہ ہونا شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سیاہی پورے جسم پر پھیل گئی۔ گوری چٹی برکھا ایک دم کالی بھجنگ ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں آگ بھر گئی تھی۔ صورت انتہائی مکروہ..... ایک فٹ لمبی زبان باہر نکلی ہوئی تھی پھر کمرے کے ہر کونے سے بچھوؤں نے برآمد ہونا شروع کیا اور چند لمحوں میں کمرے میں اتنے بچھو بھر گئے کہ کمرے کے فرش پر تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ برکھا اب بھی محو رقص تھی۔ بچھو اس کے پیروں میں آ رہے تھے لیکن دب کوئی نہیں رہا تھا مر کوئی نہیں رہا تھا۔

پھر اچانک کمرے میں ایک مکروہ آواز گونجی۔ ''بس رک جا۔''

اس حکم کو سنتے ہی برکھا ایک دم پتھر کی ہو گئی۔ کچھ دیر وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی اتنی دیر میں سارے بچھو کہیں غائب ہو گئے۔ ایک بلیڈ لے کر وہ فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بازو پر اس جگہ بلیڈ سے شگاف ڈالا جہاں ایک بچھو بنا ہوا تھا اور اس وقت یہ بچھو سفید نظر آ رہا تھا۔ بلیڈ لگتے ہی خون بھل بھل کر کے تیزی سے بہنے لگا۔ اس نے اس خون کو ایک پیالے میں جمع کرنا شروع کیا۔ کچھ دیر میں پورا پیالہ خون سے بھر گیا۔ تب برکھا نے کچھ پڑھ کر زخم پر ہاتھ رکھا تو خون نکلنا بند ہو گیا اور اس کے جسم کی رنگت سفید ہونا شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی اصل حالت میں آ گئی۔

وہ بیٹھے بیٹھے ایک دم چونک گئی۔ جیسے کسی خواب سے چونکی ہو۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا اور پھر جب اس کی نظر خون سے بھرے پیالے پر پڑی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ ایک دم اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ خون سے بھرے پیالے کو اس نے ایک چھوٹی میز پر رکھ دیا اور اسے پلیٹ سے ڈھک دیا۔

پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ مناف حسب الحکم اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مناف جیسے اس کی دستک کا منتظر ہی تھا اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی مناف کو بدبو کا ایک شدید بھبھکا محسوس ہوا یہ بدبو برکھا میں سے آ رہی

تھی۔ نہ صرف بدبو آ رہی تھی بلکہ اس کی خباثت بھی ٹپک رہی تھی۔ مناف کو خوف سا محسوس ہوا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''ٹائم کیا ہوا ہے؟'' برکھا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پوچھا۔

''ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔'' مناف نے کمرے میں لگی دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کرن سو رہی ہے؟'' برکھا نے دروازے میں کھڑے ہو کر اندر نظر ڈالی لیکن اندر نہ گئی۔

''ہاں۔'' مناف نے بیڈ پر نظر ڈالتے ہوئے بتایا۔

''مناف آؤ میرے ساتھ..... دروازہ باہر سے بند کر دو۔'' یہ کہہ کر برکھا پلٹی۔

مناف نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا اور خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس کمرے میں پہنچ کر جہاں خون سے بھرا پیالہ رکھا تھا وہ دھیرے سے بولی۔ ''مناف اب جو میں تمہیں دکھانے لگی ہوں اسے دیکھ کر اور سن کر ڈرنا مت..... تمہیں ذرا جرات سے کام لینا ہو گا ورنہ اب ہم سب کی زندگیوں کی خیر نہیں۔''

پھر اس نے آگے بڑھ کر میز پر رکھے ہوئے پیالے سے پلیٹ ہٹائی تو اتنا سارا خون دیکھ کر مناف کو چکر سا آ گیا۔ اس نے فوراً ہی خود کو سنبھالا اور ہمت کر کے بولا۔ ''یہ کس کا خون ہے؟''

''یہ تمہاری بیوی کا خون ہے۔ بہت قیمتی خون ہے یہ۔ اس قدر قیمتی کہ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں اب اس خون کے لیے ساری زندگی ترسوں گی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو برکھا؟'' مناف حیرت زدہ ہو کر بولا۔

''چلو اس بات کو چھوڑو پھر بتا دوں گی تفصیل سے۔ اب وقت کم ہے۔ وہ آنے والا ہی ہو گا۔ تم میری بات غور سے سن لو۔ اگر تم میری بات پر عمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہم بابوں سے نجات پا لیں گے ورنہ دوسری صورت میں وہ ہمارا نجات دہندہ ثابت ہو گا۔''

پھر برکھا نے اسے پوری تفصیل سے ساری بات بتا دی کہ کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔

وہ دونوں دھڑکتے دل سے اس بری گھڑی کا انتظار کر رہے تھے جو کالی داس کی صورت میں ان پر نازل ہونے والی تھی۔ اب وہ ان کے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ خوشی میں جھومتا چلا آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برکھا اور مناف اس گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکیں گے۔ وہ بڑا مضبوط انتظام کر کے گیا تھا۔ اس جادو کا کوئی توڑ نہ تھا۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ برکھا کو کالی دیوی کے نام پر قربان کر دے گا۔ اس بھینٹ کے بدلے میں اسے ایک زبردست طاقت عطا ہو گی۔ یہ طاقت حاصل کرنے کے بعد وہ مناف کو ٹھکانے لگائے گا۔ اس کی کھوپڑی سے وہ نت نئے کام لے گا۔ جادو کی دنیا میں وہ تہلکہ مچا دے گا۔ لوگ اس کو پوجنے لگیں گے۔ بڑے بڑے لوگ اس کے چرن چھوئیں گے۔ وہ دھرماتما بن جائے گا۔ دھرماتما بن کر وہ لوگوں کا دھرم نشٹ کرے گا۔ اس طرح کالی دنیا میں اس کے مزید درجات بلند ہوں گے۔

وہ سوچتا ہوا اور جھومتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھر پر نظر ڈالی۔ گھر کے اندر مکمل تاریکی تھی۔ اندھیرا دیکھ کر ایک لمحے کو اس کا دل زور زور سے دھڑکا۔ اسے شبہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ نکل تو نہیں گئے۔ ذرا آگے بڑھ کر اس نے دروازے کو غور سے دیکھا۔ دروازے پر کوئی تالا نہ تھا۔

شاید انہوں نے اس کی آمد کو غیر اہم جانا ہے۔ وہ اس کی دھمکی کو نظر انداز کر کے سو گئے ہیں۔ مورکھ نہیں جانتے کہ موت ان کے در پر آ پہنچی ہے۔

تب اس نے ٹھیک وقت پر کنڈی کھٹکھٹائی۔

''کون ہے؟'' اندر سے برکھا کی آواز آئی۔

''میں ہوں تیرا پتا جس نے تجھے پال پوس کر بڑا کیا اور تو نے اسے دھوکا دیا۔'' وہ دروازے کے قریب ہو کر سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''دروازہ کھول یا تیرے گھر کو آگ لگاؤں۔''

''نہ باپو ایسا نہ کرنا میں دروازہ کھول رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے صحن میں لگا بلب روشن کر دیا۔ پھر اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی۔

''باپو کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے۔'' وہ اپنے باپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی لجاجت سے بولی۔

وہ ایک خاص انداز میں مسلسل پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کالی داس کی پیشانی پر جمی تھیں۔ کالید اس اب دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔ جس طرح وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہی تھی ویسے ہی دھیرے دھیرے چوکنا انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔

''اب معافی کا وقت گزر گیا۔ تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ ایک تو میری زندگی بھر کی کمائی تو نے اس ڈرائیور کے ساتھ جا کر تباہ کر دی۔ دوسرا ظلم تو نے یہ کیا کہ اپنا دھرم بدل لیا۔ اب تو سزا کے لیے تیار ہو جا۔ تجھے میں کالی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ چڑھاؤں گا۔ آ اپنا ہاتھ لا اور چل میرے ساتھ۔'' یہ کہہ کر کالی داس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اب خاصا دروازے کے اندر آ گیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ دروازے کے ایک پٹ کی آڑ میں مناف بالکل تیار کھڑا ہے۔ اسے اس بات کی توقع نہ تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے برکھا کی طرف بڑھ رہا تھا اور اسے موت کی دھمکی دے رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ مناف کی صورت میں خود اس کی موت کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہے۔

جیسے ہی کالی داس اس کے آگے آیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر اس کے سر پر خون سے بھرا پیالہ الٹ دیا اور خود اسی پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔

وہ خون میں نہا گیا۔ سر، چہرے، دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف خون ہی خون تھا۔ اس خون نے کسی خطرناک تیزاب کی طرح کام دکھایا۔ خون پڑتے ہی اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو

گئیں۔ جہاں جہاں خون پڑا تھا وہاں کی کھال اترنا شروع ہو گئی۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا اور صرف اتنا کہہ پایا۔ ''یہ تو نے کیا کیا!''

اس کے بعد وہ کچھ کہنے کے قابل نہ رہا۔ مناف جلدی سے دروازہ بند کر کے برکھا کے قریب آ گیا۔ برکھا نے فوراً اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ''تم نے مجھے بچا لیا۔''

''میں نے تمہیں نہیں اپنے آپ کو بچایا ہے اپنی بیٹی کرن کو بچایا ہے۔'' وہ جذباتی ہو کر بولا۔

''ہم سب بچ گئے مناف۔'' اس نے اس سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

''اب اس کا کیا کرنا ہے؟'' مناف نے کالی داس کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''بس ایک کام اور کر دو۔'' برکھا نے کہا۔

''وہ کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہاں صحن میں ایک گڑھا کھود دو اس کے بعد تم کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔ مجھے پھر جو کرنا ہو گا خود کر لوں گی۔'' برکھا نے بڑے پر اسرار لہجے میں کہا۔

مناف نے اسٹور میں پڑے پھاوڑے سے جلدی جلدی اتنا بڑا گڑھا کھود دیا کہ کالی داس کو اس میں دھکیل کر مٹی سے پر کر دیا جائے۔ پتہ نہیں برکھا کیا کرنا چاہتی تھی۔ بہر حال اس نے جو ہدایت کی تھی اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے وہ کمرے میں آ گیا۔

مناف کے کمرے میں جاتے ہی اس نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی تاکہ مناف باہر نہ آ سکے۔ وہ جو کچھ کرنے جا رہی تھی اگر مناف دیکھ لیتا تو شاید اپنے ہوش گنوا بیٹھتا۔

برکھا نے دروازہ بند کر کے صحن کی لائٹ آف کر دی۔ صحن میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ برکھا نے اپنے بال کھول کر ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا اور اپنے باپ کی لاش کے گرد رقص کرنا شروع کیا۔ یہ کوئی باقاعدہ رقص نہ تھا۔ ایک کیفیت تھی' ایک جنون تھا جو اس رقص نما حرکت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے منہ سے کچھ بولتی بھی جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی شکل تبدیل ہونے لگی۔ وہ سیاہ رات جیسی ہو گئی۔ اندھیرے میں اس کی لال لال آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایک فٹ لمبی زبان باہر آ گئی۔ وہ اب تیز تیز کالی داس کی لاش کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ صحن کے کونوں کھدروں سے سیکڑوں بچھو نمودار ہو چکے تھے۔ وہ کالی داس کی لاش پر اس طرح جمع ہو گئے تھے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پر۔

یہ بچھو جن کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بڑی تیزی سے کالی داس کی لاش کو چٹ کر رہے تھے۔ جن بچھوؤں کا پیٹ بھر جاتا وہ پیچھے ہٹ جاتے ان کی جگہ نئے بچھو لے لیتے۔ بچھو کچھ اس طرح

کالی داس کا صفایا کر رہے تھے کہ اس کا سر لاش سے جدا ہو چکا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان بچھوؤں نے کالید اس کے سر کو چھوا بھی نہ تھا۔ برکھا نے کالی داس کا سر اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور تیز تیز رقص کرنے لگی۔

مناف اپنے کمرے میں بند تھا' اسے نہیں معلوم تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ اگر وہ باہر آ کر اس کالی بھجنگ لال لال آنکھوں والی لمبی زبان کی اس عورت کو دیکھ لیتا جس کے ہاتھوں میں کالی داس کا سر تھا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ برکھا اپنی دھن میں مگن منہ سے عجیب سے لفظ بولتی بے ہنگم رقص کرتی جا رہی تھی کہ اچانک باہر سے ایک آواز آئی۔

برکھا اس آواز کو سن کر فوراً رک گئی۔ اس آواز کو سنتے ہی بچھو فوراً ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

برکھا دونوں ہاتھوں میں سر اٹھائے دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھی۔ پھر اس نے ایک ہاتھ سے کنڈی کھول دی اور دروازے کے دونوں پٹ واکر کے ایک قدم دہلیز سے باہر نکالا۔ گلی میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن دو چمکتی آنکھیں اسے نزدیک ہی نظر آ رہی تھیں۔

برکھا نے کالی داس کا سر دروازے کے باہر رکھ دیا اور الٹے قدموں پیچھے ہو کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہی آواز پھر بلند ہوئی۔ یہ آواز کسی کتے کے رونے کی آواز سے مشابہ تھی لیکن اس آواز کو سن کر دل پر ایک خوف سا طاری ہوتا تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی وہ آگے بڑھا۔ وہ ایک کالے رنگ کا گدھے کے برابر کتا تھا۔ چمکتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر اس نے اپنا بڑا سا منہ کھولا اور کالی داس کے سر کو اس میں دبوچ لیا۔ اس کے بعد اس نے سر کو منہ میں دبائے دبائے ایک لمبی جست بھری اور اندھیرے میں اندھیرے جیسا ہو گیا۔

برکھا کو جب یہ احساس ہو گیا کہ دروازے پر رکھی اس بھینٹ کو قبول کر لیا گیا ہے تو وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ باہر سناٹا طاری ہو گیا تھا اگر اس کی بھینٹ قبول نہ ہوئی ہوتی تو کتے کے رونے کی آواز مسلسل آنی شروع ہو جاتی۔ پھر بھی اپنا اطمینان کرنے کے لیے اس نے دروازہ کھول کر دیکھ لیا۔ وہاں کالید اس کا سر موجود نہ تھا۔

برکھا نے دروازہ بند کر کے کالی داس کے باقی ماندہ جسم کو کھینچ کر گڑھے میں ڈالا اور اس گڑھے کو مٹی سے پر کر دیا۔ مٹی میں کالی داس کا بدن غائب ہوتے ہی اس کی حالت تبدیلی ہونے لگی اور چند منٹوں میں ہی وہ گوری چٹی برکھا بن گئی۔

پھر اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے کھول دیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر کمرے میں تاریکی تھی۔ اس نے آواز دی۔ ''مناف! کیا تم سو گئے؟''

''نہیں' برکھا میں جاگ رہا ہوں۔''

''پھر ذرا باہر آؤ..... اس گڑھے کو برابر کر دو۔''

مناف اس کے کہنے پر باہر آ گیا۔ اتنی دیر میں برکھا صحن کی لائٹ جلا چکی تھی۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ کالی داس کی لاش غائب ہے اور وہ گڑھا مٹی سے پر ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ کالی داس کی لاش کہاں گئی۔ اس نے جلدی جلدی مٹی کو برابر کر کے اس پر اینٹیں جما دیں۔ صحن کا فرش برابر ہو گیا تھا۔ بس اب اس پر سیمنٹ کرنا باقی رہ گیا تھا۔

اس رات وہ دونوں بڑے سکون سے سوئے۔ کالی داس ان کے سروں پر کسی تلوار کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ آج وہ تلوار ٹوٹ گئی تھی۔ ان کے دلوں پر جو ایک انجانا خوف سا چھایا رہتا تھا وہ دور ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک اطمینان بھری زندگی گزار سکتے تھے۔

لیکن وہ زندگی ہی کیا جو سکون سے گزرے۔

ان کی زندگی میں ایک ایسا بھونچال آیا کہ نہ صرف انہیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا بلکہ شہر بدر بھی ہونا پڑا۔

☆.....☆.....☆

یہ انقلاب محض ان کی زندگی میں ہی نہیں آیا بلکہ ہزاروں لاکھوں خاندان اس سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی خوشی سے اپنا گھر اور اپنا شہر چھوڑا۔ اب اپنا ملک اپنا وطن جو معرض وجود میں آ گیا تھا پھر غیروں کے دیس میں رہنے کا کیا جواز تھا۔

مناف نے پہلے ڈھاکہ کا رخ کیا۔ والدین کے انتقال کے بعد وہ کراچی میں آ گیا۔ برکھا اب چار لڑکیوں کی ماں ہو چکی تھی۔ بعد میں تین لڑکیوں نے اور جنم لیا اس طرح کل سات لڑکیاں ہو گئیں۔ لڑکیوں نے جیسے ان کا گھر دیکھ لیا تھا۔ ہزار خواہشوں' ہزار دعاؤں' ہزار منتوں کے باوجود کسی لڑکے نے مناف کے گھر پیدا ہونا پسند نہ کیا۔

پہلی لڑکی کا نام کرن تھا اور آخری یعنی ساتویں لڑکی کا نام ورشا تھا' ورشا مناف.....

جب ورشا پیدا ہوئی تو اس کی پیٹھ پر بچھو کا نشان دیکھ کر برکھا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا تھا۔ اس نے اس نشان کی کسی کو ہوا نہ لگنے دی۔ ایک دن مناف نے اس نشان کو دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا تو برکھا نے اسے برص کا دھبہ قرار دے کر ٹال دیا اور یونہی دو چار بار کوئی مرہم لگا کر برص کے علاج کا تاثر دے کر اس کی تسلی کر دی۔ اس نشان کو وہ جب بھی اکیلے میں دیکھتی تو بہت خوش ہوتی۔ اس لڑکی کا تو اسے انتظار تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو اس کی سالوں پرانی پیاس بجھانے آئی تھی۔ وہ پیاس جو اس کا باپ کالی داس بھڑکا کر چلا گیا تھا۔ اب اس کی بیٹی اس پیاس کو بجھانے آ گئی تھی اور یہ سب اگور کے باپ کی مہربانی سے ہوا تھا۔

مناف نے کراچی میں آ کر مختلف کاروبار کیے۔ بالآخر وہ ایک آئس فیکٹری چلانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک منافع بخش کاروبار تھا۔ پیسے جمع ہوتے ہی اس نے گارڈن ایسٹ میں ایک بنگلہ خرید لیا۔ یہ کسی ہندو کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے کی دیواروں پر ہندوانے نقش بنے ہوئے تھے۔ اس بنگلے کا ایک کمرہ جو سب سے تاریک تھا جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا وہ کمرہ برکھا کو بہت پسند تھا۔ وہ اکثر اس کمرے میں پائی جاتی تھی۔

کالی داس کے مرنے کے بعد برکھا کے طور طریقوں میں ایک پراسراری تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ بمبئی والی برکھا نہ رہی تھی جس کے ساتھ مناف نے دہلی میں ایک خوبصورت وقت گزارا تھا۔ وقت تو خیر کراچی میں بھی ٹھیک ہی گزر رہا تھا لیکن یہاں آ کر اب یہ احساس زیادہ گہرا ہو گیا تھا کہ برکھا کچھ پراسرار سرگرمیوں میں ملوث ہو گئی ہے۔

مناف کو تو خیر محض شبہ ہی تھا لیکن اس کی بیٹیوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ ان کی ماں دن بھر کیا کرتی رہتی ہے اور اس سے کس قسم کے مرد اور عورتیں ملنے آتی ہیں اور وہ تاریک کمرے میں بیٹھ کر جانے کیا کرتی رہتی ہے۔ بیٹیوں کی شادیاں ہوتی رہیں اور وہ کسی پنجرے سے آزاد ہونے والے پنچھیوں کی طرح اڑتی رہیں۔ سسرال جا کر انہوں نے کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ میکہ کس طرف ہے۔ برکھا کو اپنی بیٹیوں کی مطلق فکر نہ تھی۔ آتی ہیں تو آئیں نہیں آتی تو بھاڑ میں جائیں۔ البتہ مناف کو اپنی بیٹیوں کی طرف سے پریشانی رہتی تھی کہ وہ آخر گھر آتی کیوں نہیں۔

ورشا تیرہ سال کی ہوئی تو اس کا باپ مناف اس دنیا میں نہ رہا۔ ورشا کی آنکھوں کے سامنے اگر وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو وہ اپنی ماں کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین کر لیتی جو اس نے اس کی بہنوں اور دنیا والوں کو سنائی تھی کہ مناف نے دوسری شادی کر لی اور وہ خفیہ طور پر کینیڈا چلا گیا۔

ایک رات ورشا پڑھ رہی تھی کہ اسے اپنے والدین کے کمرے سے شور شرابے کی آواز سنائی دی۔ ان کا بیڈروم ورشا کے کمرے سے ملحق تھا۔ وہ اپنے کمرے کی لائٹ بجھا کر اسٹول پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی اور درمیان کے دروازے میں لگے شیشے سے ادھر جھانکنے لگی۔

اس کی ماں ابھی ابھی باہر سے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا جس میں ایک چمگادڑ بند تھی۔ اتنی رات گئے آنے پر مناف نے اس سے باز پرس کی تو برکھا کے تیور ایک دم بدل گئے۔ وہ غصے میں بولی۔ ''تمہیں کیا پریشانی ہے۔ میں جب چاہے آؤں۔''

یہ جواب مناف کے دل پر چھری کی طرح لگا۔ وہ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ پہلے تو اس نے وہ پنجرہ چھین کر دروازے سے باہر پھینکا اور پھر اس کے بال پکڑ کر زور کا دھکا دیا۔ برکھا کا سر دیوار سے ٹکرایا اور ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ مناف نے اس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

''مجھے میں نے بہت آزادی دے دی ہے۔ آج کے بعد سے تو میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی۔'' مناف نے اس کے بال پکڑ کر بیڈ پر زور سے دھکا دیا۔

وہ بیڈ پر گری اور گرتے ہی تیزی سے کھڑی ہو گئی۔ ورشا کا خیال تھا کہ اب ماں اس کے باپ پر حملہ کرے گی لیکن اس نے اسے کچھ نہ کہا۔ بس ایک نظر گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ تو گھر میں رہے گا تو تجھ سے اجازت لوں گی ناں۔ اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

ورشا نے سوچا شاید وہ اس کے کمرے میں آئے گی اس لئے وہ اسٹول سے کود کر فوراً بیڈ پر پہنچ گئی اور برکھا کے دروازہ کھٹکھٹانے کا انتظار کرنے لگی لیکن وہ نہ آئی۔ کچھ دیر بعد برابر کے کمرے سے ایک چیخ کی آواز آئی۔ یہ اس کے باپ کی آواز تھی۔

ورشا نے جلدی سے اسٹول پر چڑھ کر ادھر جھانکا تو باپ کو خون میں نہایا ہوا پایا۔ وہ اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھ کر چکرا کر گر پڑی۔ اس کے ہوش گم ہو گئے۔

برکھا پر مناف نے آج تک ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ مار کھا کر خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ کمرے سے باہر نکلی۔ کچھ بڑھتی ہوئی کچن میں گئی۔ وہاں ایک تیز دھار والی چھری سے اپنے بازو پر جہاں پنجے

بنا ہوا تھا ایک کٹ مارا۔ زخم لگاتے ہی خون بھل بھل کر کے بہنے لگا۔ اس نے اس خون کو چینی کے بڑے پیالے میں جمع کر لیا اور اس پیالے کو اپنے پیچھے چھپا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ مناف کو اس پر ہاتھ اٹھانے کا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹا تھا کہ اچانک اس کے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ وہ اپنی آنکھیں بھی نہ کھول سکا۔ چیخ مار کر اٹھا اور پھر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

خون کی بو پھیلتے ہی کونے کھدروں سے بچھو نکلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے مناف کی لاش پر چھا گئے۔ برکھا نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور پھر لاش کے گرد بھینٹ ناچ شروع کر دیا۔ جلد ہی اس کی شکل تبدیل ہو گئی۔ اس کی زبان ایک فٹ باہر آ چکی تھی۔

کچھ دیر کے بعد باہر سے کتے کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے مناف کا سر اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور دروازے پر رکھ آئی۔ دروازے پر منتظر اس گدھے برابر کالے کتے نے اس سر کو اپنے بڑے سے منہ میں لیا اور اندھیرے میں جست لگا کر خود بھی اندھیرا ہو گیا۔

برکھا نے مناف کے باقی ماندہ جسم کو ٹین کے ایک بکس میں ڈال دیا اور پھر اس پر نشہ سا چھانے لگا۔ وہ پرسکون ہو کر سو گئی۔

ورشا کو جب ہوش آیا تو وہ اسٹول کے پاس ہی فرش پر پڑی تھی۔ کمرے میں خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ رات کا واقعہ پوری ہولناکی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں منجمد تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر گئی تو برکھا بڑے مزے سے خراٹے بھر رہی تھی۔ بیڈ کے نزدیک ایک ہی ٹین کا بکس پڑا تھا اور اس میں بڑا سا تالا لگا تھا۔ مناف کا کہیں دور تک پتہ نہ تھا۔ ورشا کو خیال آیا کہ کہیں اس نے کوئی بھیانک خواب تو نہیں دیکھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر وہ خواب ہوتا تو وہ اسٹول کے نزدیک فرش پر کیوں پڑی ہوتی۔

اس نے اپنی سوتی ہوئی ماں کو جھنجھوڑ دیا۔ ''ممی، ممی.....''

برکھا کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور کسی قدر غصے سے بولی۔ ''کیا ہے؟''

''ممی تم نے میرے باپ کو مار دیا تم قاتل ہو۔''

''بے وقوف میں نے تو اپنے باپ کو بھی مار دیا تھا۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ''تیرا باپ تو کوئی چیز ہی نہ تھا۔''

''ممی، تم کس قدر.....'' ورشا اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ممی تم کس قدر ذلیل دکھنی ہو مگر وہ کچھ نہ کہہ پائی۔ برکھا نے اسے اچانک کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ ورشا کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس نے اپنی ماں کی آنکھوں میں آگ بھڑکتی ہوئی دیکھی۔ چند سیکنڈوں میں اس کا چہرہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔ ورشا نے گھبرا کر اپنا منہ پھیر لیا۔

کہا۔

''جاؤ کچن میں جا کر ناشتہ تیار کرو مجھے بہت بھوک لگی ہے۔'' برکھا نے تحکمانہ لہجے میں

''جی اچھا ممی۔'' ورشا نے انتہائی فرماں برداری سے کہا اور سر جھکا کر کچن کی طرف چلی گئی۔

وہ پہلا اور آخری دن تھا۔ اس کے بعد سے ورشا نے اپنی ماں کے سامنے کبھی زبان نہ چلائی۔ وہ کچھ اس طرح خوفزدہ ہوئی کہ ماں کے منہ سے نکلا ہو ہر لفظ اس کے لیے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔

اس دن خوب ڈٹ کر ناشتہ کرنے کے بعد برکھا نے کپڑے تبدیل کیے۔ گاڑی گھر میں موجود ہونے کے باوجود وہ باہر سے ایک ٹیکسی لے کر آئی۔ ٹیکسی والے کے ساتھ مل کر گھر کے کچن سے بکس اٹھوایا۔ ٹیکسی کی چھت پر رکھا اور ورشا سے کہا۔ ''تم گھر کا دروازہ بند کر لو میں ڈیڑھ دو گھنٹے میں واپس آتی ہوں۔''

پھر وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

وہ اسٹیشن پہنچی۔ گاڑی لاہور جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس نے لیڈیز کمپارٹمنٹ میں پہنچ کر وہ بکس قلی سے ایک برتھ کے نیچے رکھوایا اور قلی کو پیسے ادا کر کے بڑے اطمینان سے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ایک دو منٹ ڈبے کا جائزہ لیا۔ پھر اپنے برابر بیٹھی عورت سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''بہن ذرا میرے بکس کا خیال رکھنا' اس میں کچھ قیمتی سامان ہے۔ میں ابھی ذرا اپنے شوہر کو دیکھ کر آتی ہوں۔''

پھر برکھا نے اس عورت کا جواب بھی نہ سنا اور تیزی سے کمپارٹمنٹ سے اتر گئی۔ سنگل ڈاؤن ہو گیا تھا۔ گارڈ سیٹی بجا کر ہری جھنڈی دکھا رہا تھا اور برکھا تیز قدموں سے اسٹیشن کے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ادھر وہ گیٹ سے باہر نکلی ادھر گاڑی نے اسٹیشن چھوڑ دیا۔ برکھا نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور ٹیکسی پکڑ کر اپنے گھر آ گئی۔

وہ عورت جس سے برکھا نے بکس کی رکھوالی کے لیے کہا تھا ملتان کی تھی۔ جب ملتان تک برکھا ڈبے میں نہ آئی تو اس عورت کی نیت بدل گئی۔ ملتان آنے پر اس نے اپنے سامان کے ساتھ وہ بکس بھی اتار لیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ تانگے میں برکھا کا بکس اور اپنا سامان رکھوا کر اپنے گھر چلی گئی۔

وہ عورت بہت خوش تھی۔ ایک قیمتی سامان والا بکس اس کے مفت ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے اپنے بیٹے سے اس بکس کا تالا توڑنے کے لیے کہا۔ بیٹے نے سل کا بٹہ اٹھا کر جو دو چار کراری چوٹیں تالے پر ماریں تو تالا ان چوٹوں کو برداشت نہ کر سکا' کھل گیا۔

بیٹے نے تالا ایک طرف پھینک کر جلدی سے بکس کا ڈھکن اٹھایا۔ ڈھکن اٹھتے ہی اس عورت نے بکس میں جو کچھ دیکھا اسے دیکھتے ہی وہ چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ بیٹا جوان تھا وہ بے ہوش تو نہ ہوا لیکن اس کی حالت خراب ہو گئی۔

بکس میں انسانی گوشت' خون اور ہڈیوں کا ملغوبہ پڑا تھا۔ اس نے فوراً بکس کا ڈھکن بند کر دیا اور بے ہوش ماں کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کچھ دیر کے بعد اس کو ہوش آ گیا۔ بیٹے کی

طبیعت بھی سنبھل گئی۔

بیٹا ماں اور ماں بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس میں کیا چیز ہے۔ اگر یہ انسان ہے تو اس کا سر کہاں ہے اور یہ جسم' گوشت' ہڈیوں اور رخون کا ملغوبہ کیوں ہے۔ ان دونوں نے آج تک ایسی لاش نہ دیکھی تھی۔

اب سردست مسئلہ یہ تھا کہ اس کا کیا کیا جائے؟ ان کے گھر کا صحن کچا تھا اور اس میں امرود کا درخت لگا تھا۔ ملے یہ پایا کہ بکس میں موجود اس ملغوبے کو امرود کی جڑ کی زمین کھود کر بکس سمیت دفن کر دیا جائے۔ تبھی اس سے نجات ممکن تھی..... اس طرح ڈھاکا کا مناف زندگی کا سفر کرتا اور مخصوص قبر تو دور کی بات ہے انہیں دفن کے لیے زمین بھی نصیب ہو گی یا نہیں۔

مناف کو ٹھکانے لگانے کے بعد برکھا بالکل بے خوف ہو گئی۔ ڈر تو خیر اس کا اسی وقت نکل گیا تھا جب وہ اپنے باپ کالی داس کو بھینٹ چڑھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ رہی سہی کسر مناف کے قتل نے پوری کر دی۔ اب وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذموم مقاصد کے لیے کوشاں تھی۔ ورنہ کو اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ ایک طرح سے وہ اس کی قید میں تھی اور بڑی فرمان برداری سے اس کا ہر حکم بجا لاتی تھی۔

برکھا اب "مانا" کے چکر میں پڑ گئی تھی۔ "مانا" طاغوتی قوتوں میں ایک بڑی قوت تھی۔ اسے حاصل کرنے کے بعد اپنی مرضی کے مطابق زندہ رہا جا سکتا تھا۔ "مانا" حاصل کرنے کے بعد "ربطول" کی طرف پیش قدمی کی جا سکتی تھی۔ "ربطول" کتاب سحر تھی۔ یہ کتاب فرعون کے عہد کے سو بڑے جادوگروں نے مرتب کی تھی۔ اس کتاب کا صرف ایک نسخہ تیار کیا گیا تھا اور اس نسخے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ پہلے حصے میں منتر تھے اور دوسرے حصے میں ان منتروں کو کس طرح پڑھنا ہے' یہ تحریر کیا گیا تھا۔ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے بغیر بے اثر تھے۔ بادشاہ وقت کے پاس "ربطول" کے دونوں حصے ہوتے تھے جسے وہ الگ الگ رکھتا تھا تاکہ کتاب سحر چوری ہو جانے کی صورت میں چور کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ یہ کتاب فراعنہ مصر کے پاس نسل در نسل چلی آ رہی تھی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ اس کا ایک حصہ غائب ہو گیا اور یوں سحر کی سب سے بڑی اور قدیم کتاب بے اثر ہو گئی۔ پر اسرار قوت "مانا" کو حاصل کرنے کے بعد اس سے اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ "مانا" کے علاوہ "ربطول" کے بارے میں کوئی اور کچھ نہیں جانتا تھا۔

برکھا چاہتی تھی کہ کسی طرح زبردست قوت "مانا" ہاتھ لگ جائے لیکن "مانا" کو حاصل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ ایک بڑی کٹھن ڈگر تھی جس پر چلنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا تھا۔ ذرا سا غلط قدم اٹھنے پر بندہ گھر کا رہتا نہ گھاٹ کا۔ دو بھینٹ چڑھانے کے بعد اگرچہ برکھا کی پیاس مزید بھڑک اٹھی تھی لیکن اب اسے کہیں دور ایک امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔ دو بھینٹوں کے بعد راستہ کچھ

آسان ہوا تھا اور سب سے بڑی بات ورشا سے مل گئی تھی۔ اس کی پیٹھ پر بچھو کا نشان تھا اور پیدائشی تھا۔ جو قوت اس کے نانا کالی داس نے بڑی محنت اور جتن سے حاصل کی تھی وہ قوت ورشا کو بغیر کسی محنت کے حاصل ہو گئی تھی۔ ورشا اپنے آپ سے ناواقف تھی۔ اسی لیے وہ اپنی ماں کی غلام بن گئی تھی جبکہ وہ غلامی کرنے کے لیے نہیں پیدا ہوئی تھی۔ وہ پیدائشی آقا تھی۔

برکھا ہی نے اسے ساحل عمر کے پیچھے لگایا تھا۔ برکھا نے ساحل عمر کو ایک طویل عرصے کے بعد کھوجا تھا۔ ساحل عمر میں ایک ایسی خاص بات تھی جو برکھا کو "مانا" حاصل کرنے میں کامیاب کر سکتی تھی۔ برکھا نے ورشا کو جال بنا کر ساحل عمر پر پھینکا تھا۔ ساحل عمر اس کے جال میں آ گیا تھا۔

وہ ابھی تک سڑک پر گم صم کھڑا تھا۔ ورشا جا چکی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اسے اپنی کوئی متاع عزیز گم ہونے کا احساس ہوا' اسے اپنا جسم خالی خالی سا لگا۔ اسے لگا جیسے کچھ ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے یہ اسے معلوم نہ تھا..... وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ورشا کے سحر میں آ گیا' اس کے فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔

ایک گاڑی قریب سے ہارن دیتی گزری تو اچانک اسے ہوش آیا۔ اسے پتہ چلا کہ وہ سڑک پر کھڑا ہے۔ ورشا اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکی ہے اور وہ تماشا بنا کھڑا تھا۔ اپنی حالت پر وہ دل ہی دل میں مسکرایا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کے رستے پر ہو لیا۔

☆☆☆☆☆

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر جب اس نے گاڑی کا ہارن بجایا تو فوراً ہی گیٹ کھل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے برکھا گیٹ کے پیچھے کھڑی اس کی منتظر تھی۔ برکھا کو دیکھ کر ورشا نے گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر خوشی سے نعرہ لگایا۔ "ہائے ممی.....!"

برکھا نے بھی جواباً اسے خوش آمدید کہا۔ "ہائے جان.....!"

ورشا گیٹ کھلتے ہی گاڑی اندر لیتی چلی گئی۔ جب وہ گاڑی لاک کر کے بنگلے کی طرف بڑھی تو اتنے میں برکھا بھی اس کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اس نے ورشا کو آگے بڑھ کر گلے لگایا اور بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کہو کیسی رہی پہلی ملاقات۔"

"بہت اچھی۔" ورشا اپنی ماں کا ہاتھ پکڑے بنگلے میں داخل ہوئی۔

"اسے کیسا لگا تم سے ملنا؟" برکھا نے پوچھا۔ "کیا تم اسے پسند آ گئیں۔"

"ممی! وہ بہت خوش تھا' اتنا خوش کہ میں بتا نہیں سکتی۔" ورشا نے بتایا۔ "رہ گئی یہ بات کہ میں اسے پسند آئی یا نہیں تو ممی میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ کوئی ایسا ہے جو آپ کی بیٹی سے ملے اور اسے پسند نہ کرے۔"

"نہیں کوئی نہیں۔" برکھا نے ورشا کو بڑے فخر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کسی کی کیا مجال جو ورشا کو ریجیکٹ کر دے۔ میں اس کا خون نہ پی جاؤں گی۔"

"ممی ایک بات پوچھوں' بتاؤ گی؟" ورشا بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ہاں پوچھو ضرور بتاؤں گی۔" وہ خوشدلی سے بولی۔

"ساحل میں ایسا کیا ہے کہ تم نے اس سے ملاقات کے لیے اتنا لمبا چکر چلایا۔"

"کیا وہ تمہیں اچھا نہیں لگا۔" برکھا نے پوچھا۔

"وہ اتنا اچھا' اتنا دلکش اور من موہنا ہے کہ کوئی بھی لڑکی اس کی پوجا کر سکتی ہے۔"

"تو پھر؟" برکھا نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ممی! میں یہاں اپنی بات نہیں کر رہی' آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ آپ نے اس میں کیا دیکھا؟"

"وہ ایک کیاب بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نایاب چیز ہے۔" برکھا خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "میں نے اسے بڑی مشکلوں سے تلاش کیا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اس کے پیچھے ہوں۔ اب وہ وقت قریب آ رہا ہے جس کی میں منتظر تھی۔ ورشا اگر میں اپنے مشن میں کامیاب ہو گئی تو تیری ممی تیرے قدموں میں دنیا جہان کی آسائشیں ڈال دے گی۔ تجھے وہ کچھ مل جائے گا جس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اوہ ممی تمہیں کیا ملے گا؟" ورشا نے پوچھا۔

"مجھے مانا مل جائے گی۔ ایک ایسی شکتی ایک ایسی پر اسرار طاقت جس کا بلیک ورلڈ میں بڑا چرچا ہے۔ میں اس قوت کو حاصل کر کے اپنی زندگی کی مالک ہو جاؤں گی۔ جب چاہوں گی او رجب تک چاہوں گی اس دنیا میں عیش کروں گی۔ یہ دنیا اور دنیا والے تیری ممی کے اشارے پر ناچیں گے۔" برکھا نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"سچ ممی.....!"

"ہاں بیٹی۔" برکھا نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب تم کھانا کھا لو اس کے بعد اپنے وقت پر اسے فون کر لینا۔ اس پر اپنی گرفت مضبوط کرو۔ اتنی مضبوط کہ وہ سانس لینے کے لیے بھی تم سے اجازت مانگے۔"

"ممی.....تم بے فکر ہو جاؤ۔" ورشا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

گھر کے دروازے پر پہنچ کر ساحل عمر نے اپنے مخصوص انداز میں تین بار ہارن دیا اور گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اندازہ تھا کہ اماں کتنی دیر میں گیٹ تک پہنچیں گی لیکن آج گیٹ توقع سے پہلے ہی کھلنے کے آثار پیدا ہو گئے۔ شاید اماں گھر کے باہر لان میں اس کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں۔ جیسے ہی ساحل عمر نے ہارن بجایا چند لمحوں بعد ہی اماں کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

ساحل عمر نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ "اماں' میں ہوں!"

اس کی آواز سنتے ہی انہوں نے فوراً گیٹ کھول دیا اور ایک طرف کو ہٹ گئیں۔ ساحل عمر گاڑی اندر لے آنے کے بعد اماں کا انتظار کرنے لگا۔ وہ گیٹ کو تالا لگا کر خراماں خراماں چلی آئی تھیں۔

"اماں کوئی فون تو نہیں آیا۔" جب اماں قریب آ گئیں تو ساحل عمران سے مخاطب ہوا۔

''ناصر مرزا کا آیا تھا۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیا کہہ رہے تھے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''انہوں نے کہا کہ آئیں تو مجھے فون کر لیں۔'' اماں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' ساحل عمر نے اماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اماں بڑی بھوک لگی ہے جلدی کھانا نکالو۔''

''اچھا نکالتی ہوں۔ تم کپڑے تبدیل کر کے آؤ۔'' پھر اماں نے ترچھی نظروں سے ساحل عمر کو دیکھا۔ ''ساحل ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گے۔''

''ہاں' اماں بالکل سچ بتاؤں گا ویسے بھی میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

''آج تم مجھے بہت دن کے بعد خوش نظر آ رہے ہو۔ اس خوشی کا نام بتانا پسند کرو گے۔''

''صبر کرو اماں!'' ساحل عمر نے اماں کے سر پر بزرگوں کی طرح ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔''

''اب صبر نہیں ہوتا مجھ سے..... کیا تم جانتے نہیں کہ میرا پیمانہ عمر اب چھلکنے کو ہے۔'' اماں نے افسردگی سے کہا۔

''اماں کھانا' بہت بھوک لگی ہے۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر واش روم میں داخل ہو گیا۔ اس نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ کچھ دیر گھر کے لان پر ٹہلا۔ اتنی دیر میں اماں نے باہر آ کر اطلاع دی۔ ''فون ہے۔''

''اوہ.....'' ساحل عمر نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ یہ فون ضرور ناصر مرزا کا ہو گا۔ اسے گھر آتے ہی انہیں فون کر لینا چاہیے تھا۔ اب وہ اسے ٹھیک ٹھاک سنائیں گے۔

گھر میں آ کر اس نے اماں سے پوچھا۔ ''فون ناصر مرزا کا ہے؟''

''نہیں کوئی لڑکی ہے۔'' اماں نے بتایا۔

لڑکی کا سن کر ساحل عمر نے فوراً اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ گھڑی میں گیارہ بج کر چھ منٹ ہوئے تھے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں پہنچا اور ریسیور اٹھایا۔ ''جی!''

''ہائے رانجھن' پہنچ گئے گھر خیریت سے!'' ایک کھنک دار آواز سنائی دی۔

''اوہ تو یہ آپ ہیں؟'' ساحل عمر نے اپنائیت سے کہا۔

''کیوں میرے فون کی توقع نہ تھی' جانتے نہیں ہو کہ یہ وقت میرا ہے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا۔

''ہاں کم از کم آج تو توقع نہ تھی۔'' ساحل عمر نے صاف گوئی سے کہا۔

''وہ کیوں؟'' اس کی آواز میں حیرت تھی۔

''ہم آج ہی تو ملے تھے۔'' ساحل عمر نے جواب دیا۔

''میں جب تک تم سے ملی نہ تھی تب تک مجھے اپنے آپ پر اختیار تھا پر اب تو میں

اختیار ہو گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے تم سے بات کرتی ہی رہوں۔'' اس کے لہجے میں پیار بھرا تھا۔

''ورشا' میرا بھی یہی جی چاہتا ہے؟''

''سچ' راجمن۔'' ورشا بے اختیار خوش ہو کر بولی۔

''ہاں ورشا! مجھے اپنا فون نمبر دے دو' میں اگر بات کرنا چاہوں تو کر تو سکوں۔ میں تم سے تمہارا فون نمبر لینا ہی بھول گیا۔''

''لکھ لو۔'' ورشا نے کہا۔

''ایک منٹ!'' ساحل عمر نے بال پوائنٹ نکالنے کے لیے دراز کھولی۔ پھر اس نے ورشا کا بتایا ہوا فون نمبر اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

''میں اگر تمہیں فون کروں تو تمہیں کوئی الجھن تو نہ ہو گی..... میرا مطلب ہے کہ.....''

''میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔'' ورشا نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''جہاں میں رہتی ہوں وہاں میری ممی کے سوا کوئی نہیں رہتا اور انہیں تمہارا فون ریسیو کر کے خوشی ہو گی اور جب تم ان سے ملو گے تو تمہیں ان سے مل کر مزید خوشی ہو گی۔ میری ممی کا کوئی جواب نہیں۔'' ورشا نے اپنی ماں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ برکھا اس کے سامنے ہی بیٹھی تھی۔

''تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے' کیا تمہارا کوئی جواب ہے؟''

''میرا جواب.....!'' ورشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں میرا جواب تو ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟'' ساحل عمر نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ سامنے جس سے میں باتیں کر رہی ہوں' کیوں غلط کہا میں نے۔'' ورشا ہنسی۔

''میں تمہارا جواب کیسے ہو سکتا ہوں۔'' ساحل عمر نے انکساری دکھائی۔

''مان جاؤ راجمن' ہم دونوں ایک دوسرے کے سوال جواب ہیں' ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ ہم لازم و ملزم ہیں۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔'' ورشا نے یک طرفہ بیان دے کر اپنے مشن کو آگے بڑھایا۔

ابھی وہ کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی نظر سامنے تصویر پر پڑی۔ رشاملوک کی تصویر پر نظر پڑتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ غصے میں اسے دیکھ رہی ہو۔ وہ گڑبڑا گیا۔ جو جواب اس کے ذہن میں آیا تھا وہ اس کے ذہن سے نکل گیا۔ اس نے فوراً اپنی نظریں تصویر سے ہٹا لیں۔

''کیا ہوا راجمن' کہاں کھو گئے۔'' ورشا نے اس کی خاموشی کو فوراً محسوس کر لیا۔

''نہیں کچھ نہیں ورشا۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا کھنچاؤ آ گیا۔

''کچھ تو ضرور ہے کیا تمہارے کمرے میں کوئی آ گیا ہے؟'' ورشا نے شک ظاہر کیا۔

اس سوال پر ساحل عمر کی نظریں پھر رشاملوک کی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دھیرے سے بولا۔ ''نہیں ایسا کچھ نہیں..... تم بات کرو۔''

''رانجھن اب ہم کب ملیں گے؟'' ورشا نے پوچھا۔
''جب تم چاہو۔'' ساحل عمر نے جواب دیا۔
''اچھا! پھر میں فون کر کے بتاؤں گی۔ او کے۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
وہ کچھ دیر ریسیور تھامے تصویر دیکھتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔
رشا ملوک.....!
ورشا مناف.....!
یہ دونوں لڑکیاں بیک وقت اس کی زندگی میں آئی تھیں۔ رشا ملوک تو خیر ابھی ایک خواب تھی لیکن ورشا حقیقت بن کر سامنے آ گئی تھی۔ ساحل عمر خواب اور حقیقت کے درمیان گھرا تھا۔ اس کے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ خواب اچھا ہے یا حقیقت..... حقیقت پھر حقیقت ہوتی ہے۔ اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا جبکہ خواب پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔
جو حسن رشا میں تھا وہ ورشا میں نہ تھا اور جو جاذبیت ورشا میں تھی وہ رشا میں نہ تھی۔ رشا کا حسن ملکوتی تھا۔ اسے دیکھ کر خالق کی یاد آتی تھی جبکہ ورشا کی دلکشی میں ایک ہلچل تھی۔ اسے دیکھ کر آدمی بے قرار ہو جاتا تھا اسے پانے کی خواہش اس کے دل میں مچلنے لگتی تھی۔
ساحل عمر کی اگرچہ آج ورشا سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اس کے باوجود اس کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ وہ ایک سحر بن کر اس پر چھاتی چلی جا رہی تھی۔
رات کو خواب میں ساحل عمر نے رشا ملوک کو دیکھا۔ وہ بے چینی سے ایک چشمے کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ ساحل عمر گھوڑے پر سوار تھا اس نے دور سے جب رشا ملوک کو ٹہلتے دیکھا تو اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ رشا ملوک نے اسے اپنے نزدیک آتا دیکھ کر اپنا رخ موڑ لیا۔ وہ منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔
ساحل عمر تھوڑا سا گھوم کر اس کے سامنے پہنچا تو اس نے اپنا رخ مخالف سمت میں کر لیا۔
اب ساحل عمر اس کے سامنے نہ آیا' اسے احساس ہوا جیسے وہ ناراض ہے۔ اس نے پیچھے کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا۔ ''ناراض ہو؟''
''ہاں! بہت۔'' اس نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کیوں آخر؟'' ساحل عمر پھر گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔
اس مرتبہ رشا ملوک نے اپنا منہ نہیں پھیرا۔ اس کے چہرے پر بے حد اداسی تھی۔ اس نے شکوہ بھری نظروں سے ساحل عمر کی طرف دیکھا۔
''کیا ہوا آخر.....؟ کچھ بولو تو.....'' ساحل عمر نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔
''کیا بولوں.....؟ تم سے میں نے کہا تھا دیکھو کسی کے فریب میں نہ آ جانا لیکن تم خود کو سنبھال نہیں پائے۔'' رشا ملوک نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شکوہ کیا۔
''تم کس کا ذکر کر رہی ہو؟''
''میں کسی کا ذکر نہیں کر رہی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''جب تک مجھے صاف صاف بتاؤ گی نہیں' میں سمجھوں گا کیسے؟'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''میری ایک بات غور سے سن لو جتنی جلد ممکن ہو سکے جھکال کی تصویر مکمل کر لو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' رشا ملوک نے تنبیہہ کی۔

''میری بھلائی......؟ وہ کیسے۔'' ساحل عمر کی کچھ سمجھ نہ آیا۔

''تم سوال بہت کرتے ہو؟'' رشا ملوک نے کسی قدر ناراضگی سے کہا۔

''اچھا! ناراض نہ ہو تم نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کروں گا۔ اب تو خوش ہو۔''

''وعدہ کرو کہ سارے کام چھوڑ کر جھکال کی تصویر مکمل کرو گے۔''

''وعدہ۔'' ساحل عمر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اسی وقت گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ اس نے چونک کر گھوڑے کی طرف دیکھا۔ تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ اس نے خواب میں رشا ملوک سے جھکال کی تصویر جلد از جلد مکمل کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جھکال کا رشا ملوک سے کیا تعلق ہے اور خود اس کی بھلائی کیسے ممکن ہے۔ بہر حال جو بھی تھا اب اس تصویر کو جلد از جلد مکمل کرنا تھا۔ جھکال کی تصویر پر کام تو جاری تھا۔ آدھی سے زیادہ تصویر مکمل بھی تھی۔ بس بیچ میں دو تین روز کا گیپ آ گیا تھا۔ وہ ورشا کے چکر میں آ گیا تھا۔ اب اس نے طے کیا دن رات لگ کر اس کام کو مکمل کرے گا۔

صبح اٹھتے ہی اس نے رنگ اور برش سنبھال لیے اور کام پر لگ گیا۔

دس دن کے اندر اس نے تصویر مکمل کر لی۔ اس درمیان ورشا سے ایک ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات ایک چائنیز ریستوران میں ہوئی۔ دونوں نے رات کا کھانا کھایا۔ کافی پی۔ خوب گپیں ماریں۔ دو تین گھنٹے دونوں نے زبردست انجوائے کیا۔

جب وہ اٹھنے لگے تو ورشا اٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔ ''پلیز ایک منٹ۔''

ساحل عمر دوبارہ بیٹھ گیا اور اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے بیگ میں کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔

''کیا ہوا ورشا خیریت تو ہے؟''

''ایک چھوٹا سا تحفہ ہے تمہارے لیے۔ ممی نے بھیجا ہے۔'' ورشا بیگ میں ڈھونڈتے ہوئے بولی۔ ''کہاں گئی؟ ہاں یہ رہی۔'' اس نے بیگ سے ہاتھ نکالا تو اس میں ایک انگوٹھی تھی۔

یہ ایک چاندی کی انگوٹھی تھی۔ اس میں بڑا سا کالے رنگ کا بیضوی پتھر لگا ہوا تھا۔

''یہ لو......!'' اس نے انگوٹھی اس کی طرف بڑھائی۔ ''یہ ممی کا خاص شوق ہے۔ ممی کو پتھروں کی بڑی پہچان ہے۔ وہ لوگوں کو پتھر دیتی رہتی ہیں۔ ان کے پاس بہت سے پتھر ہیں۔ تمہارے لیے انہوں نے پتھر بطور خاص منتخب کیا ہے۔ مجھ سے انہوں نے تمہارا پورا نام اور جنم دن دریافت کیا تھا۔ پھر وہ بڑی دیر تک سلیٹ پر آڑے ترچھے نقشے بناتی رہیں۔ پھر انہوں نے یہ کالا پتھر

نکالا اور اسے خود ہی چاندی کی انگوٹھی میں جڑوایا۔ اتنی مہربان ہیں' وہ تم پر.....''

''تمہاری ممی کا بہت شکریہ کہ انہوں نے بطور خاص مجھ پر توجہ کی لیکن اس انگوٹھی کا فائدہ کیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں انگوٹھی پہننے کا عادی نہیں ہوں۔''

''جانتی ہوں پر ممی کا کہنا ہے کہ یہ انگوٹھی ساحل عمر کو نحوست سے بچائے گی۔ اس کا فن چمکے گا۔ وہ نام پیدا کرے گا۔ دولت اس کے قدموں میں نچھاور ہو گی۔''

''اچھا اتنی خوبیاں ہیں اس انگوٹھی میں تو لاؤ میں پہنے لیتا ہوں۔'' اس نے ورشا سے انگوٹھی لینا چاہی جو ابھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

''ایسے نہیں۔'' وہ ادائے بے نیازی سے مسکرائی۔

''پھر کیسے؟'' وہ حیران ہوا۔

''میں خود پہناؤں گی۔'' اس نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے لو پہناؤ۔'' ساحل عمر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

ورشا نے انگوٹھی پہنانے سے پہلے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور پھر مسکرا کر اس کی انگلی میں ڈال دی۔

انگوٹھی پہنتے ہی اس کے جسم میں سنسناہٹ سی ہوئی اور جب اس نے انگوٹھی کے کالے پتھر کو قریب کر کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کی سٹی گم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ساحل عمر کو چمکتے سیاہ پتھر میں ایک شبیہہ سی لہراتی نظر آئی تھی اور یہ صورت اس لال آنکھوں اور لمبی زبان والی خبیث عورت کی تھی جو اسے بچپن میں نظر آتی تھی۔ یہ شکل بس ایک لمحے کو نظر آئی تھی۔ اب نہ اس کے جسم میں سنسناہٹ تھی اور انگوٹھی میں وہ خبیث صورت۔

''کیسی ہے؟'' ورشا نے اسے پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھی۔ بہت پیاری۔'' ساحل عمر نے رسماً تعریف کی۔

''اے اب اتارنا مت ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ ممی نے کہا ہے کہ اس انگوٹھی کو ایک بار پہننے کے بعد اتارا نہیں کرتے۔ ایک تو پتھر کا اثر زائل ہو جائے گا۔ دوسرے فائدے کے بجائے نقصان شروع ہو جائے گا۔'' ورشا نے اسے خوفزدہ کیا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ نہیں اتاروں گا..... ایسی اچھی انگوٹھی کو اتارنے کی کیا ضرورت ہے۔'' ساحل عمر نے کہا۔ ''آؤ! اب چلیں۔''

ان دس دنوں میں بس یہی ایک ملاقات تھی۔ ورشا نے چاہا بھی تھا کہ وہ اگلی ملاقات کا وقت اور جگہ طے کر لے لیکن ساحل عمر نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ ایک پینٹنگ پر کام کر رہا ہے۔ اب اسے ختم کیے بنا نہیں ملے گا۔ ورشا کو یہ بات بری لگی تھی۔ وہ اس کی بجائے پینٹنگ کو اہمیت دے رہا تھا۔ لیکن ورشا نے اس بات کا اظہار نہ کیا۔ وہ جس مشن پر تھی وہاں صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔

جس رات جہکال کی تصویر مکمل ہوئی۔ اس کے دوسرے دن ورشا کا فون آیا۔

"ہاں، رانجھن!"

"جی ہیرے نی۔"

"واہ آ گئے لائن پر......" ورشا زور سے ہنسی۔

"کیا کروں تم رانجھن کہنا نہیں چھوڑتیں۔ اب میں تمہیں ہیر نہ کہوں تو کیا کہوں۔"

"مجھے رانجھن کہنا اچھا لگتا ہے لیکن تمہارے منہ سے ہیرے نی کہنا اچھا نہیں لگا۔ جب تم ورشا کہتے ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے چاروں طرف بارش ہونے لگی ہو۔ پیار کی بارش۔" ورشا بولی۔

"اچھا جی نہیں کہوں گا آپ کو ہیر میرا قصور معاف کر دیں۔" وہ درخواست گزار ہوا۔

"قصور اتنی آسانی سے معاف نہیں ہوسکتا۔" اس نے ادا دکھائی۔

"پھر کس طرح ہوگا۔" اس نے پوچھا۔

"آج ہم سے ملو۔" جواب ملا۔

"بولو کہاں۔ میں راضی ہوں۔" اس نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔

"تمہارے گھر آ جاؤں؟" ورشا نے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

"زہے نصیب......" وہ خوش ہوا۔

"پتہ سمجھاؤ۔" وہ بولی۔

ساحل عمر نے اسے اچھی طرح سے پتہ سمجھا دیا۔ وہ شام کو وقت مقررہ پر اس کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی۔ ساحل کو تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ ورشا کم از کم ایک گھنٹہ لیٹ پہنچے گی۔ ایک تو نئی جگہ پہنچنا تھا پھر ادائے بے نیازی بھی دکھانا تھی۔

ساحل عمر نے گیٹ کھولا تو ورشا اپنی گاڑی دیوار کے سائے میں پارک کر چکی تھی اور اب عین گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ سرخ ساڑھی اور کالا بلاؤز۔ گورا بدن ...... وہ قیامت تو تھی ہی لیکن آج یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ قیامت اس پر ٹوٹ پڑی ہو۔ اسے دیکھ کر ساحل کا سانس ایک لمحے کو رک گیا۔

وہ مسکرائی۔ سرخ دبیز ہونٹوں کے درمیان آب دار موتی چمکے۔ اس نے اپنی ساڑھی کے پلو کو مزید ٹھیک کیا۔ نتیجے میں وہ اس کے شانے سے ڈھلک گیا۔ اس کا مرمریں بازو عریاں ہوگیا۔ اس نے بغیر آستین کا اور گہرے گلے کا چھوٹا سا بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ پلو ٹھیک کرکے اس نے اپنی کالی چمکتی آنکھوں سے ساحل کو دیکھا اور اپنا حسین ہاتھ پیشانی تک لے جاکر آداب کیا۔ وہ اس کی اس ادا پر مرمٹا۔

"آیئے تشریف لایئے۔" ساحل عمر نے گیٹ کے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔

"میں لیٹ تو نہیں ہوئی ہوں نا۔" وہ اپنی نازک کمر لچکاتی گیٹ میں داخل ہوئی۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس دنیا کی پہلی لڑکی ہو جو اپنے دوست سے ملنے ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔" ساحل عمر نے ہنس کر کہا اور پلٹ کر گیٹ بند کر دیا۔

"شکر ہے تم نے دوست تو کہا۔" ورشا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور ساتھ ساتھ چلتی

ہوئی بولی۔ ''آج دوست ہوں تو کل وہ بن جاؤں گی۔''

''وہ !..... وہ کیا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ابھی کیا بتاؤں۔ جب بن جاؤں گی تو بتاؤں گی۔''

''کتنا وقت لگے گا'' وہ ''بننے میں۔'' ساحل عمر نے ہنس کر پوچھا۔

''کبھی تو ایک لمحہ لگتا ہے اور کبھی صدیاں لگ جاتی ہیں۔''

بات کچھ آگے بڑھتی لیکن گھر کے دروازے پر اماں کھڑی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر چپ ہوگئے۔ ورشا نے انہیں بہت احترام سے سلام کیا۔ ساحل عمر اپنی اماں کے بارے میں اسے تفصیل بتا چکا تھا۔

اماں نے بڑی تنقیدی نظر سے ورشا کو سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر ایک دم آگے بڑھیں۔ سلام کے جواب میں اسے دعائیں دیں اور ''ماشاء اللہ'' کہہ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اندر لیکر چلیں۔ اماں کا چہرہ اس وقت دیکھنے والا تھا۔ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ عمر کی دلہن لے کر گھر میں داخل ہو رہی ہوں۔

اماں کا یہ سلوک دیکھ کر ورشا کچھ سمٹی اور لجائی سی ان کے ساتھ چلنے لگی۔

ساحل عمر مسکرا کر کبھی اماں کو اور کبھی ورشا کو دیکھ رہا تھا۔

ساحل عمر کے گھر میں کوئی اجنبی مہمان آتا ہی نہ تھا۔ اگر کوئی تکلف والا بندہ آ بھی جاتا تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا۔ کوئی جاننے والا آتا تو ساحل اسے لاؤنج میں لے آتا۔ مسعود اور ناصر پر کوئی پابندی نہ تھی ان کے لئے گھر کا ہر گوشہ نشست گاہ تھا۔ جہاں چاہے بیٹھتے۔

اماں ورشا کو سیدھی لاؤنج میں لے آئی تھیں۔ ساحل عمر ابھی ورشا کو بیٹھنے کا اشارہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ اماں فوراً بول اٹھیں۔ ''ارے یہاں کہاں بیٹھو گی۔ ساحل کا کمرہ وہ سامنے ہے وہاں چلو۔''

اور پھر اماں ورشا کا ہاتھ تھامے بڑے اطمینان سے ساحل عمر کے بیڈ روم میں داخل ہوگئیں اور پھر جلدی سے باہر نکلتے ہوئے بولیں۔ ''تم یہاں بیٹھو میں کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

اماں کے جانے کے بعد بے اختیار دونوں کی نظریں ملیں اور وہ دونوں ہی کچھ سوچ کر بے اختیار مسکرا اٹھے۔

''یہیں بیٹھیں گی یا باہر چلیں گی؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟'' یکا یک ورشا کی آواز تبدیل ہوگئی۔

''کون۔'' ساحل عمر کو فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ وہ کیا پوچھ رہی ہے۔ وہ رشا ملوک کی تصویر پر نظریں گاڑے ہوئے تھی۔ اس کے ابرو کمان بن چکے تھے اور آنکھوں میں تیر اتر آئے تھے۔

''پینٹنگ ہے!'' ساحل عمر نے سادگی سے جواب دیا۔

''کس کی ہے؟'' ورشا کے لہجے میں پریشانی شامل تھی۔

''یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔'' ساحل عمر نے سادگی سے کہا۔

''خیالی ہے؟'' اس نے خیال ظاہر کیا۔

''ہاں۔ ایک طرح سے خیالی ہی سمجھو۔ کئی تصویروں کو دیکھ کر بنائی ہے۔'' ساحل عمر نے وضاحت کی۔

''اوہ!'' ورشا نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ اس کے چہرے پر جو چند لمحوں کے لئے شک کا سانپ لہرایا تھا۔ وہ اب غائب ہو چکا تھا۔ ورشا ہنس کر بولی۔ ''کہاں بیٹھوں؟''

''پورا کمرہ تمہارے لئے نگاہ منتظر بنا ہوا ہے۔ جہاں چاہے بیٹھو۔''

تب وہ دھم سے بیڈ پر بیٹھ گئی اور مسکرا کر بولی۔ ''میرے پاس آؤ۔''

ساحل عمر نے دیوار سے لگی ایک کرسی اٹھائی اور بیڈ کے نزدیک کر کے اس پر بیٹھ گیا۔

''کل یہ پینٹنگ مکمل کی ہے تم نے؟'' ورشا کی نظریں اس تصویر پر گڑی تھیں۔

''نہیں۔ یہ پینٹنگ تو میں نے کافی پہلے بنائی تھی۔ کل والی پینٹنگ میرے اسٹوڈیو میں ہے۔ ویسے اس پینٹنگ کی بڑی عجیب کہانی ہے۔ اس کی پیشانی پر ٹیکہ دیکھ رہی ہو۔ یہاں پہلے میں نے ایک بچھو بنایا تھا۔''

''بچھو!'' ورشا ذرا سنبھل کر بیٹھ گئی لیکن نظریں اس کی تصویر پر ہی تھیں۔

ساحل عمر کی اچانک ہی اس پر نظر پڑی۔ وہ بیڈ پر تھا اور بڑے مزے سے ورشا کے ہاتھ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ساحل عمر بیڈ پر چلتے بچھو کو دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ''ورشا بچھو۔''

بچھو کا نام سن کر ورشا بڑی پھرتی سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھا اور اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس بچھو کو کس چیز سے مارے۔ بیڈ روم میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے وہ اسے مار سکتا۔ شیلف میں کچھ کتابیں ضرور تھیں۔ پہلے اس نے سوچا ایک موٹی سی کتاب نکال کر اس پر دے مارے لیکن وہ جانتا تھا کہ گدے کی وجہ سے بچھو کو چوٹ نہ لگے گی۔ پھر یکایک وہ کچن کی طرف بھاگا۔ چمٹے سے نہ صرف وہ اس بچھو کو پکڑ کر دبا سکتا تھا بلکہ وہ اس پر ضرب بھی لگا سکتا تھا۔

اس بچھو نے اپنی دم کے ساتھ دونوں ہاتھ بھی اٹھائے جیسے سلام کر رہا ہو۔ پھر وہ اپنی جگہ گھوما۔

''تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ'' ورشا نے تنبیہی لہجے میں لیکن بہت آہستہ سے کہا۔

یہ حکم سنتے ہی وہ بچھو فوراً پلٹا اور بڑی تیزی سے بیڈ کے دوسری طرف چلا گیا۔ ساحل عمر کمرے میں داخل ہوا تو وہ بچھو بیڈ کے دوسری طرف جا رہا تھا اس نے اس کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی۔ وہ چمٹا لے کر بیڈ کے دوسری طرف بھاگا۔

''نہیں۔ ساحل اسے مارنا نہیں۔'' ورشا ایک دم چیخی۔

ساحل عمر کا اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ وہ بچھو قالین پر اس کی رینج میں تھا۔ وہ اگر زور سے اس پر چمٹا مار دیتا تو اس کی موت یقینی تھی۔

بچھو کے لئے اتنا وقت بہت تھا۔ وہ بڑی تیزی سے سائیڈ ٹیبل کے پیچھے غائب ہوگیا۔

''تم نے اس بچھو کو مارنے سے مجھے کیوں روک دیا۔'' ساحل عمر حیران تھا۔

''میں نہیں چاہتی کہ تمہارا نقصان ہو۔ اول تو وہ آئندہ تمہیں اس گھر میں نظر نہیں آئے گا اور اگر آ بھی جائے تو مارنا ہرگز نہیں ورنہ بہت تباہی پھیلے گی۔ اب اس سے زیادہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔'' ورشا نے خوفزدہ لہجے میں کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ روم سے باہر لائی۔

اتنے میں اماں ہانپتی کانپتی آئیں اور ساحل عمر کے ہاتھ سے چمٹا لے کر بولیں۔ ''کیا ہوا ساحل؟''

''کچھ نہیں اماں۔'' ساحل عمر انہیں کیا بتاتا۔

''پھر یہ چمٹا کچن سے کیوں لے کر بھاگے۔''

''اماں' یہ بیڈ روم میں روٹی پکانے کا مظاہرہ کرنا چاہ رہے تھے۔'' ورشا نے ہنس کر بات بتائی۔

''عجیب ہو تم بھی۔'' اماں واپس جاتے ہوئے بولیں۔ ''بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

پھر اماں جاتے جاتے پلٹیں اور گویا ہوئیں۔ ''چلو ڈائننگ ٹیبل پر چلو۔ میں چائے لاتی ہوں۔

وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھے۔ ڈائننگ ٹیبل چائے کے لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ ورشا ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''خاصا تکلف کرلیا۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب اماں کا کمال ہے۔'' ساحل عمر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں نے بھی کچھ نہیں کیا۔ یہ سب تمہارا جمال ہے۔'' اماں کی پیچھے سے آواز آئی۔ ان کے ہاتھ میں چائے کی کیتلی تھی۔

''واہ! اماں کیا بات کہی۔ قسم سے ایک چائے کا مزہ آ گیا۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

''آپ کچھ اس تصویر کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' ورشا نے فوراً موضوع بدلا۔

''اوہ ہاں۔'' ساحل عمر کو جیسے یاد آ گیا۔

پھر اس نے رشا ملوک کی پینٹنگ کی داستان الف سے لے کر ے تک سنا دی۔ البتہ اس نے رشا ملوک کے خواب میں آنے کا ذکر گول کر دیا۔ یہ ساری روداد سن کر ورشا کے چہرے پر کچھ فکر مندی کے آثار ظاہر ہوئے لیکن وہ ان آثار کو بڑی خوبصورتی سے دبا گئی۔

چائے پینے کے بعد ورشا منماف نے اس کا اسٹوڈیو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ''کیوں اپنا اسٹوڈیو نہیں دکھاؤ گے کیا؟'' اس نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''ضرور آؤ میرے ساتھ..... کل میں نے ایک نئی پینٹنگ مکمل کی ہے۔ وہ بھی دیکھ لینا۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلا۔ اماں نے آگے بڑھ کر اسٹوڈیو کا لاک کھول دیا۔ ورشا اور ساحل کمرے میں داخل ہوئے۔

یہ اچھا خاصا بڑا کمرہ تھا۔ چیتے کی تصویر مکمل کرنے کے بعد اس نے بورڈ دیوار کی جانب کھسکا دیا تھا۔ دیوار بالکل خالی تھی۔ یہ ایک لائف سائز پینٹنگ تھی۔ اس میں چیتا اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے چیتا اب قدم اٹھا کر آگے آجائے گا۔ ساحل عمر نے اس پینٹنگ پر بہت محنت کی تھی۔ اس محنت کا نتیجہ سامنے ظاہر تھا۔ ایک جیتا جاگتا چیتا۔

باذغر کی فرمائش پر یہ تصویر بنائی گئی تھی۔ وہ ساحل عمر کو ایک ٹیلی فون نمبر دے کر گیا تھا کہ وہ تصویر مکمل ہونے پر اسے اطلاع دے دے۔ وہ آکر لے جائے گا اور منہ مانگا معاوضہ ادا کر جائے گا۔ ساحل عمر نے اسے ابھی ٹیلی فون نہیں کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ ورشا کے جانے کے بعد اسے اطلاع دے دے گا کہ کل کسی وقت آکر وہ پینٹنگ اٹھالے جائے۔

ساحل عمر آگے تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر اپنی پینٹنگ کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ ہے وہ تصویر؟''

ورشا اس کے اسٹوڈیو پر ایک نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ساحل عمر کے اشارہ کرنے پر وہ جہکال کی تصویر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

ابھی ورشا نے ایک نظر دیکھا ہی تھا کہ ایک دم اس کے چہرے پر خوف چھا گیا۔ وہ خوفزدہ ہو کر چیختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ ساحل عمر کی سمجھ میں نہ آیا کہ ورشا کو اچانک کیا ہوا؟ وہ بھی اس کے پیچھے تیزی سے باہر نکل آیا۔ ورشا ٹی وی لاؤنج میں ایک صوفے پر بے دم سی پڑی تھی۔

''کیا ہوا ورشا؟'' ساحل عمر اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

اماں بھی پریشان ہو کر ان کے قریب آگئیں۔ ''ائے کیا ہوا بھیا؟''

''ساحل اس کمرے کا دروازہ فوراً لاک کر دیں۔'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اچھا۔'' ساحل عمر فوراً اٹھا۔

''میں کرتی ہوں۔'' اماں نے جلدی سے کہا۔ ''تم بیٹھو۔''

''آخر ہوا کیا؟''

''وہ چیتا۔ تصویر سے باہر نکل آیا تھا۔ وہ مجھ پر جھپٹنا چاہتا تھا۔'' اس نے حیرت میں ڈالنے والا بیان دیا۔

''یا اللہ خیر..... ایک اور نئی مصیبت۔'' ساحل عمر بڑبڑایا۔ ''ورشا تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ذرا آؤ میرے ساتھ۔''

''میں اب اس کمرے میں ہرگز نہیں جاؤں گی۔'' ورشا نے سختی سے منع کر دیا۔

''اچھا! میں خود جا کر دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ساحل عمر تیزی سے اٹھ گیا۔

''اماں دروازہ بند کرنے ہی والی تھیں کہ اس نے روک دیا۔ ''اماں ایک منٹ۔''

اس نے کمرے میں جا کر جہکال کی تصویر کو دیکھا۔ تصویر اپنی جگہ۔ جوں کی توں موجود تھی۔ اس نے پھر خود اپنے ہاتھ سے اسٹوڈیو کا دروازہ لاک کیا اور ورشا کے پاس آگیا۔

ورشا اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں ٹھیک کہہ رہی تھی نا۔''

''جی بالکل نہیں۔ تصویر تو جوں کی توں موجود ہے۔ یقین نہ آئے تو چل کر دوبارہ دیکھ لو۔''

''کسی قیمت پر نہیں۔ اب میں ہرگز اس تصویر کو نہیں دیکھوں گی۔'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

''اچھا چلو چھوڑو' مت دیکھو..... لیکن ڈرو مت..... وہ محض ایک تصویر ہے۔''

''کاش ایسا ہی ہوتا۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' ساحل عمر نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں نے جو دیکھا وہ کچھ اور ہی دیکھا۔ ممی کا خیال ٹھیک تھا۔''

''کیا کہا تھا ممی نے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ممی نے کہا تھا کہ ساحل کے گھر مت جاؤ اس کے گھر میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جنہیں دیکھ کر تم پریشان ہو جاؤ گی۔ وہی ہوا۔ ممی کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ اب میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔'' یہ کہہ کر وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔

''ارے ورشا کچھ دیر تو اور رکو۔'' اس نے التجا کی۔

''نہیں۔ ساحل اب جانا ہی ہوگا۔ میں تم سے جلد ملوں گی۔ او کے پھر.....''

ساحل عمر ورشا کے رویے کو سمجھ نہ سکا۔ جب وہ آئی تھی تو بہت خوش تھی۔ لگتا تھا کہ بہت دیر بیٹھ کر جائے گی لیکن اب وہ کچھ اس طرح اکھڑی تھی کہ چند منٹ بیٹھنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ تمہکال کی تصویر دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ پتہ نہیں اس نے تمہکال کی تصویر میں کیا دیکھ لیا تھا۔

ساحل عمر اب سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ وہ تصویریں بنانا چھوڑ دے۔ حد ہوگئی تھی۔ جو تصویر بنا رہا تھا وہ پراسرار ثابت ہو رہی تھی۔ لیکن یہ سلسلہ ابھی انہی دو تصویروں سے شروع ہوا تھا۔ اس سے پہلے تو کبھی کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔

ورشا تیز تیز قدموں سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گیٹ پر پہنچ کر ساحل عمر نے اس سے پوچھا۔ ''ورشا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ تم گاڑی ڈرائیو کر لوگی یا میں گھر تک چھوڑ آؤں۔''

''نہیں۔ تم پریشان نہ ہو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں معذرت چاہتی ہوں کہ میری وجہ سے ایک اچھی ملاقات بوریت میں تبدیل ہوگئی۔ مجھے معاف کر دینا۔'' ورشا نے عجیب سے انداز میں کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے تیزی سے نکل گئی۔

ساحل عمر گاڑی کی سرخ بتیاں دیکھتا رہ گیا۔

ورشا جب توقع کے خلاف جلد گھر پہنچ گئی تو برکھا نے گیٹ کھولتے ہی سوال کیا۔ ''کیا ہوا؟''

''ممی اندر تو آنے دو بتاتی ہوں۔'' ورشا نے نرم لہجے میں کہا۔

''اچھا آؤ!'' برکھا گیٹ کے سامنے سے ہٹ گئی۔

گاڑی کھڑی کرنے کے بعد جب ورشا برکھا کے بیڈ روم میں پہنچی تو وہاں عجیب سی بو آ رہی تھی۔

''ممی! تمہارے کمرے میں بو کیسی آ رہی ہے۔'' ورشا نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''ورشا اپنی بات کرو۔'' برکھا کے ایک دم تیور بدل گئے۔

"بس' ممی میں کیا بتاؤں۔ یوں سمجھو کہ مجھے کمرے سے نکلنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو میں تو گئی تھی۔" ورشا نے یہ کہہ کر ساحل عمر کے گھر میں اس پر کیا بیتی مختصراً احوال کہہ سنایا۔

"ہوں۔" برکھا نے ساری بات سن کر ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور پھر بولی۔ "ورشا تجھے وہاں پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ اگر تو اس منحوس کی تصویر مکمل ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جاتی تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میرا نام بھی برکھا ہے۔ میں کرتی ہوں اس کا انتظام۔"

"ممی! تم کیا کرو گی۔" ورشا فکر مند ہو کر بولی۔

"بتاتی ہوں کیا کروں گی۔ یہ بتا اس نے میری دی ہوئی انگوٹھی تو نہیں اتار دی۔" برکھا نے پوچھا۔

"نہیں وہ اس کے ہاتھ میں تھی۔" ورشا نے تصدیق کی۔

"اچھا۔" وہ کسی قدر خوش ہو کر بولی۔ "یہ بھی اچھا ہے۔ لا ذرا مجھے ٹیلی فون اٹھا دے۔"

ورشا نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹیلی فون برکھا کی طرف بڑھا دیا۔ برکھا اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ کر کسی کو ٹیلی فون ملانے لگی۔

"ہاں' واسم کیسے ہو؟" برکھا نے ادھر سے ٹیلی فون اٹھانے پر خوش اخلاقی سے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں' برکھا جی آپ حکم فرمائیں۔" اس نے فرماں برداری سے کہا۔

"واسم میں فون ورشا کو دیتی ہوں وہ تمہیں ایک پتہ سمجھائے گی' اس پتے کو اچھی طرح سمجھ لو' لکھ لو..... پھر میں بات کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر برکھا نے ریسیور ورشا کی طرف بڑھا دیا اور بولی۔ "واسم کو ساحل عمر کے گھر کا پتہ اچھی طرح سمجھا دو۔"

ورشا نے ریسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولی۔ "ممی' کیا کرنے لگی ہو؟"

"سوال نہیں؟" برکھا کی بھنویں ایک دم کمان بن گئیں۔

ورشا نے واسم کو اچھی طرح ساحل عمر کے گھر کا پتہ سمجھا دیا۔ پتہ سمجھنے کے بعد واسم نے کہا۔ "برکھا جی کو فون دیجئے۔"

"اچھا!" ورشا نے کہا۔ پھر برکھا کی طرف ریسیور بڑھاتے ہوئے بولی۔ "لو ممی..... بات کرو۔"

"ہاں۔ واسم پتہ سمجھ میں آ گیا؟" برکھا نے سوال کیا۔

"جی سمجھ گیا۔" اس نے کہا۔

"اب تم نے کیا کرنا ہے' اس بات کو غور سے سن لو۔ جیسا میں کہتی ہوں' اس پر حرف بہ حرف عمل کرو۔" یہ کہہ کر برکھا نے اسے پورا منصوبہ سمجھایا۔

واسم نے ساری بات اچھی طرح سمجھ کر کہا۔ "ہو جائے گا اور آج رات ہی ہو جائے گا۔"

"بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔" برکھا نے تنبیہہ کی۔

"فکر نہ کریں' آپ اتنا بتائیں کہ کیا اسے آپ کے بنگلے پر پہنچایا جائے یا....."

''نہیں' اپنی تحویل میں رکھنا۔'' برکھا نے اس کی بات کاٹی اور پھر حکم دیا۔ ''کام ہونے کے بعد اطلاع دو گے تو پھر بتاؤں گی کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے برکھا جی!'' واسم نے انتہائی فرماں برداری سے کہا۔

ٹیلی فون بند کر کے برکھا نے ورشا کو اشارہ کیا۔ ورشا نے فون اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور بولی۔ ''ممی میں کپڑے چینج کر لوں۔''

''ہاں' جاؤ' میری جان!'' برکھا نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آ گئی۔''

''کیا بات کرتی ہو ممی ...... تم کون سی بوڑھی ہو ...... اب بھی تمہاری جوانی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا اور کمر لچکاتی ہوئی برکھا کے کمرے سے نکل گئی۔

رات کا کھانا کھا کر ساحل عمر نے سوچا کہ کچھ دیر کے لئے باہر ٹہل آئے۔ پھر اسے ایک دم بازغر کا خیال آیا۔ اسے تصویر کے مکمل ہونے کی اطلاع دینا تھی۔ اس نے سوچا کہ پہلے اس سے ٹیلی فون پر بات کرے پھر ٹہلنے جائے۔

وہ اپنے آرٹ روم کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا' لائٹ جلا کر سب سے پہلے اس نے مہاکال کی تصویر پر نظر ڈالی۔ تصویر اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔

وہ سوچنے لگا کہ بازغر کا ٹیلی فون نمبر کہاں ہے اسے یاد آیا کہ ٹیلی فون نمبر اس نے پنسل سے کسی رسالے پر نوٹ کیا تھا اور یہ سوچ کر نوٹ کیا تھا کہ وہ بعد میں اسے اپنی ڈائری میں اتارے گا لیکن وہ ایسا کرنا بھول گیا اور اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ٹیلی فون نمبر اس نے کس رسالے پر لکھا تھا۔ کمرے میں بے شمار رسالے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ان بکھرے رسالوں کو ایک ایک کر کے دیکھنے لگا لیکن تلاش کے باوجود اسے ٹیلی فون نمبر نہیں ملا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ ٹیلی فون نمبر آخر کہاں گیا۔

وہ مایوس ہو کر کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ ایک دم اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے ایک رسالے پر پڑی۔ یہ وہ رسالہ تھا جس پر فون نمبر لکھا تھا۔ اس ٹیلی فون نمبر کے لئے اس نے زیادہ تر رسالوں کے سرورق دیکھ لئے تھے جبکہ وہ رسالہ اوپر ہی میز پر رکھا تھا۔ اس رسالے پر بھی اس نے نظر ماری تھی لیکن اس وقت یہ نمبر نظر نہیں آیا تھا۔ رسالہ اٹھا کر جب اس نے نمبر دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس ٹیلی فون نمبر کے درمیان سے دو ہندسے مٹے ہوئے تھے۔ اتنے دھندلے ہو گئے تھے کہ ان کا سمجھنا مشکل تھا۔ یہ نمبر کیونکہ پنسل سے لکھا ہوا تھا۔ اس لئے دو ہندسوں کا مٹ جانا بعید از قیاس نہیں تھا لیکن پریشان کن ضرور تھا۔

اس نے غور سے ان مٹے ہوئے ہندسوں کو دیکھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ربڑ مار دی ہے۔ بہر حال جو بھی تھا۔ اب بازغر کو ٹیلی فون کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ بازغر سے اب اسی صورت میں رابطہ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی تصویر کے بارے میں دریافت کرے۔

ٹیلی فون نمبر سے مایوس ہو کر وہ کمرے سے نکل آیا۔ اس نے اپنے اسٹوڈیو کو لاک کر دیا اور گھر سے باہر نکل کر لان پر ٹہلنے لگا۔

اپنی ان دو تصویروں کی وجہ سے وہ عجیب و غریب حالات کا شکار ہوگیا تھا۔ دلہن والی تصویر پر بنے بچھو نے ناقابل یقین واقعات سے دوچار کیا تھا اور اب اس چیتے کی پینٹنگ نے رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا۔ دلہن والی تصویر پر بازغر جھپٹا تھا' اس نے بچھو کو مارنا چاہا تھا اور اس چیتے والی تصویر کو دیکھ کر وہ رشا ڈر گئی تھی۔ بقول اس کے اسے دیکھ کر چیتا اس پر جھپٹا تھا۔ وہ تصویر سے باہر نکل آیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تصویریں اس نے بہت محنت سے بنائی تھیں۔ وہ جاندار دکھائی دیتی تھیں۔ اب اس نے یہ بھی نہیں چاہا کہ وہ تصویریں متحرک ہو جائیں۔ ان میں جان پڑ جائے ٹہلتے ٹہلتے اسے جب کافی دیر ہوگئی تو اماں نے باہر آ کر جھانکا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ جب ساحل عمران کے قریب پہنچا تو انہوں نے اس کے چہرے پر اچھی طرح پھونک ماری اور پھر بولیں۔ ''کیا آج رات بھر ٹہلنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں اماں' بس جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔''

اس نے سعادت مندی سے کہا۔

''چلو پھر تم اندر جاؤ' میں باہر کی لائٹیں وغیرہ بند کر کے آتی ہوں۔'' اماں بولیں۔

''اماں میں بند کر کے آجاؤں گا۔'' ساحل عمر نے خواہش ظاہر کی۔

''نہیں بھئی میں خود کروں گی' پتہ نہیں تم ٹھیک سے بند کرو گے کہ نہیں۔ دوسرے میں کاہل نہیں بننا چاہتی ذرا چلتے پھرتے رہنا چاہتی ہوں۔'' وہ ہنس کر بولیں۔

''اچھا اماں!'' ساحل عمر نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ اپنی جان بنائیں میں اندر چلتا ہوں۔''

ساحل عمر نے اپنے بیڈ روم میں آ کر لائٹ آن کی۔ لائٹ جلاتے ہی اس کی نظر رشا ملوک کی تصویر پر پڑی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز رینگ کر فریم کے پیچھے گئی ہے۔ وہ تیزی سے دوڑ کر تصویر کے نزدیک پہنچا۔ اس نے جھانک کر فریم کے پیچھے دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ ایک وہم سمجھ کر اس نے ذہن جھٹک دیا اور کیسٹوں کی قطار میں سے کوئی کیسٹ نکالنے کے لئے ان پر نظر ڈالنے لگا۔ ایک کیسٹ منتخب کر کے اس نے ڈیک میں لگا دیا۔ آواز دھیمی تھی پھر بھی احتیاطاً کمرے کا دروازہ بند کر دیا تاکہ اماں ڈسٹرب نہ ہوں۔ پھر اس نے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور اطمینان سے لیٹ کر گانے سننے لگا۔ گانے سنتے سنتے اسے نیند نے آلیا۔ کیسٹ ختم ہونے کے بعد ڈیک خود بخود آف ہوگیا۔

پھر وہی منظر' وہی فضا' نیلا آسمان' خوبصورت برف پوش پہاڑ' تیز رفتار چشمہ' چشمے میں پڑے بڑے بڑے پتھر اور ایک بڑے پتھر پر بیٹھی رشا ملوک ...... وہی سفید ریشمیں لبادہ ...... ذرا فاصلے پر بہتے پانی میں کھڑا چیتا۔

چیتے کو دیکھتے ہی ساحل عمر نے فوراً پہچان لیا کہ وہ تہکال ہے۔ اسے تہکال کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ اس سے بڑی حیرت کی بات یہ تھی کہ چیتے کے نزدیک کھڑے ہونے کے باوجود رشا ملوک بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اسے چیتے کا ذرا سا بھی ڈر نہ تھا۔

تب ساحل عمر نے اسے آواز دی۔ ''رشا ملوک!''

رشا ملوک نے جب مڑ کر ساحل کی طرف دیکھا تو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ اس

کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''ارے رشا ملوک کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہو کر بولا ''تم رو رہی ہو؟''

پھر وہ تیزی سے اس پتھر کی طرف بڑھا جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ جب وہ پانی سے گزر کر پتھر کے نزدیک پہنچا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بادل کا ٹکڑا کہیں سے نمودار ہوا۔ وہ گہرے بادل میں چھپ گئی اور وہ بادل اسے لے اڑا۔ اب وہاں خالی پتھر تھا اور وہ چپتا ایک بڑے پتھر پر اپنی دونوں ٹانگیں رکھے انگڑائی لے رہا تھا۔ اس نے بھی ساحل عمر کی طرف سے منہ موڑ لیا تھا۔

اچانک اسے کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کی فوراً آنکھ کھل گئی۔ تب پتہ چلا کہ دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ ساتھ ہی اس کا نام بھی پکار رہا ہے۔

وہ فوراً اٹھا۔ یہ تو اماں کی آواز تھی۔ اس نے کمرے کی لائٹ جلائی اور تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر اماں پریشان کھڑی تھیں۔

''خیریت ہے اماں ..... کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ساحل گیٹ پر کوئی ہے؟ کئی بار بیل ہو چکی ہے؟''

اماں نے بتایا۔

اسی وقت ایک مرتبہ پھر بیل کی آواز سنائی دی۔

ساحل عمر نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج رہے تھے۔ یہ رات کے دو بجے اس کے دروازے پر کون آ گیا۔

''لائیں اماں چابی دیں' میں دیکھتا ہوں۔''

''ساحل! گیٹ کھولنے سے پہلے اچھی طرح تصدیق کر لینا کون ہے؟'' اماں نے چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

گیٹ کے نزدیک پہنچ کر اس نے آواز لگائی۔ ''کون؟''

''صاحب جی دروازہ کھولیں میں برابر کے بنگلے کا چوکیدار ہوں۔'' ادھر سے آواز آئی۔

''کیا ہوا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''صاحب جی آپ دروازہ تو کھولیں بتاتا ہوں' جلدی کریں۔ ہمارے صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے۔''

دل کے دورے کا سن کر ساحل عمر نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔

گیٹ کھلتے ہی چار نقاب پوش تیزی سے اندر آئے۔ ایک نے کلاشنکوف کی نال اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا:

''چلو' اندر چلو!''

☆.....☆.....☆

ایک نقاب پوش نے پلٹ کر گیٹ بند کر دیا اور پھر وہ چاروں اسے کلاشنکوف کی زد پر لئے گھر کی طرف بڑھے۔ اماں گھر کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ انہوں نے صورت حال گھمبیر دیکھی تو وہ لپک کر آگے بڑھیں اور التجا آمیز لہجے میں بولیں۔ "اے بھیا! میرے ساحل عمر کو کچھ مت کہنا۔ اگر مارنے آئے ہو تو مجھے مار دینا اور ڈاکے کی غرض سے آئے ہو تو گھر کی جو چیز لے جانا چاہتے ہو وہ لے جاؤ۔ تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔"

"بڑھیا بڑی عقلمند معلوم ہوتی ہے۔" ان ہی میں سے ایک نقاب پوش ہنسا۔

"بڑی بی ہم تمہاری جان لے کر کیا کریں گے۔ تم ویسے ہی قبر میں پیر لئے لٹکائے بیٹھی ہو۔ چلو تم بھی اندر چلو۔" دوسرے نقاب پوش نے اماں کو بھی نشانے پر لے لیا۔

گھر کے اندر آ کر انہوں نے گھر کا دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا۔ لاؤنج میں آ کر انہوں نے ساحل عمر کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ساحل عمر خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ صورت حال اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان سے کس طرح گفتگو کا آغاز کرے۔

"ایم ون۔" ایک نقاب پوش اپنے کسی ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"سر!" وہ نقاب پوش جس کا نام ایم ون تھا جھک کر بولا۔

"گھر کا جائزہ لو۔ دیکھو ہمارا مال کہاں ہے؟"

"ٹھیک ہے سر۔" ایم ون یہ کہہ کر پہلے ڈرائنگ روم میں گیا اس کے بعد اس نے گھر کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا پھر واپس آیا۔

"ہاں کیا ہوا؟"

"گھر میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہیں۔ دوسرے ہمارا مال کھلے کمروں میں نہیں۔ ایک کمرہ لاک ہے۔ ممکن ہے وہ وہاں ہو۔"

"آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟" بالآخر ساحل عمر کو بولنا پڑا۔

"فی الحال بند کمرے کی چابی۔" ایک نقاب پوش بولا جو شاید ان کا چیف تھا۔

"آؤ میرے ساتھ میں کھولتی ہوں کمرہ۔" ساحل عمر کے کچھ جواب دینے سے پہلے ہی اماں بول پڑیں اور وہ ساحل عمر کے اسٹوڈیو کی طرف بڑھیں۔ انہوں نے چابی میز کی دراز سے نکال کر جلدی

سے کمرہ کھول دیا۔

"ایم ٹو اپنی کلاشنکوف کندھے پر ڈال کر کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر گیا اور چند سیکنڈ کے بعد ہی باہر آ گیا۔ پھر اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

"سر! وہ اندر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ ان دونوں کو بہت پیار سے ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں سے باندھ دو۔" چیف نے حکم دیا۔

"ہمیں باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" ساحل عمر نے کہا۔ "آپ لوگ جو چیز یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں وہ لے جائیں۔"

"مسٹر ساحل ہمیں آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے حق میں بہتر ہوگا کہ خاموشی اختیار کریں۔" چیف نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "چلو اپنا کام کرو۔"

دو نقاب پوشوں نے بیگ میں سے رسی نکال کر دونوں کو کرسیوں سے باندھ دیا۔ پھر وہ چیف اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں داخل ہوا۔ اس نے چیتے کی تصویر پر ایک نظر ڈالی اور ایم ون سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اسے احتیاط سے اتار لو۔"

ایم ون اور ایم ٹو نے مل کر وہ تصویر بورڈ پر سے اتار لی۔

"چلو اسے گاڑی میں رکھو۔" چیف نے حکم دیا۔

جب وہ دونوں چیتے کی تصویر اٹھائے کمرے سے باہر نکلے تو ساحل عمر یہ دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔ یہ کس قسم کے ڈاکو ہیں کہ بھرے ہوئے گھر میں سے محض ایک پینٹنگ اٹھا کر لئے جا رہے ہیں۔ اس تصویر میں ان کی کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ ابھی تو یہ ابتدا ہے ہو سکتا ہے یہ لوگ اس پینٹنگ کے بعد دوسری چیزوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہیں اور ابھی سے اپنی جان کا بھی خطرہ تھا۔ کیا پتہ جاتے جاتے وہ ان دونوں کو بھی اوپر پہنچاتے جائیں۔

"بھائی اس تصویر کا آپ کیا کریں گے؟" ساحل عمر سے بولے بنا رہا نہ گیا۔

"مسٹر ساحل سوال کوئی نہیں۔ ہمیں مجبور نہ کریں۔ خواہ مخواہ آپ کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا پڑے گا۔" چیف نے اسے تنبیہ کی۔

"ساحل خاموش رہو۔" اماں نے فکر مند لہجے میں کہا۔

کچھ دیر کے بعد جب چیف کو یقین ہو گیا کہ چیتے کی تصویر گاڑی میں بحفاظت رکھی جا چکی ہے تو اس نے ساحل عمر کو مخاطب کر کے کہا۔ "مسٹر ساحل! ہم جا رہے ہیں۔ ہم نے آپ کے گھر سے صرف ایک پینٹنگ اٹھائی ہے۔ ہم چاہتے تو یہاں سے بہت کچھ لے جا سکتے تھے۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم اب جا رہے ہیں۔ گھر کا دروازہ اور باہر کا گیٹ کھلا رہے گا۔ آپ لوگ صبح تک اس کمرے پر برا جمان رہیں۔ صبح کوئی نہ کوئی گھر کے اندر آ کر آپ کو کھول دے گا۔ کھل جانے پر زیادہ پھیلنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ ویسے بھی ایک تصویر کی چوری کی رپورٹ کوئی تھانیدار لکھنے پر راضی نہ ہوگا۔ بہتر

ہوگا کہ آپ اپنے گھر میں آرام سے رہیں۔"

ساحل عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کیا جواب دیتا۔

"نہیں بھیا تم جاؤ آرام سے۔ ہمیں پولیس میں رپورٹ لکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ساحل عمر چاہیں گے تو ایسی کئی تصویریں بنا کر بھیج دیں گے۔" اماں فوراً بولیں۔ وہ ڈاکوؤں کو مطمئن کر دینا چاہتی تھیں کہ ان کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کی جائے گی۔

"بڑھیا تم واقعی عقلمند ہو۔۔۔۔۔۔۔ ساحل کو قابو میں رکھنا۔ اگر انہوں نے ہڑبونگ مچانے کی کوشش کی تو یاد رکھو ہم دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔" یہ کہہ کر چیف کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر کے بعد ساحل عمر نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ ساحل عمر نے اماں کی طرف گردن گھما کر دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔ "اماں! تم بندھی ہوئی کیا عجیب سی لگ رہی ہو۔"

"ساحل تمہیں مذاق سوجھا ہے۔ ادھر میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔" اماں نے پریشان لہجے میں کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو اماں کہ وہ ہمارے منہ میں کپڑا ٹھونس کر نہیں گئے۔ ورنہ بات کرنے سے بھی ترس جاتے۔ پھر ایک مہربانی انہوں نے اور کی کہ باہر کا گیٹ کھلا چھوڑ گئے ہیں۔ ورنہ ان کے لئے گیٹ اندر سے بند کر کے دیوار پھلانگ جانا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اماں یہ کس قدر پیارے ڈاکو تھے۔ میرا خیال ہے کہ باذوق بھی تھے تبھی صرف ایک پینٹنگ لے کر چلے گئے۔ ہیں اماں؟" ساحل عمر نے اماں سے تصدیق چاہی۔

"ساحل آخر تم اس قدر کیوں بول رہے ہو۔" اماں اس صدمے سے ابھی سنبھل نہ پائی تھیں۔ وہ خاموش رہ کر اپنے حواس بحال کرنا چاہتی تھیں۔

"اماں ابھی تو صبح ہونے میں کئی گھنٹے باقی ہیں۔ اس طرح خاموشی میں کس طرح رات کٹے گی۔ اچھا اماں یوں کرو۔ کوئی اچھا سا لطیفہ سناؤ۔"

اماں نے جواب میں اسے گھور کر دیکھا۔

"کوئی بات نہیں اماں۔ تمہیں اگر کوئی لطیفہ یاد نہیں تو کیا ہوا۔ مجھے سینکڑوں لطیفے یاد ہیں۔ میں تمہیں سناتا ہوں۔" ساحل عمر نے اس کے گھورنے کی پروا نہ کی وہ اپنی دھن میں بولتا رہا۔ "ایک شیر لگ بھگ پورا ہرن کھانے کے بعد جنگل میں قیلولے کے لئے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ وہ جھاڑی میں پیچھے دو چوہوں کے سامنے سے گزرا تو ایک چوہا بولا۔ چلو یار اس کو مارتے ہیں۔ بہت اکڑتا ہے۔ دوسرا چوہا بولا۔ اوہ نہیں یار اسے کیا مارنا۔ اکیلا ہے اور ہم دو ہیں۔

لطیف سن کر اماں بے اختیار ہنس پڑیں اور پھر بولیں۔ "ساحل تم بہت شریر ہو۔"

صبح ہوئی تو سب سے پہلے مرجینا گھر میں داخل ہوئی۔ وہ صبح سات بجے ہی کام پر آجاتی تھی۔ گھنٹی بجانے پر گیٹ اماں کھولتی تھیں لیکن آج تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر آئی تو اس نے گھر کا دروازہ بھی کھلا پایا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی مگر اسے اماں کہیں نظر نہ آئیں۔ وہ یہ سوچتی کہ آج

گھر کے دروازے چوپٹ کیوں پڑے ہیں۔ گھر میں داخل ہوئی تو ڈائننگ ٹیبل کے نزدیک کرسیوں پر اماں اور ساحل عمر کو بندھا پایا۔

وہ دونوں کو ہونقوں کی طرح دیکھنے لگی۔ ''ہیں!''

''او اماں' مرجینا آ گئی۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔

''مرجینا جلدی کرو۔ ہمیں کھولو۔'' اماں جلدی سے بولیں۔

''ہائے یہ کیا ہوا؟'' مرجینا فوراً ساحل عمر کی طرف لپکی۔

''پہلے اماں کو کھولو۔'' ساحل عمر نے ملائم لہجے میں کہا۔

مرجینا نے جلدی جلدی اماں کو کھولا پھر وہ ساحل عمر کی طرف بڑھی۔ جب وہ اس کی رسیاں کھول رہی تھی تو ساحل عمر بولا۔ ''مرجینا! کیا تم جانتی ہو کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔''

''صاحب جی' مجھے نہیں معلوم آج کیا تاریخ ہے۔ دن معلوم ہے آج جمعرات ہے۔'' وہ اپنی دھن میں بولی۔

''تمہیں تاریخ نہیں معلوم تو کوئی بات نہیں' مجھے تاریخ کا پتہ ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میری بات غور سے سنو۔ ایک زمانے میں مرجینا نے چالیس چوروں سے علی بابا کی جان بچائی تھی۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ آج کی مرجینا نے پھر ایک مرتبہ علی بابا یعنی ساحل عمر کی جان بچائی۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکو کب کے گھر سے جا چکے ہیں۔'' ساحل عمر نے بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے جو بندھے بندھے اکڑ گئے تھے۔

''ڈاکو' صاحب جی کیا یہاں ڈاکو آئے تھے۔'' مرجینا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

''ہاں آئے تھے اور وہ تمہارا پوچھ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ مرجینا کہاں ہے۔ ہم نے اس سے اپنے آباؤ اجداد کا بدلہ لینا ہے۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

''صاحب جی' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''مرجینا! تم جھاڑو پکڑو اور شروع ہو جاؤ۔ تم ساحل کی باتوں میں کہاں آئی ہو۔''

''اماں جی ادھر چلیں ناں۔'' مرجینا انہیں کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بتائیں ناں کہ آپ لوگوں کو کس نے باندھا ہے۔''

''ہاں چلو۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' اماں اپنا جسم سہلاتی ہوئی اس کے ساتھ ہو لیں۔

اور وہ اسی کرسی پر بیٹھا انہیں جاتا ہوا دیکھ کر مسکراتا رہا۔

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دونوں دوستوں کو فون کیا۔ انہیں اس انوکھی ڈکیتی کی خبر سنائی۔ مسعود آفاقی نے کہا کہ اخبار میں خبر لگواؤ۔ ناصر مرزا نے کہا کہ پولیس میں رپورٹ درج کراؤ۔

ساحل عمران دونوں باتوں کے حق میں نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ سانپ نکل چکا ہے۔ اب اس کی لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ..... لیکن اس کی دوستوں کے آگے ایک نہ چلی۔ وہ دونوں اس کے گھر آ گئے۔

ناصر مرزا کے پولیس میں تعلقات تھے۔ اس نے کوشش کر کے تھانے میں رپورٹ درج کرا

دی۔ تھانے دار کو رپورٹ درج کرنا ہی پڑی کیونکہ اس تصویر کی قیمت ایک لاکھ روپے جو بتائی گئی۔
مسعود آفاقی نے اپنے ایک صحافی دوست کو فون کر دیا اور یوں یہ خبر اخبارات کی زینت بن گئی۔
ادھر یہ کارروائی ہوئی تو ادھر ڈاکوؤں کے چیف نے رات تین بجے ٹیلی فون پر واسم کو اطلاع دی۔ واسم تصویر کے قبضے میں آجانے پر بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً برکھا کا نمبر گھمایا۔
برکھا کچھ دیر پہلے ہی سوئی تھی۔ وہ ڈھائی بجے تک اپنے پسندیدہ کمرے میں بیٹھ کر ایک جاپ کرتی رہی تھی۔ جاپ سے فارغ ہو کر وہ نہائی اور پھر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ پھر وہ جلد ہی سوگئی۔
اسے امید نہیں تھی کہ واسم رات ہی کو اسے فون کرے گا۔ ٹیلی فون سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔ اس کی بیل ہو رہی تھی اور برکھا گہری نیند میں ہونے کی وجہ سے اسے سن نہیں رہی تھی۔
پانچویں بیل پر اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر اس پر جھنجھلاہٹ طاری ہوگئی۔ اس وقت کس منحوس کا ٹیلی فون آگیا۔ اس نے غصے سے ریسیور اٹھا کر جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''کون؟''
''برکھا جی۔ میں ہوں واسم۔'' واسم نے اس کی جھلاہٹ کو محسوس کرلیا تھا وہ فوراً بولا۔ ''اس وقت ٹیلی فون کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔''
''اچھا تم ہو۔'' برکھا واسم کی آواز پہچان کر نرم لہجے میں بولی۔ ''ہاں' بولو کیسے فون کیا؟''
''برکھا جی۔ آپ کا کام ہوگیا ہے۔'' اس نے خوشخبری سنائی۔
''سچ!'' برکھا خوشی سے اچھل پڑی۔
''ہاں' برکھا جی بالکل سچ۔''
''کہاں ہے وہ؟'' برکھا نے بے تابی سے پوچھا۔
طارق روڈ کے ایک مکان میں؟'' واسم نے بتایا۔
''اچھا ایسا کرو اسے کل دوپہر تک اپنے گھر منتقل کرلو۔ میں کل شام کو کسی وقت تمہارے گھر آجاؤں گی۔''
''برکھا جی پھر تو ہمارے نصیب جاگ جائیں گے۔'' وہ سرشار ہو کر بولا۔
''ہاں بالکل میں تمہارا نصیب جگانے آرہی ہوں کیا نام ہے تمہارے نصیب کا میں بھول گئی۔'' برکھا نے ہنس کر پوچھا۔
''ستارہ۔'' واسم نے بتایا۔
''بس سمجھو کہ ستارہ تمہاری ہوگئی۔ اس کی ساری اکڑ نکل جائے گی۔ وہ اب تمہارے قدموں میں لوٹے گی۔'' برکھا نے بڑے یقین سے کہا۔
''میں پھر شام کو آپ کا منتظر رہوں گا۔'' واسم سے خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔
ستارہ ایک اسکول ٹیچر تھی۔ وہ واسم کے گھر کے نزدیک ہی رہتی تھی۔ واسم اسے روز اسکول آتے جاتے دیکھتا تھا۔ وہ اس پر مرمٹا تھا لیکن ستارہ اس پر مرمٹنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی البتہ وہ اسے مٹانے کی ضرور خواہشمند تھی۔ واسم نے کئی مرتبہ برکھا سے اس کا ذکر کیا تھا لیکن برکھا ٹال گئی تھی۔ لیکن

اب کیونکہ واسم نے ایک بہت بڑا کام چٹکیوں میں کر دیا تھا تو اس کا بھی فرض تھا کہ وہ بھی اس کے لئے کچھ کرے۔

واسم صبح اٹھا تو بہت خوش تھا۔ رات سے ستارہ اس کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں تھا جب وہ بے اختیار اس کے قدموں میں آ کر گرے گی۔ برکھا کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

وہ گاڑی میں صبح دس بجے کے قریب ڈاکوؤں کے چیف رفیق کے گھر پہنچ گیا۔ جب وہ رفیق کے گھر کے سامنے پہنچا تو اس کے گھر کا نقشہ ہی کچھ اور پایا۔ اس کے گھر کے آگے بے شمار لوگ جمع تھے۔ ساتھ ہی پولیس کی ایک موبائل بھی موجود تھی اور ایک ایمبولینس ابھی ابھی دروازے پر آ کر رکی تھی۔

واسم نے اپنی گاڑی فوراً بیک کی۔ پھر وہ اپنی گاڑی رفیق کے گھر سے ذرا فاصلے پر کھڑی کر کے واپس آیا۔ گھر میں پولیس موجود تھی۔ وہ گھر کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ ابھی وہ وہاں کھڑے کسی آدمی سے معلومات حاصل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایم ون پر پڑی۔ وہ گھر کے دروازے سے ابھی باہر آیا تھا۔

واسم نے اس کے نزدیک پہنچ کر بڑی آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایم ون نے مڑ کر دیکھا اور پھر واسم کو اپنے سامنے پا کر وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔ واسم اسے اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ پھر اس نے گاڑی میں بیٹھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''سر جی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا ہوا؟'' ایم ون پریشان تھا۔

''رفیق تو خیریت سے ہے؟''

''رفیق مر گیا سر جی۔'' ایم ون کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

''کس نے مارا ہے اسے؟'' واسم ایک دم سانپ کی طرح پھنکارا۔

''سر جی معلوم نہیں۔ اس کی لاش کی حالت بہت خراب تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خونخوار جانور نے اسے بھنبھوڑا ہو۔'' اس نے ایک عجب انکشاف کیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم..... اور وہ تصویر..... ؟ وہ تصویر کہاں ہے؟''

''سر جی وہ چیتے والی تصویر ہم رفیق کے گھر میں رکھ کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ رفیق نے مجھے صبح ہی بلایا تھا تاکہ آپ کا فون آنے کی صورت میں تصویر جہاں پہنچانی ہو پہنچائی جا سکے۔ میں آٹھ بجے کے قریب یہاں پہنچا تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ رات وہ تصویر ہم نے رفیق کے ڈرائنگ روم میں لا کر رکھی تھی۔ ہمارے جانے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں ہی سو گیا۔ صبح چار بجے کے قریب رفیق کی بیوی کو رفیق کی چیخ سنائی دی۔ وہ بھاگ کر ڈرائنگ روم میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک چیتا رفیق کو بری طرح بھنبھوڑ رہا ہے۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر اپنے حواس گم کر بیٹھی۔ گھر کے ایک کمرے میں رفیق کا بھائی ساجد بھی سویا ہوا تھا۔ وہ رفیق کی چیخ اور بعد میں اپنی بھابھی کی گھٹی گھٹی سی آواز سن کر ڈرائنگ روم میں آیا تو اس نے اپنی بھابھی کو بے ہوش اور اپنے بھائی کی لاش کو ادھڑا ہوا پایا۔ اس وقت کمرے

میں کوئی اور نہ تھا۔ رفیق کی بیوی کو جب ہوش آیا تو اس نے چیتے والی بات بتائی لیکن اس بات پر کسی کو یقین نہ آیا۔ اتنے میں کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے پہنچتے ہی رفیق کی لاش کو اسپتال پہنچانے کا انتظام کیا اور وہ تصویر اپنی تحویل میں لے لی۔ ایمبولینس آ چکی ہے۔ اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے جائی جانے والی ہے۔" ایم ون نے پورا واقعہ تفصیل سے بتا دیا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" واسم کا چہرہ اتر گیا۔ "میں تو وہ تصویر لینے یہاں آیا تھا۔"

"اس تصویر پر تو پولیس نے قبضہ کرلیا ہے۔ اس کی دھڑا دھڑ تصویریں بن رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شام کے اخباروں میں یہ خبر چھپ جائے گی۔ اب ہمیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا جب تک یہ تصویر واپس آرٹسٹ کے گھر نہ پہنچ جائے۔ سر جی تصویر وہاں پہنچ جانے دیجئے وہاں سے دوبارہ نکالنا میری ذمہ داری۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔" ایم ون نے واسم کا حوصلہ بڑھایا۔

یہ بات واسم کی سمجھ میں آئی۔ وہ گہرا اور ٹھنڈا سانس لے کر بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی چند دن انتظار کرنا ہوگا۔"

چند دن تو بہت بڑی بات تھی۔ برکھا کے لئے چند گھنٹوں کا انتظار سوہان روح تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ جھکال کی پینٹنگ اس کے ہاتھ آتے آتے ہاتھ سے نکل گئی ہے تو وہ تلملا کر رہ گئی۔ اس کے سوا وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

واسم کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح ٹہل رہی تھی۔ ورشا اپنی ماں کی پریشانی کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ اسے کچھ دیر بے قراری سے ٹہلتا ہوا دیکھتی رہی۔ بالآخر اس سے بولے بنا رہا نہ گیا۔

"ممی آخر آپ بھوکی شیرنی کی طرح کب تک ٹہلیں گی۔"

"ورشا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ کیا ہوگیا ہے۔"

"میں آپ کی پریشانی کو سمجھتی ہوں ممی ..... چند دن کی بات اور ہے۔ وہ پینٹنگ پھر آپ کے سامنے ہوگی۔ اس قدر پریشان نہ ہوں۔" ورشا نے تسلی دی۔

"پریشان کیسے نہ ہوں ورشا ..... بنا بنایا کام بگڑ گیا۔"

"کیا کام بگڑ گیا ممی؟"

"تو نہیں جانتی کہ جھکال کا خاتمہ کس قدر ضروری ہے۔"

"ہاں ممی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جب یہ خبر اخبار میں آئے گی تو اس بات پر کوئی یقین نہ کرے گا کہ رفیق کو کسی تصویر کے چیتے نے بھنبوڑ ڈالا ہوگا لیکن ممی میں اس بات پر پورا یقین کرتی ہوں کیونکہ میں نے خود اسے تصویر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا ہے وہ مجھے دیکھتے ہی جھپٹا تھا۔ ممی وہ بے حد خطرناک چیز ہے۔ آپ اس پر کیسے قابو پائیں گی۔ میرا تو خیال ہے ممی کہ آپ اس کا خیال دل سے نکال دیں۔" ورشا نے اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"نہیں ورشا اب وہ میرے ہاتھوں سے نہیں بچ سکے گا۔ اس نے ہمارا ایک آدمی مار دیا ہے۔ اب میں اسے مار کر ہی دم لوں گی۔ ویسے بھی اب اسے مارے بغیر چارہ نہیں۔ ساحل عمر تک پہنچنے

کے لئے اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ جب تک وہ نہیں مرے گا۔ میں اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکوں گی۔ میں مانا کو کس طرح پاؤں گی۔ مانا کو حاصل کرنا میری زندگی کا مشن ہے۔" برکھا کے دل میں آگ بھڑک رہی تھی۔

"مانا کیا ہے؟" ورشا نے پوچھا۔

"مانا مستقبل زندگی کا پرمٹ ہے۔" برکھا نے اسے جدید لفظوں میں بتایا۔

"گویا آپ کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔" ورشا نے جیسے تصدیق چاہی۔

"نہ صرف زندگی ہاتھ میں ہوگی بلکہ بہت کچھ اپنے اختیار میں آجائے گا۔" برکھا خواب دیکھ رہی تھی۔

"اور یہ زندگی یہ اختیار۔ آپ کو ساحل عمر کی وجہ سے حاصل ہوگا۔" ورشا نے سوال کیا۔

"ہاں۔ ورشا..... ساحل عمر وہ سیڑھی ہے جس کے ذریعے میں مانا تک پہنچوں گی۔"

"مہکال کے بعد آپ ساحل عمر کی بھینٹ لیں گی۔"

"ہاں۔" برکھا نے کہا۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا اس نے ورشا سے پوچھا۔ "تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"مجھے! نہیں ممی مجھے کیا پریشانی ہوگی۔" ورشا نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

برکھا آخر ورشا کی ماں تھی اس نے اپنی بیٹی کے لہجے میں کوئی خاص بات محسوس کی۔ اپنا شک رفع کرنے کے لئے اس نے براہ راست سوال کیا۔ "ورشا کہیں تو سچ سچ تو اس سے محبت نہیں کرنے لگی۔"

"ارے نہیں ممی۔" ورشا نے فوراً تردید کی۔ تردید کرنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے جھوٹ بولا ہو۔ اپنے آپ سے۔ اپنی ممی سے۔

"ہاں ورشا اس بات کا خیال رکھنا کہ ساحل عمر میرا قیدی ہے۔ اس کی زندگی اس کی روح میری ہے۔" برکھا نے بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ کہا۔ "میرے لئے ہے۔"

"جی ممی۔" ورشا نے گردن جھکا کر کہا۔

☆.....☆.....☆

ساحل عمر گردن جھکائے کسی غیر مرئی نقطے پر نظر جمائے مہکال کی تصویر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اماں آتے جاتے کئی بار اسے سوچ میں غرق بیٹھا دیکھ چکی تھیں۔ وہ اس کے دکھ کو سمجھتی ہیں لیکن اس کے لئے کر کچھ نہیں سکتی ہیں۔ اگر انہیں تصویریں بنانا آتا تو وہ کب کی مہکال کی پینٹنگ بنانے بیٹھ گئی ہوتیں۔

اماں نے ساحل عمر کے لئے چائے بنائی اور بڑے پیار سے بولیں۔ "لو بیٹا' چائے پی لو۔"

اماں کے مخاطب کرنے پر اس نے انہیں خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ پھر چائے کا کپ لے کر بولا۔ "لاؤ' اماں!"

"بیٹا تم تصویر کی وجہ سے پریشان ہو۔"

"اماں میں نے اس پر بہت محنت کی تھی۔ دکھ یہ ہے کہ میری محنت ضائع ہوگئی۔" وہ دکھ سے بولا۔ "کچھ ضائع نہیں ہوا۔ اللہ تمہیں زندگی دے ایسی تم تین سو ساٹھ تصویریں بنا کر پھینک دو گے۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر کا اٹھنے کا موڈ نہ تھا۔ اس نے اماں کی طرف دیکھا۔ اماں یہ کہتے ہوئے فوراً اٹھ گئیں۔ "اچھا! میں دیکھتی ہوں۔"

ٹیلی فون بیڈ روم میں تھا اور ساحل عمر اس وقت لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ اماں نے ٹیلی فون ریسیو کر کے وہیں سے آواز لگائی۔ "مسعود صاحب کا فون ہے؟"

مسعود کا نام سن کر وہ چائے کا کپ اٹھائے اٹھائے اندر آ گیا۔ کپ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ریسور تھامتے ہوئے بولا۔ "جی جناب!"

"یار ایک زبردست خبر ہے تمہاری پینٹنگ کے بارے میں ....." مسعود چہکتے ہوئے بولا۔

"ہیں!" ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا۔ "مل گئی۔"

"نہ صرف پینٹنگ برآمد ہوگئی ہے بلکہ اس تصویر کے چرانے والے کو سزا بھی دے دی ہے۔"

"بھئی وہ اپنے دوست ہیں ناں نیوز ایڈیٹر اشفاق صاحب ..... ان کا فون آیا تھا۔ ان کے اخبار کو خبر موصول ہوئی ہے۔ میں تمہاری پینٹنگ کے بارے میں ان سے خبر لگوا چکا تھا انہوں نے خبر موصول ہوتے ہی مجھے فون کر دیا۔ تم تیار ہو جاؤ۔ تو تھانے چل کر پینٹنگ وصول کر لیتے ہیں۔ تمہاری پینٹنگ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔" مسعود آفاقی نے بتایا۔

"یار پوری بات تو بتاؤ۔"

"تفصیل میں تمہارے گھر پہنچ کر بتاتا ہوں۔" مسعود آفاقی نے کہا۔ "تم یوں کرو ذرا ناصر مرزا کو فون کر لو وہ آ جائے تو اچھا ہے۔ ویسے میں نے اخبار سے تھانے فون کروا دیا ہے۔ تھانیدار نے کہا ہے کہ آ کر تصویر لے جائیں۔ اتنی بڑی تصویر کا رکھنا ایک مشکل کام ہے۔ عدالت میں آ کر اس تصویر کو پیش کرنے کی ضرورت پڑی تو کر دیں گے۔"

ساحل عمر نے مسعود کا فون منقطع ہوتے ہی ناصر مرزا کو ملایا۔ اس نے کہا کہ میں گھر آنے کے بجائے تھانے پہنچتا ہوں اور ایس ایچ او کو اوپر سے فون بھی کروا دیتا ہوں۔

تصویر ملنے کی روداد بڑی حیرت میں ڈالنے والی تھی۔ پولیس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رفیق کی لاش کے ساتھ کیا ماجرا ہوا ہے۔ ایس ایچ او سے پوری روداد سننے کے بعد ساحل عمر کے اندر ایک سناٹا چھا گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ ساری کارروائی تہکال کی ہے۔ ورشا نے جب اس تصویر کو دیکھا تھا تو وہ یونہی خوفزدہ نہیں ہوگئی تھی۔ تہکال اسے دیکھ کر باقاعدہ چھپتا تھا اور وہ تصویر سے باہر نکل آیا تھا۔

بہرحال تصویر مل گئی اور صحیح سلامت تھی۔ تصویر اٹھانے والا بندہ چل بسا تھا۔ یہ تصویر اس نے

کیوں اٹھائی تھی۔ اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے۔ یہ راز مرنے والا اپنے ساتھ لے گیا۔

جب وہ لوگ جھکال کی پینٹنگ لے جانے لگے تو ناصر مرزا نے ایک تجویز پیش کی۔ "ساحل کیا یہ تصویر تم اپنے گھر لے جاؤ گے۔"

"تو اور کیا؟" اس نے غیر یقینی انداز میں ناصر مرزا کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم اس تصویر کو اپنے گھر مت لے جاؤ۔ کہیں یہ تصویر اٹھانے وہ لوگ پھر نہ آجائیں۔"

"ہاں۔ یار ناصر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" مسعود نے اس تجویز کی تائید کی۔ "ابھی یہ تصویر خطرے میں ہے۔"

"پھر کیا کرنا چاہئے؟" ساحل عمر نے سوال کیا۔

"اسے میں اپنے گھر لے جاتا ہوں۔" ناصر مرزا نے کہا۔ "اس تصویر کو دیکھ کر میرے دماغ میں لال بتی سی جلی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ بہرحال تصدیق بھی ہو جائے گی اور اس کی حفاظت بھی....."

"اور بھائی ساحل تجھ سے میں دست بستہ عرض کروں گا۔ اللہ کے واسطے اب یہ تصویر بنانا چھوڑ دو۔ ورنہ تم کسی دن خود چل بسو گے۔" مسعود آفاقی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔

"نہیں ساحل ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اس مرتبہ ہاتھی پر طبع آزمائی کرو۔" ناصر نے مذاق کیا۔

"مرزا صاحب اگر ہاتھی باہر نکل کر آ گیا تو اسے پالے گا کون؟" مسعود بولا۔

"کسی سرکس والے کو فروخت کر دیں گے۔" ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

"اچھا مرزا صاحب پہلے تو اس چیتے کو سنبھالیں۔ اس کے لئے کوئی چڑیا گھر دیکھیں۔" مسعود نے تصویر کی طرف دیکھ کر کہا۔

یہ ایک عجیب و غریب واقعہ تھا۔ شام کے اخبارات کئی دن تک چیختے رہے۔ شام کے اخباروں کے لئے یہ ایک بہترین موضوع تھا۔ طرح طرح کی کہانیاں چھاپی جاتی رہیں۔ قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔ ساحل عمر کے گھر فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ اس کی تصویریں چھپتی رہیں بیان اور انٹرویو لئے گئے۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے مزید سنسنی پھیلا دی۔ ڈاکٹروں کی رائے میں یہ کسی انسان کا کام نہ تھا اور یہ بات کوئی ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ یہ کام تصویر کے چیتے نے انجام دیا ہے۔

رفیق کو کس نے مارا یہ بات تو خیر معمہ رہی لیکن کوئی یہ بھی نہ جان سکا کہ اس پینٹنگ کو ساحل عمر کے گھر سے کن لوگوں نے اٹھایا اور اس تصویر کو چرانے کا مقصد کیا تھا۔

دو چار دن یہ معاملہ چلا پھر سب ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔ اخبار والے بھی اور پولیس والے بھی۔

وہ پینٹنگ اب ناصر مرزا کے گھر میں تھی اور وہاں گل کھلا رہی تھی۔

ناصر مرزا نے اس پینٹنگ کو اپنے کمرے میں پڑی بڑی میز پر رکھ لیا تھا۔ یہ پینٹنگ اسے پسند آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر باز غر اس تصویر کو لینے نہ آیا تو وہ اسے ساحل عمر سے مانگ لے گا اور اسے فریم کروا کر اپنے بیڈ روم میں لگوائے گا۔

یہ کمرہ اسٹڈی روم تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کمرے میں سو بھی جاتا تھا۔ اس رات بھی یہی ہوا کہ وہ پڑھتے پڑھتے وہیں قالین پر سو گیا۔ رات کو کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنا ہاتھ نرم بالوں پر رکھا محسوس کیا۔ یہ ایک ایسا احساس تھا جس نے ناصر مرزا کے حواس کو فوراً چوکنا کر دیا۔

وہ تیزی سے اٹھا۔ اس نے لائٹ آن کی اور پھر قالین پر اس جگہ نظر ڈالی جہاں وہ سو رہا تھا لیکن وہاں کوئی چیز نہ تھی۔ پھر اس نے تصویر کو دیکھا۔ تصویر میں چیتا اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا۔

ناصر مرزا کچھ سوچتا ہوا اس کمرے سے نکل آیا۔ اس نے دروازے کو باہر سے لاک کر دیا اور اپنے بیڈ روم میں آ کر سو گیا۔ اسٹڈی روم اور بیڈ روم کا باتھ روم ایک ہی تھا البتہ دروازے دو تھے جو دونوں کمروں میں کھلتے تھے۔

صبح کے نزدیک ناصر مرزا کی ایک مرتبہ پھر آنکھ کھلی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم گیا۔ باتھ روم میں اس نے کچھ گڑبڑ کی آواز سنی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی جانور کمرے میں ٹہل رہا ہو۔ یہ احساس جسم میں سنسنی پھیلانے والا تھا۔

ناصر مرزا نے چاہا کہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر کمرے میں جھانک لے لیکن اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے سوچا جو ہوگا صبح دیکھا جائے گا۔ اب کمرے میں جانا کسی خطرے کا موجب بھی ہو سکتا تھا۔

صبح اٹھ کر اس نے آہستہ سے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور اس میں تھوڑی درز پیدا کر کے اندر جھانک کر دیکھا۔ سامنے ہی میز تھی۔ تصویر کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ چیتا وہاں موجود تھا۔

تب ناصر مرزا نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا اور اسٹڈی روم میں داخل ہوا۔ اسٹڈی روم کی تمام چیزیں الٹی پلٹی پڑی تھیں۔ کوئی ڈیکوریشن پیس اپنی جگہ موجود نہ تھا۔ سب اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ لگتا تھا کمرے میں کسی نے خوب اتھل پتھل مچائی ہے۔

ساحل عمر کا خیال تھا کہ جمکال کی پینٹنگ کی اخبارات کے ذریعے اس قدر شہرت ہو گئی ہے کہ باز غر کو اس سے رابطہ کر لینا چاہئے۔ اسے باز غر کے ٹیلی فون کا شدت سے انتظار تھا لیکن وہ کچھ اس طرح گیا تھا کہ اس کا کوئی پتہ نشان نہیں مل رہا تھا۔

انتظار کے باوجود باز غر کا ٹیلی فون نہ آیا البتہ ناصر مرزا کا آ گیا۔

"اوہ بھائی! مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا۔" ساحل عمر کے ریسیور اٹھاتے ہی ناصر مرزا بولا۔

"کیا ہو گیا..... خیریت تو ہے؟" ساحل عمر فکرمند لہجے میں بولا۔

جواب میں ناصر مرزا نے ساری روداد سنائی۔ کہ وہ آج اسٹڈی روم میں سو گیا تھا تو اس نے اپنا ہاتھ کسی بالوں بھرے جسم پر رکھا ہوا محسوس کیا۔ پھر بند کمرے میں جو دھما چوکڑی مچی اس کا حال

سنایا۔

''پھر اب کیا کرنا چاہئے۔'' ساری کہانی سن کر ساحل عمر نے کہا۔

''میری خود کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ناصر مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس تصویر کا گھر میں رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے آج رات میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟''

''بھائی کیا کرنا چاہتے ہو۔ ذرا ہاتھ پاؤں بچا کے۔'' ساحل عمر نے تنبیہہ کی۔

''بے فکر رہو۔'' ناصر مرزا نے پریقین لہجے میں کہا۔ ''اچھا اب میں کل صبح تم سے بات کروں گا رات جو کچھ ہوگا اس کی رپورٹ صبح دوں گا او کے.....''

''او کے.....'' ساحل عمر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

رات کو ساحل عمر دیر تک جاگتا رہا۔ سوچتا رہا وہ ان دونوں تصویروں کو بنا کر خواہ مخواہ مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اب آئندہ اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ کوئی پینٹنگ نہیں بنائے گا۔ لیکن تصویریں بنانے کا کیا فائدہ جو جی کا جنجال بن جائیں۔

سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر جانے کیا ہوا کہ سوتے سوتے اس کی اچانک آنکھ کھل گئی۔ اس کے کانوں میں کوئی آواز آ رہی تھی۔ جب اس نے غور سے سنا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نزدیک ہی سسکیوں سے رو رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

یہ بڑا جان لیوا احساس تھا۔

اس کے کمرے میں آخر کون رو رہا ہے۔ یہ کس کی نسوانی آواز تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ٹیبل لیمپ جلایا۔ ٹیبل لیمپ کی روشنی محدود تھی اس میں کچھ نظر نہ آیا۔ تب اس نے کمرے میں لگی ٹیوب لائٹ روشن کردی۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ وہاں کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ سسکیوں سے رونے کی آواز بھی اب معدوم ہو چکی تھی۔

اب اسے شبہ ہوا کہ اس نے واقعی کسی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ اگر آواز سنی تھی تو کیا یہ خواب تھا۔ تب اسے خیال آیا کہ رونے کی آواز تو اس نے آنکھ کھلنے کے بعد سنی تھی۔ وہ پوری طرح حواسوں میں تھا۔ اگر یہ حقیقت تھی تو وہ رونے والی کہاں ہوا ہوگئی۔ کدھر غائب ہوگئی۔

اچانک اس کی نظر رشاملوک کی تصویر پر پڑی۔ وہ اس تصویر کے نزدیک چلا گیا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ تب اس پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ رشاملوک کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر پھیل گئے تھے۔ تصویر پر نمی موجود تھی۔

صبح اس کا ارادہ تھا کہ دیر تک سوئے گا کیونکہ وہ رات کو خاصا ڈسٹرب رہا تھا۔ اس کی نیند پوری نہ ہوئی تھی۔ اس وقت وہ گہری نیند میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اس لئے جواب نہ ملنے پر اماں کمرے میں آگئیں۔ ساحل عمر کو بے خبر سوتا دیکھ کر پہلے انہوں نے سوچا کہ ناصر مرزا کو بتا دیں کہ وہ کچھ دیر کے بعد رنگ کرے۔ پھر یہ سوچ کر کہ ناصر مرزا کو جانے کیا کام ہے کہ اس نے کہا کہ اگر سو بھی رہے ہوں تو اٹھا دیں وہ مجبور ہوگئیں اور انہوں نے دھیرے سے اس کی

آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

چند لمحوں بعد ساحل عمر اپنی آنکھوں پر اماں کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے جاگ گیا۔ اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے ہٹایا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے دیکھا۔

''خیرت اماں۔؟'' اس نے پوچھا۔

''ناصر مرزا کا فون ہے۔ کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں ورنہ میں تمہیں ہرگز نہ اٹھاتی۔''

ناصر مرزا کا نام سن کر اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا اور بولا۔ ''ناصر ایک منٹ۔'' اس کے بعد وہ اماں سے مخاطب ہوا۔ ''اماں آپ ادھر سے ریسیور رکھ دیں۔''

''اچھا بیٹا۔'' اماں یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

''جی جناب۔'' ادھر سے ریسیور رکھے جانے کی آواز سن کر ساحل عمر مخاطب ہوا۔ ''کیا خبر ہے۔؟''

''وہ چلا گیا۔'' ناصر مرزا نے خبر سنائی۔

''کون چلا گیا۔؟''

''مہاکال کی بات کر رہا ہوں۔؟'' ناصر مرزا نے بات صاف کی۔

''میں ابھی تک بات سمجھا نہیں۔'' اس کی سمجھ میں پھر بھی کچھ نہ آیا۔

''حیرت ہے اتنی صاف بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔'' ناصر مرزا نے کہا۔ ''ٹھہرو میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔ میں نے کل تم سے کہا تھا نا کہ آج رات میں ایک تجربہ کروں گا۔؟''

''ہاں کہا تو تھا۔ تم نے کیا کیا تھا۔''

''بھئی رات کے گیارہ بجے کے بعد میں نے وہ پینٹنگ باہر لے جا کر لان میں ایک درخت کے نیچے رکھ دی۔ آدھے گھنٹے تک میں نے اس تصویر کے سامنے بیٹھ کر کچھ عمل کیا اور پھر بارہ بج کر پانچ منٹ پر میں نے وہ پینٹنگ درخت کے نیچے ہی چھوڑی اور میں گھر کے اندر چلا آیا۔ اندر آ کر میں نے گھر کا ہر دروازہ اور کھڑکی بند کروا دی۔ صبح ہی صبح جب میں اس درخت کے نیچے پہنچا تو وہاں میدان صاف ہو چکا تھا جبکہ باہر کا مین گیٹ جوں کا توں بند تھا۔''

''یار یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' ساحل عمر نے کسی قدر پریشانی سے کہا۔

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' ناصر مرزا خود الجھا ہوا تھا۔

''تم نے کیا عمل کیا تھا۔؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''میں نے کچھ پڑھا تھا۔ میرے پڑھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس تصویر میں کوئی اسرار ہے تو ظاہر ہو جائے۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے دماغ میں جو لال بتی روشن ہوئی تھی۔ اس کے پیش نظر میں نے یہ عمل کیا تھا۔ بہرحال تصویر کا اسرار تو ظاہر ہو گیا۔ وہ جو بھی تھا فریم کی قید سے آزاد ہو گیا۔'' ناصر مرزا نے بتایا۔

''چلو یار۔ جان چھٹی لیکن اس خالی کینوس کو ضائع مت کرنا۔ اس پر اگر ضرورت پڑی تو دوبارہ تصویر بن جائے گی۔'' ساحل عمر نے کہا۔

''اس مرتبہ ایسا کرو کہ اپنی قدم آدم تصویر بنالو کیا عجب کہ تم ایک سے دو ہو جاؤ۔'' ناصر مرزا نے مذاق کیا۔

''یار آئیڈیا تو اچھا ہے۔'' ساحل عمر نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ اسی کینوس پر اپنی پینٹنگ تیار کرتا ہوں۔''

''بھائی صاحب ایسا غضب نہ کر بیٹھنا۔ اگر اس پینٹنگ کو کسی نے اغوا کرلیا تو میں اور مسوو مشکل میں پھنس جائیں گے'' ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

''رات کو ادھر بھی ایک عجیب واقعہ رونما ہوا ہے۔'' ساحل عمر نے موضوع بدلا۔

''وہ کیا۔؟'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

ساحل عمر نے رات کو آنکھ کھلتے کسی کے سسکیوں سے رونے اور رشا ملوک کی تصویر بھیگی ہونے کی روداد سنائی۔ یہ روداد سناتے سناتے اس کی نظر رشا ملوک کی تصویر پر پڑی۔ ''ایک منٹ ہولڈ کرنا۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور بیڈ پر چھوڑا اور رشا ملوک کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ جو آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر ایک لکیر کی صورت میں بہے تھے۔ وہ اب برف کی طرح منجمد نظر آرہے تھے۔

تب اس نے ریسیور اٹھا کر ناصر مرزا کو اطلاع دی۔ ''بھائی صاحب وہ آنسو کسی برف کی مانند جمے ہوئے نظر آرہے ہیں۔''

''ارے نہیں۔'' ناصر مرزا کو یقین نہ آیا۔

''آ کر دیکھ لیجئے۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں مجھے آنا پڑے گا۔ میں شام تک آؤں گا۔ میں اب تمہاری طرف سے فکر مند ہوگیا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ اس چیتے کا تصویر سے اس طرح غائب ہو جانا۔ تمہارے گھر میں پیش آنے والے انوکھے واقعات۔ یہ کوئی آسیبی چکر نہیں ہے۔ نہ ان واقعات میں جنات کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ میری رائے میں کوئی پراسرار قوت تمہارے پیچھے لگ گئی ہے۔'' ناصر مرزا نے رائے پیش کی۔

''بھائی ناصر میرے خیال میں ان واقعات کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ نظر آتا ہے۔'' ساحل عمر نے بڑی سادگی سے کہا۔

ساحل عمر کی بات سن کر ناصر مرزا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''ویسے ایک بات ہے۔ میں ان پراسرار واقعات سے بالکل متاثر نہیں ہون شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بچپن ہی سے اس طرح کے واقعات سے دوچار رہا ہوں۔'' ساحل عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''بات ڈرنے یا پریشان ہونے کی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کہیں تمہیں ان پراسرار واقعات سے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ میں اس مسئلے پر ذرا چھان پھٹک کرلینا چاہتا ہوں۔ آج شام کو میں آؤں گا تو میرے ساتھ ایک شخص اور ہوگا۔'' ناصر مرزا نے بتایا۔

"مسعود ہوگا" ساحل عمر نے اندازہ لگایا۔

"او! یار مسعود شخص نہیں ہے۔ وہ دوست ہے ہمارا۔ اگر اس نے سن لیا کہ اسے کوئی شخص کہا ہے تو پھر تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔" ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

"پھر کون ہوگا۔؟ کچھ بتائیں تو۔" ساحل عمر نے پوچھا۔

"ایک ڈاکٹر ہوگا۔ وہ تمہاری نبض دیکھے گا۔"

"مجھے بیمار سمجھ رہے ہیں۔؟"

"ہونہیں..... ہو جاؤ گے..... جنوں کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آپ شام کو آئیں میں انتظار کروں گا۔؟"

شام کو ناصر مرزا آیا تو اس کے ساتھ ایک اول جلول سا شخص تھا۔ دبلا پتلا۔ سیاہی مائل رنگت۔ سر پر چار بال جنہیں بڑی احتیاط کے ساتھ جمایا گیا تھا۔ شیروانی پہنے۔ منہ میں پان' ہونٹوں پر مسکراہٹ۔ آنکھوں میں چمک۔ عمر ساٹھ سال سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔

ساحل عمر نے اس شخص کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اسے دیکھ کر اس نے ناصر مرزا کو گھورا جیسے کہہ رہا ہو یار یہ کیا تماشا اٹھا لائے۔ ناصر مرزا کے چہرے پر سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے پروقار انداز میں ان کا تعارف کروایا۔ "یہ ہیں عابد منجم۔ بڑے زبردست آدمی ہیں۔"

عابد منجم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ساحل عمر پر نظر ڈالی اور پان چباتے ہوئے بولے۔

"اچھا تو یہ ہیں ساحل میاں۔"

"ساحل میاں!" ساحل عمر نے حیران ہو کر کہا۔ "جناب میرا نام ساحل میاں نہیں ہے۔ ساحل عمر ہے ساحل عمر۔"

"ہیں۔ اچھا اچھا۔ تو ساحل عمر صاحب ذرا ایک کام کیجئے۔ مجھے ایک کاغذ پر اپنی والدہ محترمہ کا نام اور اپنی تاریخ پیدائش لکھ دیجئے اگر ولادت کا وقت معلوم ہو تو وہ لکھ دیجئے۔"

ساحل عمر نے ناصر مرزا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کیا چکر ہے۔

"ساحل' جیسا عابد منجم صاحب نے کہا ہے۔ اس پر فوراً عمل کرو۔" ناصر مرزا نے زور دے کر کہا۔

"اچھا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ ڈرائنگ روم میں تو کاغذ قلم نہ تھا۔ وہ اندر گیا۔ ایک کاغذ پر اس نے مطلوبہ معلومات درج کیں اور ڈرائنگ روم میں واپس آ گیا۔ اور وہ کاغذ اس نے عابد منجم کی طرف بڑھا دیا۔

کاغذ لیتے ہوئے اچانک عابد منجم کی نظر انگوٹھی پر گئی۔ اس انگوٹھی کو دیکھ کر وہ ذرا چونکے اور بولے۔ "ساحل میاں۔

اوہ۔ میرا مطلب ہے ساحل صاحب ذرا آپ مجھے یہ انگوٹھی دکھانا پسند کریں گے۔"

ساحل عمر نے دوبارہ اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ "یہ لیجئے دیکھ لیجئے۔"

"زحمت نہ ہو تو ذرا مجھے اتار کر دے دیں۔" عابد منجم نے بڑے شائستہ لہجے میں کہا۔

تب اچانک ہی اسے ورثا کی بات یاد آئی۔ اس نے انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا تھا کہ اسے اتارنا مت ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا۔

"ساحل انگوٹھی اتار کر دے دو۔" ناصر مرزا نے ہدایت کی۔

"ارے۔ یہ کوئی خاص انگوٹھی معلوم ہوتی ہے۔ کیا کسی نے دی ہے۔؟" عابد منجم نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ ساحل عمر کوئی جواب دیتا۔ ناصر مرزا بول پڑا۔ "جی عابد صاحب یہ بڑی خاص انگوٹھی ہے۔ ان کی ایک دوست نے دی ہے۔"

"اچھا تبھی اس کو اتارنے سے ہچکچا رہے ہیں۔ خیر اس انگوٹھی کو میں ابھی دیکھتا ہوں پہلے ذرا یہ کاغذ دیکھ لوں۔" یہ کہہ کر عابد منجم نے اپنی شیروانی کی جیب سے بال پوائنٹ نکالا اور اسی کاغذ پر کچھ حساب کتاب کرنے لگے۔ جوں جوں وہ حساب کتاب کرتے جاتے تھے۔ ان کی پیشانی پر بل پڑتے جاتے تھے۔ ناصر مرزا ان کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

کاغذ پر حساب کتاب چھوڑ کر اچانک انہوں نے نظریں اٹھائیں اور ساحل عمر سے بولے۔ "یہ انگوٹھی آپ نے کب سے پہنی ہوئی ہے۔"

"میرا خیال پندرہ سولہ دن ہوئے ہوں گے۔"

"دن۔ تاریخ اور وقت بتایئے۔"

ساحل عمر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے فوراً ہی کچھ یاد نہ آیا۔

"ساحل صاحب اپنے ذہن پر زور ڈالئے۔ یہ بتانا بہت ضروری ہے۔" عابد منجم نے کہا۔

"ساحل تمہیں وقت کا تو کچھ اندازہ ہو گا۔"

"ہاں بس اٹھتے ہوئے اس نے یہ انگوٹھی دی تھی۔ میرا خیال ہے ساڑھے دس بجے کا وقت ہو گا۔"

"ساڑھے دس بجے رات۔" عابد منجم نے تصدیق چاہی۔

"جی۔" ساحل عمر نے کہا۔

"تاریخ کیا تھی۔؟" عابد منجم نے پوچھا۔ ساحل عمر سوچنے لگا۔

"میرے اندازے کے مطابق اسے تیرہ تاریخ ہونا چاہئے اور دن جمعرات۔" عابد منجم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"جی آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ وہ جمعرات کی رات تھی۔" ساحل عمر نے تصدیق کی۔

عابد منجم نے پھر بال پوائنٹ سنبھال لیا۔ اور کاغذ پر مختلف زائچے بناتے رہے۔ جب کاغذ بھر گیا تو اسے پلٹ لیا۔ سات منٹ تک وہ اس حساب کتاب میں مصروف رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی جیب سے سفید رومال نکال کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا جبکہ ڈرائنگ روم میں ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔ وہ اس اثناء میں پان چبانا بھی بھول گئے تھے۔ پھر انہوں نے بال پوائنٹ بند کر کے جیب میں لگایا۔ کاغذ بند کر کے مٹھی میں دبایا اور ایک نظر ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔

"جی عابد صاحب۔" ناصر مرزا نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"جہاں انہوں نے بیٹھ کر وہ دونوں تصویریں بنائی ہیں' وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" عابد منجم نے ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جی ضرور۔" ساحل عمر نے براہ راست جواب دیا اور فوراً کھڑا ہو گیا۔ "آیئے تشریف لایئے۔"

پھر وہ تینوں اسٹوڈیو میں داخل ہوئے پہلے ساحل عمر اس کے بعد ناصر مرزا اور سب سے آخر میں عابد منجم۔ ساحل عمر نے اندر پہنچ کر کہا۔ "یہ ہے میرا آرٹ روم۔ آپ اسے جائے واردات سمجھ لیں۔"

کمرے میں اس وقت کوئی پینٹنگ نہ تھی۔ رنگ برش' فریم' بورڈ اور انگریزی رسالے۔ بس اس طرح کی چیزیں تھیں۔ عابد منجم کمرے کے عین درمیان میں کھڑے ہو گئے اور پھر انہوں نے سیدھا ہاتھ بلند کر کے مٹھی بند کی اور شہادت کی انگلی کھول لی۔ اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے چاروں طرف گھوم گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ہاتھ نیچے کر لیا اور ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر بولے۔ "فی الحال یہ کمرہ صاف ہے۔"

"ذرا اس لڑکی کی تصویر اور دیکھ لیجئے جس کی پیشانی پر ساحل عمر نے بچھو بنا دیا تھا۔"

"ہاں۔ دکھایئے۔"

ساحل عمران دونوں کو اپنے بیڈ روم میں لے آیا۔ اس تصویر کو دیکھ کر عابد منجم کو سکتہ سا ہو گیا۔ پتہ نہیں وہ اس کے حسن سے متاثر ہوئے یا اس تصویر میں انہوں نے کوئی خاص بات دیکھ لی کہ پلک جھپکانا بھول گئے۔

پھر کچھ دیر کے بعد جیسے ہوش آیا تو ان کے منہ سے نکلا۔ "ماشاء اللہ۔"

"ناصر' میں نے جن آنسوؤں کا ذکر کیا تھا۔ وہ دیکھو۔" ساحل عمر نے ناصر مرزا کو مخاطب کیا۔

ناصر مرزا نے اس تصویر کے قریب آ کر ان دو سفید لکیروں کو دیکھا جو اس کی آنکھوں سے رخساروں تک بنی ہوئی تھیں۔ یہ ابھری ہوئی لکیریں تھیں۔ ناصر مرزا نے انہیں انگلی سے چھو کر دیکھا۔

"ہاں واقعی یار۔ یہ تو برف کے آنسو ہیں۔" ناصر مرزا نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ پھر وہ عابد منجم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "جی' عابد صاحب دیکھی آپ نے یہ تصویر۔"

"تصویر ایسی ہے تو تصویر والی کس قدر حسین ہو گی۔" عابد منجم نے بے خیالی میں کہا۔

"کیا مطلب۔ آپ کے خیال میں کیا اس تصویر والی کا کوئی وجود ہے۔؟"

"بالکل ہے۔" عابد منجم نے بڑے یقین سے کہا۔

"آپ یہ بات اس بنیاد پر کہہ رہے ہیں کہ یہ لڑکی ساحل عمر کو خواب میں نظر آئی ہے۔"

"نہیں۔ یہ بات میں اس تصویر کو دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔"

"ذرا کچھ کھل کر بتایئے۔"

"وقت آنے پر کچھ بتاؤں گا۔ فی الحال اس سے زیادہ نہیں۔" عابد منجم نے ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ دونوں حضرات کچھ دیر کے لئے مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ دیں۔"

"جی کیوں نہیں۔" ساحل عمر نے فوراً کہا اور ناصر مرزا کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ دونوں باہر آئے تو عابد منجم نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھ گئے۔

"ناصر، تم یہ کیا چیز اپنے ساتھ اٹھا لائے ہو۔" ساحل عمر نے تمسخر اڑایا۔

"شش۔" ناصر مرزا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "انہیں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیا چیز ہیں۔ تم فی الحال خاموشی سے دیکھتے جاؤ۔ کسی مسئلے پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"جی بہت بہتر۔" ساحل عمر نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔

دس منٹ کے بعد عابد منجم مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ اور لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ کر کہا۔ "ساحل صاحب ایک سادہ کاغذ دیجئے۔"

ساحل عمر نے اپنے اسٹوڈیو سے سادہ کاغذ لا کر ان کے حوالے کر دیا۔ عابد منجم نے اس کاغذ پر کچھ لکھا اور اسے تہہ کر کے ساحل عمر کے حوالے کر دیا۔ اور بولے۔ "اسے بغیر دیکھے اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیجئے۔"

ساحل عمر نے اس کاغذ کو بغیر دیکھے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بولا کچھ نہیں۔

"اب آپ یہ انگوٹھی اتار کر میرے حوالے کر دیجئے۔"

"مجھے اس انگوٹھی کو اتارنے سے منع کیا گیا ہے۔" بالآخر ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"وہ کیوں۔؟"

"اگر میں نے یہ انگوٹھی اتاری تو مجھے نقصان پہنچے گا۔"

"ساحل عمر صاحب آپ کو الٹی بات بتائی گئی ہے۔ اگر آپ نے اس انگوٹھی کو اتار کر نہ بھیجا تو آپ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔" عابد منجم نے بڑے یقین سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "یہ انگوٹھی کسی جونک کی طرح ہے۔ آپ کا خون چوس رہی ہے۔"

"یہ کیا بات کر رہے ہیں۔؟" ساحل عمر نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ جیسے انہوں نے کوئی فضول بات کہہ دی ہو۔

"واقعی۔" ناصر مرزا پر اس جملے کا بالکل مختلف اثر ہوا۔ وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور عابد منجم کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"آپ کو میری بات پر یقین نہیں آ رہا۔ ایسا کیجئے ایک شیشے کے گلاس میں پانی بھر کر لے آئیے میں آپ کو اس انگوٹھی کی اصل حقیقت ابھی دکھائے دیتا ہوں۔"

ناصر مرزا نے تنبیہی لہجے میں کہا۔
"ساحل پانی لاؤ۔" ناصر مرزا نے تنبیہی لہجے میں کہا۔
ساحل عمر نے شیشے کے ایک گلاس میں پانی لاکر عابد منجم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ گلاس لے کر عابد منجم نے شیشے کی میز پر رکھ دیا اور ساحل عمر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چند منٹ کے لئے انگوٹھی اتار کر مجھے دے دیں۔"

چند منٹ کا سن کر ساحل عمر نے وہ انگوٹھی اتار کر عابد منجم کے حوالے کر دی۔ عابد منجم نے اس انگوٹھی کو بغور دیکھا اور پھر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس انگوٹھی کا پتھر جو کالے رنگ کا تھا۔ اپنا رنگ بدلنے لگا۔ پہلے وہ سرخی مائل ہوا پھر وہ بالکل سرخ ہو گیا۔
ساحل عمر اور ناصر مرزا دونوں دم بخود ہو کر اس انگوٹھی کو دیکھ رہے تھے۔
اچانک عابد منجم نے وہ انگوٹھی پانی سے بھرے گلاس میں ڈال دی۔ پانی میں جاتے ہی اس انگوٹھی کے پتھر سے ایک سرخ رنگ کی دھاری سی پھوٹی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے گلاس کا پانی سرخ ہو گیا۔
"ساحل صاحب آپ نے دیکھا۔ یہ گلاس میں کیا ہے۔؟" عابد منجم نے سوال کیا۔
ساحل عمر نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس سے بولا نہ گیا۔ وہ دم بخود رہ گیا تھا۔
"یہ آپ کا خون ہے۔ یہ انگوٹھی آپ کا خون جونک بن کر چوس رہی تھی۔ ایک وقت ایسا آتا کہ آپ کے بدن میں ایک قطرہ خون بھی نہ رہتا۔ اس کے بعد یہ انگوٹھی آپ سے لے لی جاتی۔ اور آپ کی روح پر کسی اور کا قبضہ ہوتا۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کن خطرناک لوگوں میں پھنس گئے ہیں۔ آپ طاغوتی طاقتوں کے فریب میں آ گئے ہیں۔"
"طاغوتی طاقتیں۔؟" ساحل عمر نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "لیکن یہ انگوٹھی تو مجھے ورشا نے دی ہے۔ اور ورشا کو اس کی ماں نے دی تھی۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں۔"
"ساحل عمر صاحب! کیا آپ ورشا کی ماں سے ملے ہیں۔؟" عابد منجم نے پوچھا۔
"نہیں" ابھی تک تو نہیں۔" ساحل عمر نے بتایا۔
"مل لیجئے گا وہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد یہاں ہوگی۔ آپ نے اپنی جیب میں جو کاغذ رکھا ہے اسے نکال کر پڑھئے۔" عابد منجم نے مزید حیران کرنے والی بات کہی۔
ساحل عمر نے پینٹ کی جیب میں رکھا ہوا کاغذ نکالا اور اس کی تہہ کھول کر اس پر لکھی عبارت پر نظر ڈالی۔

"زور سے پڑھئے تاکہ ناصر مرزا بھی سن لیں۔" عابد منجم نے کہا۔
ساحل عمر نے پرچہ پڑھنے کے بجائے ناصر مرزا کی طرف بڑھا دیا۔ اس پر لکھا تھا۔
"ٹھیک سات بجے پرکھا یہاں آئے گی۔ اور میری شکل دیکھتے ہی الٹے قدموں واپس لوٹ جائے گی۔"

ساحل عمر نے گھڑی پر نظر ڈالی ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔
عابد منجم نے اپنی جیب سے پان کی ڈبیہ نکالی۔ اور اس ڈبیہ سے ایک پان بڑی نفاست سے نکالا اور منہ میں رکھ لیا۔ اور آنکھیں بند کر کے پان کھانے میں مصروف ہو گئے۔

وہ کچھ دیر پان چباتے رہے۔ پھر پان چباتے چباتے اچانک آنکھیں کھولیں۔ اور ساحل عمر سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''آپ کے گھر میں کوئی گلاب کا پودا ہے۔''

''جی ہاں۔ باہر لان میں کئی گلاب کے پودے ہیں۔'' ساحل نے جواب دیا۔

''کیوں خیریت۔؟'' ناصر مرزا نے عابد منجم سے پوچھا۔

''یہ ساحل عمر کا خون ہے' کسی اچھی جگہ ٹھکانے لگانا ہے۔'' عابد منجم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور فوراً ہی آنکھیں بند کرلیں۔ اور پان کھانے میں مشغول ہوگئے۔ بظاہر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے آنکھیں بند کر کے محض پان کا مزہ لے رہے ہوں لیکن ایسا نہیں تھا۔

وہ دل ہی دل میں باقاعدہ کچھ پڑھ رہے تھے اور پھر آنکھیں انہوں نے اس وقت کھولیں جب گھر کے دروازے پر بیل ہوئی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''وہ آ گئی جاؤ دروازہ کھولو۔''

ساحل عمر کا دل اچانک تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے جانے کیوں خوف سا محسوس ہوا وہ جس شخص کو یونہی الول جلول سا سمجھ رہا تھا۔ وہ تو بڑے پائے کا آدمی نکلا تھا۔ اس نے کس طرح اس انگوٹھی میں سے اس کا خون نکال دیا تھا۔ اگر وہ یہ انگوٹھی پہنے رہتا جسے وہ اپنا محافظ سمجھ رہا تھا تو اس پر جانے کیا قیامت گزر جاتی۔ پھر انہوں نے برکھا کی آمد کی اطلاع پہلے ہی تحریری طور پر اس کے حوالے کردی تھی اور اب برکھا آ پہنچی تھی۔ ٹھیک سات بجے۔ اب نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔

جب اس نے گیٹ کھولا تو اسے توقع تھی کہ کوئی اجنبی عورت دروازے پر کھڑی ہوگی۔ لیکن اس وقت دروازے پر کوئی اجنبی عورت نہ تھی۔ اس کے سامنے ورشا کھڑی تھی۔ ہنستی مسکراتی اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ۔

''حیران رہ گئے نا مجھے دیکھ کر۔'' ورشا نے ہنس کر کہا۔

''ارے نہیں آؤ اندر آؤ۔'' ساحل عمر اسے اپنے ساتھ اندر لے چلا۔

''میں نے سوچا۔ آج بغیر اطلاع دیئے۔ تم سے ملوں۔ تمہیں حیران کروں۔ ویسے ایسا کر کے میں نے رسک لیا ہے۔'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رسک کیوں؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ہوسکتا تھا کہ تم گھر پر نہ ملتے۔ پھر میرا کیا حال ہوتا۔'' ورشا نے جواب دیا۔

''ہاں یہ تو ہوسکتا تھا۔ لیکن سرپرائز کا بھی تو اپنا مزہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سرپرائز کبھی کبھی الٹا پڑ جاتا ہے۔'' ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔

''کیا کر رہے تھے۔؟ میں نے آ کر کہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا۔؟''

''ارے نہیں۔ میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج تم ضرور آؤ گی۔'' ساحل عمر نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔

''بس دیکھ لو۔ تم نے سوچا اور ہم چلے آئے۔'' اس نے ایک ادا سے کہا۔

جب وہ باتیں کرتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوئے اور لاؤنج میں پہنچے جہاں ناصر مرزا اور عابد منجم ان کے منتظر تھے تو ورشا ایک دم آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی۔

ایک نظر اس نے ناصر مرزا کو دیکھا پھر عابد منجم پر نظر ڈالی تو اس کے جسم میں ایک جھٹکا سا لگا۔ پھر اس کی نظریں اس گلاس پر جم گئیں جس میں برکھا کی دی ہوئی انگوٹھی پڑی تھی اور گلاس خوں رنگ ہو رہا تھا۔ اس خوں رنگ گلاس کو دیکھ کر اس پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔

وہ تیزی سے گلاس کی طرف جھپٹی اور گلاس اٹھا کر غٹ غٹ کر کے سارا خون پی گئی۔ خون کے ساتھ انگوٹھی بھی اس کے منہ میں چلی گئی تھی۔ اس نے انگوٹھی جس کا پتھر غائب ہو چکا تھا۔ منہ سے نکال کر اپنی ہتھیلی میں پھینکی اور بڑی غضب ناک نگاہوں سے عابد منجم کو دیکھا اور تیزی سے لاؤنج سے نکل گئی۔ ساحل عمر اس کے پیچھے لپکا۔

"ورشا اے ورشا..... سنو تو۔" وہ پکارتا رہا۔

ورشا نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ بہت تیزی سے دوڑتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی۔ اور جب ساحل عمر گیٹ پر پہنچا تو وہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔ وہ اس کی گاڑی کی طرف لپکا۔ لیکن گاڑی تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنی گاڑی آگے بڑھا چکی تھی۔

ساحل عمر جب گھر میں واپس آیا تو عابد منجم سر تھامے بیٹھے تھے۔ ساحل عمر نے اشارے سے ناصر مرزا سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ لیکن ناصر مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک ٹک عابد منجم کو دیکھا کیا۔

"عابد صاحب آپ نے فرمایا تھا کہ برکھا آئے گی لیکن یہ تو برکھا نہ تھی ورشا تھی اس کی بیٹی۔" ساحل عمر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تب عابد منجم نے سر سے ہاتھ ہٹائے اور اپنا سر اٹھا کر ساحل عمر کو دیکھا اور بولے۔ "یہ ورشا نہیں تھی برکھا تھی۔ میں نے جو کہا تھا وہ ٹھیک کہا تھا۔"

"لیکن....." ساحل عمر اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

"ساحل عمر تم اس بات کو نہیں سمجھ پاؤ گے۔ میں ناصر مرزا کو سمجھا دوں گا۔" عابد منجم اس کی بات کاٹ کر بولے۔ "فی الحال میں ایک اور الجھن میں ہوں۔ مجھ سے ذرا سی چوک ہو گئی۔ میں اس خون کو اس کے آنے سے پہلے پودے میں ڈلوا دیتا تو اچھا ہوتا۔ وہ تمہارا خون پی گئی۔ اگر وہ ورشا ہوتی تو ہرگز ایسا نہ کرتی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں نے اسے دیکھ لیا۔ یہ ایک اچھی بات ہو گئی۔"

"ساحل تم ذرا دیکھو جائے کس مرحلے میں ہے۔" ناصر مرزا نے اسے آنکھ سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"اچھا دیکھتا ہوں۔" ساحل عمر اس کا اشارہ سمجھ کر فوراً اٹھ گیا۔

"ہاں۔ عابد صاحب کون تھی یہ؟"

"یہ برکھا تھی۔ ورشا کے جسم میں۔" عابد منجم نے بتایا۔

"اوہ۔ اس قدر خطرناک عورت ہے۔" ناصر مرزا نے ان کی بات سمجھ کر تشویش کا اظہار کیا۔ "مجھے تو اپنے دوست کی فکر پڑ گئی۔"

"تشویش کی بات یقیناً ہے۔ ساحل عمر کی حفاظت کے لئے کچھ انتظام کرنا ہوگا۔"

"آپ کریں۔ اس کام میں ذرا بھی دیر نہ کریں۔ مجھے ساحل بہت عزیز ہے۔" ناصر مرزا

بولا۔

''ہاں بہت پیارا لڑکا ہے۔ میں اس کے لئے کچھ کرتا ہوں۔ فی الحال اس کو یہ ہدایت کر دو کہ ورشا سے نہ ملے۔''

''ٹھیک ہے کہہ دوں گا۔'' ناصر مرزا نے کہا۔

''چائے تیار ہے۔'' ساحل عمر نے اندر آ کر کہا۔

''آیئے عابد صاحب۔'' ناصر مرزا' عابد منجم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چل کر چائے پیتے ہیں۔''

پھر وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے اور کھانے پینے میں مشغول ہو گئے۔

دوسرے دن ناصر مرزا اپنی فیکٹری کے دفتر میں بیٹھا۔ مسعود آفاقی سے بات کر رہا تھا۔ اسے کل کی روداد سنا رہا تھا کہ اس کا چپڑاسی رمضان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ناصر مرزا کو فون پر بات کرتے دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

''ایک منٹ ہولڈ کرنا۔'' ناصر مرزا ریسیور پر کہہ کر رمضان سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں کیا ہے' کیا ہے۔؟''

''سر کوئی خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔'' رمضان نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا۔

''اچھا۔ انہیں بٹھاؤ۔ میں بات کرلوں۔ پھر بلاتا ہوں۔'' ناصر مرزا نے جواب دیا۔

''کون ہے بھئی۔'' مسعود آفاقی نے پوچھا۔

''ملازمت کے سلسلے میں خواتین آتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی کوئی ضرورت مند خاتون ہوں گی۔ اچھا تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ.....'' ناصر مرزا بات کرتا کرتا رک گیا۔ ایک برقع پوش خاتون اس کے کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ اور رمضان اس عورت کو اندر آنے سے روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

''اچھا مسعود میں تمہیں ابھی فون کرتا ہوں۔ یہ خاتون بلا اجازت اندر آ گئی ہیں۔ ذرا ان سے نمٹ لوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''سر میں نے انہیں بہت منع کیا کہ سر بزی ہیں لیکن یہ مانی نہیں' زبردستی اندر آ گئیں۔'' رمضان پریشان تھا۔

''آپ کون ہیں خاتون..... آپ کو باہر بیٹھ کر بلائے جانے کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔'' ناصر مرزا نے ناگواری سے کہا۔

''میں انتظار نہیں کر سکتی۔'' یہ کہہ کر اس خاتون نے نقاب الٹ دیا۔

وہ ایک چالیس پینتالیس سال کی پرکشش عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی کہ ناصر مرزا اس سے آنکھ نہ ملا پایا۔

''جی فرمایئے۔'' ناصر مرزا نے پوچھا۔

''اس سینک سلائی سے کہہ دینا کہ ہوش میں رہے۔''

''جی میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔؟'' ناصر مرزا نے وضاحت چاہی۔

''وہ پہلے ہی اتنا دبلا پتلا ہے۔ اگر میں نے زور سے پھونک ماردی تو اس کا پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کدھر گیا۔'' اس نے پھر دھمکی دی۔

''آپ کس کی بات کر رہی ہیں اور آپ کون ہیں۔؟'' ناصر مرزا نے ذرا سخت انداز میں پوچھا۔

''میں عابد منجم کی بات کر رہی ہوں اور میں برکھا ہوں۔'' برکھا نے بڑے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ! اچھا اب میں سمجھا۔ آپ ہیں برکھا..... کل تو آپ کسی اور ہی روپ میں تھیں۔'' ناصر مرزا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں اسے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آئے۔

''اور شکاری تم بھی کان کھول کر سن لو۔ ساحل عمر کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔'' یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔

''ایک بات میری بھی سنتی جاؤ۔'' ناصر مرزا کو بھی غصہ آ گیا۔

''میں سننے کی نہیں سنانے کی عادی ہوں۔ میرا پیغام اس سینک سلائی کو دے دینا۔ وہ مجھے کوئی معمولی چیز نہ سمجھے پہلے ہی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ بس اسے ایک معمولی سے دھکے کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر برکھا رکی نہیں۔ اس نے ناصر مرزا کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

ناصر مرزا اس کی اس جرات پر ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس کے جانے کے بعد اچانک دروازے پر ناصر مرزا کی نظر پڑی۔ وہاں ایک چیز پڑی تھی جو اس کے برقعے میں سے گری تھی۔

☆.....☆.....☆

اس کے برقعے سے جو چیز گری تھی وہ ایک ماچس کی ڈبیہ تھی۔
رمضان ابھی کمرے میں موجود تھا۔ ناصر مرزا نے اس سے کہا۔ ''دیکھو کیا ہے اس میں۔''
رمضان نے ماچس کی ڈبیہ اٹھائی اور اسے کھولنے کے بجائے کان کے نزدیک لے جاکر بجائی۔ پھر بولا۔ ''سر دو چار تیلیاں معلوم ہوتی ہیں۔''
''کھول کر دیکھو۔''
رمضان نے ڈبیہ کھولی اس کا اندازہ صحیح تھا۔ اس میں صرف دو تیلیاں تھیں۔
''سر اس میں صرف دو تیلیاں ہیں۔'' رمضان نے کھلی ہوئی ماچس ناصر مرزا کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
ناصر مرزا نے اس ماچس کو ہاتھ نہ لگایا۔ دور ہی سے نظر ڈالی اور پھر بولا۔ ''اسے بند کر کے اپنے پاس رکھ لو اور میرے لئے چائے بناؤ۔''
''جی سر!'' رمضان نے کہا اور ماچس کی ڈبیہ اپنی جیب میں رکھ کر باہر نکل گیا۔
ناصر مرزا کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ماچس اس کے برقعے میں سے کس طرح گری۔ آیا اس نے جان بوجھ کر گرائی یا اتفاقی طور پر برقعے کی جیب سے نکل گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ برکھا سگریٹ نوشی کرتی ہے۔ ورنہ ماچس اپنے پاس رکھنے کا کیا مطلب ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس ماچس میں کوئی بھید ہو کوئی اسرار ہو۔ یہ سوچ کر اس نے فوراً عابد منجم کا نمبر گھمایا۔
''سائیں وہ آپ کی دوست آئی تھی۔'' نمبر ملتے ہی ناصر مرزا نے گفتگو شروع کی۔
''میری دوست۔'' عابد منجم نے آواز پہچان کر کہا۔ ''پر میری دوست تم تک کیسے پہنچی؟''
''سائیں بڑی دھمکیاں دے کر گئی ہے۔'' ناصر مرزا نے بتایا۔
''بھائی کس کی بات کر رہے ہو؟'' عابد منجم نے پوچھا۔
''عابد صاحب برکھا کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ابھی ابھی یہاں سے گئی ہے۔''
''کیا کہہ رہی تھی۔'' انہوں نے پوچھا۔
''جان سے مارنے کی دھمکی دے گئی ہے۔ اس کے خیال میں ساحل عمر کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔''
''اچھا' کس روپ میں تھی؟''

"اپنے ہی روپ میں تھی۔ عابد صاحب وہ چالیس پینتالیس کی ایک پرکشش عورت ہے۔"

"اچھا! پھر تو اس سے جلد ملاقات کرنا پڑے گی۔" وہ ہنسے۔

"چاتے جاتے وہ ایک کام کر گئی ہے۔ پتہ نہیں یہ کام اس نے نادانستگی میں کیا یا دانستہ۔"

"وہ کیا؟"

"اس کے جانے کے بعد ایک ماچس دروازے پر دکھائی دی جو یقیناً اس کے برقعے سے گری۔"

"اچھا برقعے میں تھی وہ؟" عابد منجم نے حیرت ظاہر کی۔

"نہ صرف برقعے میں تھی بلکہ بڑی دلیری سے میرے کمرے میں گھس آئی۔"

"ماچس میں کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"صرف دو تیلیاں۔" ناصر مرزا نے بتایا۔

"اس ماچس کو اپنے پاس احتیاط سے رکھو۔ جلانے کی کوشش نہ کرنا اور پہلی فرصت میں اسے میرے پاس بھیجو۔"

عابد منجم نے ہدایت کی۔

"کسے برکھا کو؟" ناصر مرزا نے ہنس کر کہا۔

"اے بھائی! ماچس کو....." وہ بولے۔

"وہ میں خود ہی لے کر حاضر ہوں گا۔ دفتر سے اٹھوں گا تو سیدھا آپ کے پاس آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں نے ساحل کے لئے ایک تعویذ تیار کیا ہے۔ وہ بھی دے دوں گا۔ باقی باتیں ملاقات پر۔ تم برکھا کی دھمکی کا اثر نہ لینا۔ میں اسے دیکھ لوں گا۔"

انہوں نے تسلی دی۔

"نہیں ایسا ڈرنے والا نہیں ہوں میں۔ مجھے شکاری کہہ کر گئی ہے پھر وہ یہ بات اچھی طرح جانتی ہوگی کہ میرا نشانہ کیسا ہے۔ اچھا او کے۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

ابھی ریسیور رکھ کر ناصر مرزا نے ایک گہرا سانس ہی لیا تھا کہ اس کا منیجر زاہد ملک بوکھلایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سر وہ رمضان اندھا ہو گیا۔"

"رمضان اندھا ہو گیا۔" ناصر مرزا فوراً کھڑا ہو گیا۔

"کہاں ہے وہ؟"

ناصر مرزا اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ رمضان سامنے ہی ایک کرسی پر اپنی آنکھیں پکڑے بیٹھا تھا اور دفتر کے دو چار لوگ اس کے گرد کھڑے تھے۔

ہوا یہ کہ جب رمضان چائے بنانے کے لئے کچن میں پہنچا تو اسے چولہا جلانے کے لئے ماچس کی ڈبیہ کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے ماچس کی تلاش سے بچنے کے لئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اس ماچس کی ڈبیہ میں دو تیلیاں موجود تھیں۔ اس نے ایک تیلی نکال کر ماچس پر رگڑی۔

تیلی سے جیسے ہی شعلہ نکلا اسے دیکھتے ہی رمضان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ایک دم اس کی

آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ بچن میں گھبرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔

ایک بندے نے اسے بچن سے اٹھا کر باہر کرسی پر بٹھایا۔ رمضان نے بتایا کہ اسے آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ یوں یہ اطلاع زاہد ملک نے ناصر مرزا تک پہنچائی۔

ناصر مرزا نے سب سے پہلے وہ ماچس کی ڈبیہ جس میں اب ایک تیلی موجود تھی۔ اسپا میں کی۔ اس کے بعد اس نے زاہد ملک کو ہدایت دی۔ ''رمضان کو میری گاڑی میں بٹھا کر فوراً اسپتال لے جاؤ۔ اس سلسلے میں جو بھی خرچہ ہوگا اسے میں برداشت کروں گا۔''

زاہد ملک اسے فوراً گاڑی میں بٹھا کر اسپتال پہنچا۔

آنکھوں کے سرجن نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور معائنے کے بعد اس نے جو رائے بتائی۔ اسے سن کر زاہد ملک کا منہ کھلا رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اسے آنکھوں سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ اس کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔

''یہ بات میں پوری ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ اس کی آنکھیں پوری طرح صحیح ہیں۔ بھلا ماچس کی تیلی جلنے سے بھی کبھی کسی کی آنکھیں ضائع ہوئی ہیں اور وہ بھی دونوں۔'' ڈاکٹر نے بڑی وثوق سے کہا۔

''رمضان تم نے سن لیا۔ ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔''

''ہاں! میں نے سن لیا۔'' رمضان نے پریشان ہوکر کہا۔ ''خدا کی قسم زاہد صاحب مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا۔''

''اچھا آؤ میرے ساتھ..... فون پر ناصر صاحب سے بات کرتے ہیں۔'' زاہد ملک نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آئی سرجن کے کمرے سے رمضان کو لے کر باہر آ گیا۔

اسپتال کے استقبالیہ سے زاہد ملک نے ناصر مرزا سے بات کی۔ اسے ساری صورت حال بتائی اور پوچھا۔ ''سر اب کیا حکم ہے۔''

ناصر مرزا نے زاہد ملک کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''تم اسے دفتر واپس لے آؤ۔ میں سوچتا ہوں کہ اب اس کے لئے کیا کرنا ہے۔''

ناصر مرزا نے ٹیلی فون منقطع کر کے ایک مرتبہ پھر عابد منجم سے بات کی۔ انہیں رمضان کے اندھے ہونے کی داستان سنائی۔

پوری روداد سننے کے بعد عابد منجم بولے۔ ''میں نے منع کیا تھا نا ماچس جلانے کو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے چپڑاسی کو فوراً میرے پاس لے آؤ۔ میں دیکھتا ہوں کہ کیا معاملہ ہے۔ بھئی یہ عورت تو توقع سے زیادہ خطرناک معلوم ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے رمضان واپس دفتر آ جائے تو میں فوراً آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون منقطع کر دیا اور ریسیور پکڑے سوچنے لگا۔

ناصر مرزا نے جنات بھوت پریت' آسیب کے بہت واقعات سنے اور پڑھے تھے۔ ایک دو دیکھے بھی تھے لیکن اس طرح کی کسی عورت سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جادو کے بارے میں اس نے سنا ضرور تھا لیکن کوئی جادو گر دیکھا نہ تھا۔ اب واسطہ پڑا تو ایک عورت سے ...... ایک تو ساحرہ اوپر سے حسین ...... حسین عورت تو ویسے ہی کسی سحر سے کم نہیں ہوتی۔ اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے لیکن یہ برکھا تو چیز ہی دیگر تھی۔ وہ کالے علم میں بہت آگے تھی۔ وہ روح کی منتقلی کے فن سے بھی واقف تھی۔ وہ پکی شیطان تھی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد وہ رمضان کو لے کر عابد منجم کے دفتر پہنچ گیا۔ عابد منجم نجوم پر ایک ماہنامہ نکالتے تھے۔ رمضان کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے اپنے نزدیک کرسی پر بٹھالیا اور اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بظاہر بالکل ٹھیک تھیں۔ نہ کوئی سرخی تھی نہ کوئی زخم تھا اور نہ ہی آنکھوں میں کسی قسم کا درد تھا۔

"ہاں! رمضان کیا ہوا تھا؟" انہوں نے پوچھا۔

"سر جی میں نے جیسے ہی تیلی جلائی اور اس کے شعلے پر نظر پڑی تو ایک دم سے آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔" رمضان نے بتایا۔

"اب تمہیں کچھ نظر آ رہا ہے۔"

"جی بالکل نہیں ...... میری آنکھوں میں اب بھی گہرا اندھیرا اترا ہوا ہے جیسے کسی نے آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دی ہو۔"

"تم نے صحیح کہا۔ رمضان تمہاری آنکھوں پر واقعی کالا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔" عابد منجم نے کہا پھر ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر بولے۔ "وہ ماچس کہاں ہے؟"

"یہ ہے۔" ناصر مرزا نے ماچس نکال کر اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

عابد منجم نے ماچس کی ڈبیہ سے وہ تیلی نکال کر بڑے غور سے دیکھی اور بولے۔ "خوب آتش بازی ہے۔"

"یہ تیلی تو عام سی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ بطور خاص بنائی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔"

"ہاں' ٹھیک کہا تم نے۔ یہ تیلی کسی عام ماچس کی ہے لیکن وہ عورت بڑی آتش باز ہے۔ کس طرح ماچس کی ڈبیہ پھینک کر نکل گئی۔" یہ کہہ کر انہوں نے گھنٹی بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر کا ملازم اندر آیا۔ عابد منجم اس سے مخاطب ہو کر بولے۔ "شوکت! ایک گلاس میں پانی لاؤ۔"

"جی صاحب!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر گیا اور ایک شفاف گلاس میں پانی لے آیا۔

عابد منجم نے وہ گلاس اپنے سامنے رکھا اور دھیرے دھیرے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ماچس کی تیلی ان کے ہاتھ میں تھی اور ان کی نظریں تیلی پر۔"

دو چار منٹ کچھ پڑھ کر انہوں نے تیلی پر پھونک ماری اور اس کی مصالحہ لگی سائیڈ پانی میں ڈال کر نکال لی۔ مصالحہ گیلا ہو گیا۔ انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

اس طرح انہوں نے تین مرتبہ کچھ پڑھ کر تیلی پر پھونک ماری اور اسے پانی میں ڈبو کر نکال

لیا۔ تیسری مرتبہ اس کا مصالحہ چھوٹ کر میز پر گر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی جیسا ہو گیا۔

تب انہوں نے گھنٹی بجا کر شوکت کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا گلاس دے کر کہا۔ ''رمضان کو باتھ روم میں لے جاؤ۔ اس پانی سے اس کی آنکھیں دھلوانی ہیں۔ تم اس کے ہاتھ پر پانی ڈالتے جانا یہ دھوتا جائے گا۔''

شوکت نے رمضان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''آؤ بھئی۔''

''یہ اس طرح نہیں جا سکتا۔ اس کا ہاتھ تھام کر لے جاؤ۔'' عابد منجم نے ہدایت کی۔

رمضان نے اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ چلائے۔ تب شوکت کو احساس ہوا کہ بندہ اندھا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی اس نے فوراً رمضان کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھیرے دھیرے کمرے سے نکال لے گیا۔

پانچ منٹ کے بعد جب رمضان کمرے میں واپس آیا تو اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی۔

''سر میں دیکھ سکتا ہوں۔ میری آنکھوں سے اندھیرا چھٹ گیا۔''

''شکر ہے اللہ کا ...... ورنہ میں تو تمہاری طرف سے بڑا فکر مند ہو گیا تھا۔'' ناصر مرزا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اب تو تمہیں نظر آ رہا ہے نا۔'' عابد منجم نے تصدیق چاہی۔

''جی سر! مجھے بالکل صاف نظر آ رہا ہے۔ آپ نے کمال کر دیا سر۔'' رمضان بڑی ممنونیت سے عابد منجم کو دیکھتا ہوا بولا۔

''جاؤ عیش کرو، تم پر اللہ کا فضل ہو گیا ورنہ اس شیطان نے تمہیں اندھا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔'' عابد منجم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اصل فضل تو مجھ پر ہوا کیونکہ اصل نشانہ تو میں تھا۔ یہ بے چارہ تو ایسے ہی لپیٹ میں آ گیا۔'' ناصر مرزا نے وضاحت کی۔

''ہاں تم صحیح کہتے ہو۔ اب ہم دونوں کو اپنی حفاظت کے لئے بھی کچھ کرنا پڑے گا۔'' عابد منجم بولے۔

''ساحل عمر کے لئے آپ نے کیا کیا؟ ناصر مرزا نے پوچھا۔

''اس کے لئے میں نے تعویذ تیار کر لیا ہے۔ اسے یہ تعویذ مستقل گلے میں ڈال کر رکھنا ہو گا۔'' عابد منجم نے کالے کپڑے میں سلا تعویذ جیب سے نکال کر ناصر مرزا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

پھر ناصر مرزا نے رمضان کو دفتر بھیج دیا اور وہ دونوں بڑی دیر تک آئندہ کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔

آج صبح ہی سے برکھا کی حالت خراب تھی۔ وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔ بے چینی سے اپنے ہاتھ پاؤں پٹخ رہی تھی۔ اسے کسی کروٹ قرار نہ تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا اور نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ ورشا کئی مرتبہ اس سے ناشتے کا کہہ چکی تھی۔

"نہیں ورشا نا شکہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ میرے اندر آگ لگی ہے۔" وہ تڑپ کر بولی۔
"مگر گرمی لگ رہی ہے تو ایئر کنڈیشنر اور تیز کردوں۔" ورشا نے تجویز پیش کی۔
"نہیں ورشا مجھے پیاس لگی ہے۔" وہ اپنی زبان باہر نکال کر بولی۔
"نہیں ورشا مجھے تو جوس لے آؤں۔"
"پیاس لگی ہے تو جوس لے آؤں۔"
"پیاس نہیں ہے یہ کوئی اور پیاس ہے۔"
"نہیں ورشا یہ وہ پیاس نہیں ہے جو تمہیں کئی مرتبہ اس طرح تڑپتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔ شام ہوتے ہوتے تمہاری حالت مردوں سے بدتر ہو جائے گی۔ اتنی کمزور ہو جاؤ گی جیسے برسوں کی مریض..... ممی یہ تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ کچھ بولو تو....." ورشا نے برکھا کا ہاتھ پکڑ لیا جو برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ "بتاؤ ممی!"
"تو جانتی ہے کہ میں نے تیرے نانا کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو وہ مجھے بھینٹ چڑھا دیتا۔ وہ میری جان کا دشمن ہو گیا تھا اور ٹھیک ہوا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ اسے یہی کرنا چاہئے تھا۔ میں اس کی تپسیا تھی۔ اس کا سرمایہ تھی۔ اس نے مجھ پر بہت محنت کی تھی۔ اس نے مجھے ہر وہ سحر سکھا دیا تھا جو اسے آتا تھا۔ وہ میرے ذریعے اس دنیا پر دنیا والوں پر راج کرنا چاہتا تھا۔ اس کام کا آغاز اس نے بمبئی پہنچ کر کر دیا تھا لیکن میں نے اس کے ساتھ دغا کی۔ اسے دھوکا دیا۔ اس کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔ برا ہوا اس محبت کا جو مجھے مناف سے ہو گئی۔ مناف کی محبت نے مجھے راستے سے بھٹکا دیا۔ اپنے باپ اپنے استاد کو چھوڑ کر مناف کے ساتھ نکل گئی۔ پھر سب سے بھیانک غلطی میں نے یہ کی کہ میں مسلمان ہو گئی اور میں نے ان کاموں سے توبہ کر لی۔ جو لوگ اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ اپنا مسلک چھوڑ دیتے ہیں ان کے ساتھ یہی ہونا چاہئے جو میرے ساتھ ہوا۔ میرا باپ مجھے سزا دینے آ پہنچا۔ یہ بات میں اچھی طرح جان گئی کہ اب وہ مجھے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑے گا اور میں کسی قیمت پر مرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اس کے مقابلے پر آ گئی۔ اس کا سکھایا پڑھایا اسی پر آزما ڈالا۔ اس طرح میں اسے بھینٹ چڑھانے میں کامیاب ہو گئی۔ جو فائدہ وہ اٹھانا چاہتا تھا وہ فائدہ میں نے اٹھا لیا۔ مجھے اس بھینٹ کے عوض بہت کچھ مل گیا۔ میرا قیمتی خون تو ضائع ہوا لیکن مجھے ایک طاقت مل گئی۔ کالی طاقت۔ اب میں مسلمان نہ رہی۔ کافر ہو گئی۔ اپنے مسلک پر لوٹ آئی۔ مناف کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ میں کیا سے کیا ہو گئی ہوں۔ جھوٹ' دھوکا' فریب میرا مذہب بن گیا۔ سیدھے راستے سے لوگوں کو بھٹکانا میرا ایمان ہو گیا۔ پھر ایک دن مناف نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو میرے اندر آگ بھڑک اٹھی۔ وہ میرے غصے کی لپیٹ میں آ گیا۔ اسے بھی میں نے بھینٹ چڑھا دیا۔ اس طرح میرا قیمتی خون ایک مرتبہ پھر ضائع ہوا۔ وہ پیاس جو میرے اندر پہلے ہی بھڑک رہی تھی۔ مزید بھڑک اٹھی۔ اس پیاس کو بجھانے کے لئے مجھے بڑے جتن کرنے پڑے ہیں۔ یوں سمجھو کہ مجھے خون کا سرطان ہو گیا ہے۔ جس طرح خون کے سرطان میں بار بار نئے اور تازہ خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جب میرے اندر پیاس بھڑکتی ہے تو یہ تازہ خون حاصل کئے بغیر نہیں بجھتی۔ آج میں نے تمہیں ساری بات اچھی طرح سمجھا دی ہے۔ پوری تفصیل بتا دی ہے۔ اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ

کس قسم کی پیاس ہے۔" برکھا نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔

"پھر ممی تمہارے لئے تازہ خون کہاں سے آئے گا۔" ورشا فکر مند ہو کر بولی۔

"آجائے گا ..... تم پریشان مت ہو۔ میں انتظام کرلوں گی۔" برکھا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم ذرا واسم کو فون ملاؤ۔"

"ٹھیک ہے ممی۔" ورشا نے واسم کا نمبر ڈائل کر کے ریسیور برکھا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ادھر ابھی بیل ہو رہی تھی۔ پھر کسی نے فون اٹھا کر "ہیلو" کہا۔

"ہاں واسم میں بول رہی ہوں۔" برکھا نے اس کی آواز پہچان کر اپنی پہچان کرائی۔

"جی، برکھا جی ..... کیا حکم ہے میرے لئے ....." وہ فرماں برداری سے بولا۔

"آج سوناں کو لے کر شکار پر جانا ہے۔" برکھا نے حکم دیا۔

"جی ٹھیک ہے۔"

"سوناں سے کہنا ذرا آنکھیں کھول کر کام کرے۔ تم اس کے آگے پیچھے رہنا تاکہ کسی قسم کی گڑبڑ ہونے پر معاملہ سنبھال سکو۔ اس سے کہنا کہ ذرا صحیح چیز کا انتخاب کرے۔ ٹھیک ہے۔ اچھا ذرا جلدی آنا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سمجھ گئے نا میری بات۔"

"جی سمجھ گیا۔ ہم جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔ شکار ملتے ہی ہم نکل آئیں گے۔" اس نے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے ..... او کے۔" برکھا نے ریسیور ورشا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ممی آپ تھوڑا سا کچھ کھالیں۔" ورشا نے ریسیور رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ورشا میں کچھ نہیں کھا سکتی۔ اگر کھاؤں گی تو فوراً باہر آجائے گا۔ مجھے رات تک انتظار کرنا ہوگا۔" برکھا نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"جوس وغیرہ لے لیں ..... اس طرح تو نقاہت بہت بڑھ جائے گی۔" ورشا فکر مند تھی۔

"نہیں جوس نہیں ..... ایسا کرو مجھے تھوڑا سا نمک ملا پانی دے دو۔ نمکین پانی کے علاوہ کچھ نہیں پیا جاسکتا۔"

برکھا نے کہا۔

"ممی مجھے نہیں معلوم کہ راسم کو آپ نے کس شکار پر بھیجا ہے اور وہ آپ کے لئے کیا انتظام کر کے لائے گا لیکن میں سوچتی ہوں کہ اگر کسی وجہ سے وہ انتظام نہ کر پایا تو پھر آپ رات کس طرح گزاریں گی۔"

"ورشا ایسی بری باتیں منہ سے مت نکال۔ سوناں بڑی کھلاڑی عورت ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گی۔ اگر وہ کسی وجہ سے ناکام ہوگئی تو پھر میرے پاس ایک راستہ اور ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ورشا کو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ سہم کر رہ گئی۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ دن بھر خوب گرمی پڑی۔ شام ہوتے ہی موسم بہتر ہوگیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ کلفٹن پر اچھا خاصا رش تھا۔ پلے لینڈ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ اپنی فیملیز کیساتھ آئے ہوئے

تھے۔ انہی لوگوں میں سوناں اور واسم بھی تھے۔ سوناں سانولے رنگ کی اچھے نین نقش کی عورت تھی۔ وہ زرد رنگ کی سرخ بارڈر والی کاٹن کی ساڑھی ہندوانے اسٹائل میں باندھے ہوئے تھی۔ اس کی پیشانی پر لال بندیا اور مانگ میں سیندور پڑا ہوا تھا۔ اسے پلے لینڈ میں گھومتے ہوئے ایک گھنٹہ ہوگیا تھا۔ واسم اس کے نزدیک ہی تھا۔ کبھی آگے کبھی پیچھے کبھی دائیں کبھی بائیں اور کبھی دو چار قدم ساتھ بھی چل لیتا تھا۔

سوناں بہت تیزی سے ادھر ادھر نظروں کے جال پھینک رہی تھی لیکن اس کی مطلوبہ چیز ابھی تک نظروں میں نہیں آئی تھی۔ وہ ادھر سے ادھر گھومتی رہی۔ تب اچانک اس کی نظر ایک جھولے پر پڑی۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ اتنے میں جھولے میں بیٹھی لڑکی اوپر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ نیچے آئی تو اس کی نظروں نے اس کا انتخاب کیا۔ سوناں کو جھولے کے سامنے کھڑا دیکھ کر واسم بھی نزدیک رک گیا اور جھولے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اندازہ نہ کر پایا کہ سوناں نے کس لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔

جھولے کے رکنے کے بعد فیملیز نے باہر آنا شروع کیا تو وہ اپنی منتخب کردہ لڑکی کے پیچھے ہولی۔ وہ سات آٹھ افراد کی فیملی تھی۔ اس میں چار لڑکیاں، دو عورتیں، ایک جوان لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا۔ وہ لڑکی ان میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی عمر بمشکل تیرہ چودہ سال ہوگی۔ وہ بڑی پیاری سی لڑکی تھی، معصوم سی......

سوناں نے لڑکی کو دیکھتے ہی منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ اب وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ جیسے ہی رش میں لڑکی اپنی فیملی سے ذرا الگ ہوئی تو سوناں نے آگے بڑھ کر بہت نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ لڑکی نے فوراً ہاتھ پکڑنے والی کو دیکھا۔ سوناں نے پھونک مار کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اس کا ہاتھ دبا کر اپنی طرف کھینچا۔ ''آجاؤ میرے ساتھ......''

وہ لڑکی یہ سن کر اس کے ساتھ کچھ اس طرح چل دی جیسے اپنی ماں کے ساتھ جارہی ہو۔ وہ لڑکی بندش میں آگئی تھی اور کسی سحرزدہ معمول کی طرح اس کے ساتھ چلی آرہی تھی۔

واسم نے جب دیکھا کہ سوناں نے شکار پکڑلیا ہے تو وہ اس کے قریب آکر بولا۔ ''سوناں جلدی کر......''

''تو گیٹ سے نکل کر گاڑی اسٹارٹ کر میں اسے لا رہی ہوں۔'' سوناں نے اسے بھگایا۔

''آؤ ...... وہ دونوں گیٹ سے باہر نکل آئے اور اندھیرے میں اس کی پچھلی نشست پر سوناں نے اس لڑکی کو دھکیلا اور ہیجانی انداز میں بولی۔ ''واسم بھگا گاڑی۔''

واسم طوفانی انداز میں وہاں سے گاڑی نکال کر مین روڈ پر لے آیا۔

گاڑی میں اندھیرا تھا۔ اس لڑکی کو سوناں نے اپنے قریب کر کے اس کا سر اپنے کندھے پر لگالیا تھا۔ اس لڑکی پر نیم غشی طاری ہو چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے ہوش کھوتی جارہی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ایک تو شکار جلد مل گیا تھا اور برکھا کے مطلب کا تھا۔

جب گاڑی برکھا کے گھر کے گیٹ پر پہنچی تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ واسم نے مخصوص انداز میں گاڑی کا ہارن دیا۔ برکھا جواب نڈھال ہو چکی تھی ہارن کی آواز سن کر ایک دم اس کے تن

مردہ میں جان سی پڑ گئی۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ ''وہ آ گئی۔''

''ممی میں جا کر گیٹ کھولوں۔'' ورشا نے اجازت چاہی۔

''ہاں جاؤ۔'' برکھا نے اسے گیٹ کھولنے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر

''تم گاڑی میں جھانکنے کی کوشش مت کرنا۔ گیٹ کھول کر واپس اپنے کمرے میں چلی جانا۔ آج

سونا میرے ساتھ ہی رہے گی۔ البتہ واسم فوراً واپس چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد سونا

گیٹ بند کر لے گی۔

''اچھا ممی۔'' ورشا نے سعادت مندی سے کہا۔ ''میں گیٹ کھول کر اپنے کمرے میں چلی

جاؤں گی۔''

ورشا نے گیٹ کھولا تو گاڑی کی بجھی ہوئی ہیڈ لائٹس ایک دم آن ہو گئیں۔ ورشا کی آنکھیں

چندھیا گئیں وہ فوراً ایک طرف ہو گئی۔ اس کے ایک سائیڈ پر ہوتے ہی گاڑی تیزی سے اس کے پاس

سے گزر گئی۔ ورشا باوجود کوشش کے کچھ نہ دیکھ پائی۔ گاڑی گھوم کر بنگلے کے پیچھے چلی گئی۔

ورشا نے گیٹ کھلا چھوڑ کر اپنے کمرے کا رخ کیا اور

لائٹ جلا کر ایک رسالہ پڑھنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گاڑی واپس جانے کی آواز

سنی۔ کسی نے گیٹ بند کیا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ کچھ وقت گزرا تو ورشا نے رسالہ ایک طرف

پھینک کر کمرے میں لائٹ آف کر دی اور سوچا کہ چپکے سے نکل کر ممی کے کمرے کی طرف جائے اور

وہاں جا کر دیکھے کہ کیا ہو رہا ہے۔

ابھی وہ باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ باہر سے اس کے دروازے کے کنڈے کے ہلنے

ہونے کی آواز آئی۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کنڈا بند کر کے تالا ڈال دیا ہو۔

ورشا نے آگے بڑھ کر دروازے کو آہستہ سے ہلایا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ وہ کھلا کیے؟

ورشا نے سوچا کہ دروازے کو باہر سے بند کر دینا ہی کافی تھا۔ کنڈے میں تالا ڈالنے کی کیا ضرورت

تھی۔ وہ بند کنڈے کو اندر سے کسی قیمت پر نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کمرے میں دو دروازے تھے۔ ایک

دروازہ ممی کے پرانے بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ یہ وہ بیڈ روم تھا جس سے جھانک کر اس نے اپنے باپ

مناف کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے باپ کو مارنے کے بعد برکھا نے یہ بیڈ روم چھوڑ دیا تھا۔ اس بیڈ

روم کے برابر والے کمرے کو برکھا نے اپنا بیڈ روم بنا لیا تھا۔ برابر والے بیڈ روم کے درمیان بھی ایک

دروازہ تھا۔ اگر اندر کے دونوں دروازے کھول دیے جائیں تو تینوں کمرے ایک ہو سکتے تھے۔

تینوں بیڈ روموں کو ملانے والے دونوں دروازوں کے اوپر شیشے لگے ہوئے تھے۔ ورشا لمبے

قد کی لڑکی تھی۔ اس نے ذرا سا اچک کر دیکھا۔ برابر والے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ تو خیر تھا ہی

وہاں تو اندھیرا ہونا ہی تھا لیکن برکھا کے کمرے میں بھی اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ برکھا اپنے بیڈ

روم میں نہ تھی۔ اس نے دروازے میں دھکا مار کر دیکھا وہ دوسری طرف سے بند تھا۔

ورشا اب اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ مایوس ہو کر بیڈ پر اوندھے منہ گری اور

سسکیوں سے رونے لگی۔

برکھا اس وقت اس کمرے میں تھی جہاں دن میں بھی اندھیرا رہتا تھا۔ یہ کمرہ ایک طرح اس کا آپریشن تھیٹر تھا۔ وہ یہیں بیٹھ کر سارے عملیات کرتی تھی۔ یہی اس کی پوجا کا کمرہ تھا۔ وہ شیطان کی پجارن تھی۔ اس شیطان کی پجاری جس نے انسان کے وجود میں آتے ہی قسم کھائی تھی کہ وہ رہتی دنیا تک اسے بھٹکاتا رہے گا۔ نقصان پہنچاتا رہے گا۔ ایک زمانے میں وہ ہندو تھی ہندو اس لئے تھی کہ اس کا باپ ہندو تھا۔ پھر وہ مسلمان ہوئی۔ مسلمان اس لئے ہوئی کہ اس کا شوہر مسلمان تھا۔ اب وہ مسلمان تھی نہ ہندو۔ اس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ وہ اس دنیا کے سب سے بڑے طاغوت کی چیلی تھی۔ اس کی پجارن تھی۔ اس کی پیروکار تھی۔ وہ بدی کے دیوتا کی داسی تھی۔ وہ ابلیس کی غلام تھی۔ وہ ابلیس جو سدا سے انسان کا دشمن ہے۔ ایسے انسان کا جو اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہو۔ ایسے انسان کو بھٹکا کر چھوڑ دینا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ انسان کے وجود میں نیکی بدی دونوں موجود ہوتی ہیں۔ جو شخص اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لیتا ہے اس کی روح میں نیکی کی روشنی پھیل جاتی ہے اور بدی سمٹ کر اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے۔ ایسے شخص کے پیچھے شیطان لگ جاتا ہے۔ وہ اس کی کمزوری تلاش کرتا ہے اور پھر اس کی روح میں بجھی ہوئی بدی کی موم بتی کو گناہ کی دیا سلائی سے روشن کر دیتا ہے۔ گناہ میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ انسان بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکتا ہے۔ گناہ میں اگر کشش نہ ہو تو گناہ کون کرے لیکن گناہ کر کے ہمیشہ دکھ پہنچتا ہے۔ آدمی غمگین ہو جاتا ہے۔ پچھتاتا ہے جبکہ نیکی میں بظاہر کوئی کشش نہیں ہوتی لیکن نیکی کر کے ہمیشہ سکھ پہنچتا ہے۔ آدمی کو سکون ملتا ہے۔ ایک سرخوشی سی اس پر چھا جاتی ہے۔ نیکی اللہ ہے اور بدی شیطان ..... شیطان کا ہاتھ پکڑنے والا ہزار آسائشوں کے باوجود دکھی رہتا ہے۔ بے چین رہتا ہے۔ ایک کرب میں مبتلا رہتا ہے جبکہ اللہ کی رسی کو تھامنے والا ہزار دکھوں کے باوجود سکھی رہتا ہے۔ پرسکون رہتا ہے۔ اس کی روح پر اطمینان کی بارش برستی رہتی ہے۔

طاقت دونوں کو مل جاتی ہے۔ اس کو بھی جو نیکی کی راہ پر چلتا ہے اور اس کو بھی جو بدی کے راستے اپنا لیتا ہے۔ ہوا کے دوش پر دونوں آدمی اڑ سکتے ہیں۔ وہ بھی جس کے پاس اللہ کی بخشی ہوئی طاقت ہوگی اور وہ بھی جس کے پاس ابلیس کی دی ہوئی قوت ہوتی ہے۔ فرق صرف نیت کا ہوتا ہے۔ روحانی آدمی سب کا دوست ہوتا ہے اور شیطانی آدمی سب کا دشمن ہوتا ہے۔ سب سے بڑا دشمن تو وہ خود اپنا ہوتا ہے۔

برکھا نے جو راستے اپنا لئے تھے وہ راستے اسے اس زندگی کی طرف لے جا رہے تھے جہاں آگ ہی آگ تھی۔ لیکن اس آگ سے وہ انجان تھی۔ اس وقت تو اسے اس آگ کی فکر تھی جو اس کے لہو میں لگی تھی۔ لہو کی اس آگ کو بجھانے کے لئے تازہ خون کی ضرورت تھی۔

اور سوناں اس کے لئے ایک دو بوتل خون نہیں پورا "بلڈ بینک" اٹھا لائی تھی۔ اس وقت وہ اس عملیات والے کمرے میں تھیں۔ اس کمرے میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ وہ لڑکی اب مکمل طور پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ فرش پر لیٹی تھی۔ سوناں کے ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا نیا بلیڈ تھا۔ اس نے لڑکی کی کلائی میں بلیڈ سے ایک چیرا لگایا۔ فوراً ہی سرخ سرخ خون ابل کر باہر آیا اور کلائی سے بہ کر نیچے گرنے لگا۔ سوناں نے اس کے ہاتھ کو ایک بڑے چینی کے سفید پیالے پر رکھ دیا۔ خون ٹپک کر اس

پیالے میں بھرنے لگا۔

چوتھائی پیالہ بھر جانے پر اس نے یہ پیالہ برکھا کے سامنے رکھ دیا۔ برکھا آلتی پالتی مارے آسن جمائے بیٹھی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور شیطان کا کلمہ پڑھ رہی تھی۔ سوناں سے کچھ بولے بغیر اسے آہستہ سے چھوا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اپنے سامنے پیالہ دیکھ کر اس نے اپنا انگوٹھا خون میں ڈبویا اور اپنی زبان باہر نکال کر چند قطرے خون ٹپکایا اور زبان اندر کر کے خون کا ذائقہ چکھا۔ پھر پنجتارے لیتی ہوئی سوناں کو بڑی تعریفی نگاہوں سے دیکھا۔

"واہ سوناں تیرا جواب نہیں۔"

"میں آپ کی داسی ہوں' برکھا دیوی! آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔" سوناں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عقیدت سے اس کے سامنے سر جھکایا۔

برکھا نے وہ پیالہ اٹھا کر اپنے سر پر الٹ لیا اور بیٹھے بیٹھے سرشاری سے جھومنے لگی۔ پیالہ خالی ہوتے ہی سوناں نے اٹھالیا اور اس لڑکی کے جسم کے مختلف حصوں پر کٹ مار کر اس پیالے کو بھرنے لگی۔

خون میں بھیگی برکھا موم بتی کی روشنی میں بڑی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ مسلسل ہل رہی تھی اور ناقابل فہم الفاظ کا ورد کر رہی تھی۔ کمرے میں پہلے ہی کیا کم بو تھی لیکن اب یہ بو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بو اس قدر اذیت ناک تھی کہ کوئی حساس انسان اس کو سونگھ لیتا تو فوراً بے ہوش ہو جاتا لیکن ان دونوں پر اس بدبو کا کوئی اثر نہ تھا۔

جھومتے جھومتے جو اچانک برکھا نے اپنا سر اٹھایا تو ایک لمحے کو سوناں بھی کانپ اٹھی۔ کمرہ ویسے ہی تقریباً تاریک تھا۔ ایک موم بتی کی روشنی بھلا کتنا اندھیرا دور کر سکتی تھی۔ اس اندھیرے میں جب ایک فٹ لمبی زبان منہ سے باہر آ جائے اور آنکھوں میں خونخوار چمک پیدا ہو جائے۔ رنگ ایک دم سیاہ ہو جائے تو سامنے بیٹھنے والا انسان آخر کانپے گا نہیں تو کیا کرے گا۔

"لا.....!" برکھا نے اپنی زبان کو لپلپاتے ہوئے بڑے وحشت ناک انداز میں کہا۔

سوناں اس پیالے کو خون سے لبالب بھر چکی تھی۔ اس نے وہ پیالہ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ برکھا نے بڑی بے قراری سے اپنے دونوں ہاتھوں پر جھک کر اپنی ایک فٹ لمبی زبان پیالے میں ڈال دی۔

اس کے بعد کمرے میں "چپ چپ" کی آواز گونجنے لگی۔

"ورشا روتے روتے جانے کب سو گئی۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے وہ گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی جلدی سے اٹھ گئی۔ اسے بڑی شدت کی بھوک لگی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ اپنی بھوک سے زیادہ اسے برکھا کے ناشتے کی فکر تھی۔ برکھا ٹھیک آٹھ بجے ناشتہ کرنے کی عادی تھی۔ ناشتے میں وہ دو چار منٹ کی دیر بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ ورشا کو ڈانٹ دیتی تھی۔ اس وقت تو دس بج رہے تھے۔ جانے برکھا کا غصے میں کیا حال ہوگا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر جب اس نے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ نہیں کھلا۔ اس نے اطمینان

کا سانس لیا۔ اب اس دیر میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بند دروازے سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔
پھر اسے یاد آیا کہ برکھا نے کہا تھا سوناں آج رات یہیں رہے گی۔ اسی لئے برکھا کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ سوناں نے ناشتہ بنا کر دے دیا ہوگا۔ اب اسے اپنی بھوک کا احساس ہوا۔ اس نے دروازے کو زور سے جھنجوڑا۔ کئی مرتبہ پکارا ..... مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ وہ تھک کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور دروازے کو تکنے لگی۔
کوئی گیارہ بجے کے قریب دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے نزدیک پہنچی تو وہ اس وقت کھل چکا تھا۔
وہ دروازے پر کھڑی تھی اور ورشا اسے دیکھ کر ساکت ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

اسے دیکھ کر ورشا کو ساکت تو ہو ہی جانا تھا۔ دروازے پر برکھا کھڑی تھی۔ وہ سرخ ساڑھی باندھے ہوئے تھی اور شعلہ جوالا بنی ہوئی تھی' یہ وہ برکھا نہ تھی جس کا چہرہ کل زرد پڑ چکا تھا اور کمزوری کے مارے اٹھنا محال تھا۔ اس وقت تو وہ بڑی چاق و چوبند تھی۔ چہرے پر بغیر میک اپ کے سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ چہرہ ایک دم فریش تھا۔ بال سلیقے سے بندھے ہوئے تھے اور اس میں چنبیلی کے پھول گندھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر تر و تازہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی خوبصورت تو اس نے اپنی ماں کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اگر وہ اسے دیکھ کر ساکت رہ گئی تھی تو حق بجانب تھی۔
برکھا ورشا کو دیکھتے ہی اپنی بانہیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھی۔ اس نے ورشا کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔
''میری جان!''
اس کی بانہوں میں جاتے ہی ورشا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ کسمسا کر جلدی سے اس سے الگ ہوگئی برکھا سمجھی کہ وہ ناراضگی کے اظہار کے لیے اس سے الگ ہوئی ہے۔ ایسا نہ تھا اصل میں برکھا کے جسم سے شدید بھپکا آیا تھا۔
''میری جان ناراض''
برکھا نے نرم لہجے میں پوچھا۔
''نہیں ممی۔''
اس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔
''ورشا' دروازے پر تالا میں نے ڈلوایا تھا اور ایسا میں نے تمہاری بھلائی کے لیے کیا تھا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ ..... میں نے اپنی بیٹی کے لیے خود ناشتہ بنایا ہے۔''
برکھا نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا
''نہیں ممی کوئی بات نہیں ..... میں جانتی ہوں' آپ جو کرتی ہیں میری بھلائی کے لیے ہی کرتی ہیں۔''
برکھا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا اور قدرے لہجہ بدل کر بولی۔

''مجھ پر طنز کر رہی ہو۔''

''نہیں ممی' میں بھلا ایسی جسارت کر سکتی ہوں۔''

ورشا نے نظریں جھکا کر کہا۔

''ہاں ورشا کبھی ایسی کوشش بھی نہ کرنا..... برکھا کے لہجے میں تنبیہ آ گئی تھی۔

ورشا نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اچھا آؤ' میرے ساتھ ناشتہ تو کر لو۔ پھر مجھے باہر جانا ہے۔''

یہ کہہ کر برکھا نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے چلی۔

☆.....☆.....☆

صادق مرزا نے چلتے چلتے پلٹ کر پوچھا۔

''ارے بھئی روزی سے پوچھو' اس نے آئس کریم یہیں کھانی ہے یا باہر چل کر کھائے گی۔''

صادق مرزا کی بیگم نے پیچھے آئی فیملی پر نظر ڈالی۔ تب اچانک ہی یہ احساس ہوا کہ روزی ان میں نہیں ہے۔ ایک دم ہی کھلبلی مچ گئی۔

''ارے روزی کہاں ہے۔؟''

''ابھی تو یہیں تھی۔''

''کسی نے کہا۔'' وہ میرے پیچھے تھی۔''

کسی نے بتایا۔

''وہ اس کے آگے تھی۔''

روزی کے بارے میں سب کا بیان یہی تھا کہ وہ ابھی تو یہیں تھی لیکن روزی کا دور تک پتہ نہیں تھا۔ صادق مرزا اور اس کے نوجوان بیٹے ارباز صادق نے پلے لینڈ کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن روزی کا کوئی سراغ نہ ملا۔

روزی کا اصل نام روزینہ تھا۔ صادق مرزا کے دو ہی بچے تھے ایک ارباز صادق جو روزی سے پانچ چھ سال بڑا تھا اور ایک روزی تھی۔ صادق مرزا کی فیملی کے ساتھ روزی کی خالہ اور اس کی خالہ زاد بہنیں بھی تھیں۔ سب لوگ پریشان تھے۔

صادق مرزا نے پہلے اپنی فیملی کو گھر چھوڑا اور پھر پولیس اسٹیشن جانے لگا تو اس کے بیٹے ارباز صادق نے کہا۔

''ابو' چچا جان سے بات کر لیں۔ انہیں اطلاع دے دیں۔''

ارباز نے نمبر ملا کر موبائل ریسیور صادق مرزا کے ہاتھ میں دے دیا۔ دو گھنٹیاں بجنے کے بعد ادھر سے کسی نے فون اٹھایا اور بھاری لہجے میں کہا۔'' ہیلو''

بھائی کی آواز پہچان کر صادق مرزا بہت دھیرے سے بولا۔'' ناصر.....''

''جی بھائی جان..... کیا حال ہیں؟''

''ناصر خیر نہیں ہے۔''

''ارے کیا ہوا؟''

''ہم لوگ پلے لینڈ گئے تھے۔ وہاں روزی گم ہو گئی''۔ صادق مرزا کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

''ہم لوگ پلے لینڈ سے وہ کہاں جا سکتی ہے۔ رش میں ادھر ادھر ہو گئی ہو گی۔''

''پلے لینڈ سے اس وقت آئے ہیں۔ جب پورا پلے لینڈ خالی ہو چکا تھا۔ روزی کو ہم نے ہم وہاں سے پلے لینڈ کے چپے چپے میں تلاش کیا۔ وہ کہیں نہیں ملی۔''

''اوہ!''

ناصر مرزا نے گہرا سانس لیا۔ اور پھر توقف کر کے بولا۔

''پولیس میں رپورٹ لکھائی''

''نہیں، میں ابھی پولیس اسٹیشن جا رہا تھا کہ میں نے سوچا کہ تم سے بات کر لوں۔''

''اچھا آپ میرا انتظار کریں۔ میں نور آ ہی گھر سے نکل رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر ناصر مرزا نے ٹیلی فون رکھ دیا اور گاڑی نکال کر کلفٹن کی طرف چل دیا جہاں صادق مرزا ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھا۔

ناشتے کے بعد برکھا چلی گئی۔ وہ گاڑی میں کہیں گئی تھی اور شام تک آنے کا کہہ گئی تھی۔ ورشا کوسوناں کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید وہ ناشتے سے پہلے ہی چلی گئی تھی۔

ورشا گیٹ بند کر کے پلٹی تو اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ برکھا نے رات کو اسے قید کیوں کر دیا تھا۔ سوناں اس کے لیے کیا لیکر آئی تھی اور ان دونوں نے مل کر رات کو کیا کیا تھا۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ برکھا کے تن مردہ میں ایک ہی رات میں جان پڑ گئی بلکہ وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی توانا اور حسین ہو گئی۔

پہلے وہ برکھا کے بیڈ روم میں گئی۔ بیڈ روم کا اچھی طرح سے جائزہ لیا مگر وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ وہاں سے کوئی سراغ نہیں ملا جس سے رات کے واقعے پر روشنی پڑتی۔ پھر اس نے دوسرے کمروں کا بھی جائزہ لیا مگر وہاں سے بھی کوئی مشکوک چیز برآمد نہ ہوئی۔

اب صرف ایک کمرہ رہ گیا تھا اور وہ تھا عملیات اور پوجا پاٹ والا کمرہ۔ اس کمرے میں ورشا ایک دو مرتبہ سے زیادہ نہیں گئی تھی۔ کمرہ تاریک اور بدبودار تھا۔ کمرے میں کوئی چیز نہ تھی سوائے اس تین فٹ لمبے کپڑے کے ایک پتلے کے۔ یہ پتلا بڑی ہیبت ناک صورت کا تھا۔ اس پتلے کے گلے میں برکھا روز پھولوں کا ہار جو خود وہ اپنے ہاتھ سے بناتی تھی ڈالتی تھی۔ برکھا نے اس کمرے میں داخل ہونے سے منع نہیں کیا تھا لیکن وہ کمرہ اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس کمرے میں قدم رکھتے ہی خوف کی ایک لہر اٹھتی تھی۔ ورشا ایک دو مرتبہ کسی ضروری فون کال کے بارے میں بتانے گئی تھی۔ تب اس نے اپنی ممی کو موم بتی روشن کیے اس پتلے کے سامنے آسن جمائے بیٹھے دیکھا تھا اور وہ کمرے میں تھوڑا اندر جا کر اسے ٹیلی فون کے بارے میں بتا کر فوراً ہی باہر آ گئی تھی۔

آج اس نے سوچا کہ وہ اس کمرے کو بھی اندر سے دیکھ لے۔ جب وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ کمرے کا نہ صرف دروازہ بند تھا بلکہ اس پر تالا بھی پڑا تھا۔

ایسا آج تک نہ ہوا تھا۔ یہ کمرہ عام طور پر کھلا ہی رہتا تھا کیونکہ اس تاریک، بدبودار اور وحشت ناک کمرے میں برکھا کے سوا کوئی نہ جاتا تھا۔

ورشا نے تالے کو ہلا کر دیکھا۔ تالا بند تھا۔ اس نے برکھا کے بیڈ روم میں جا کر اس کی چابی تلاش کی لیکن وہ وہاں موجود نہ تھی۔ ویسے بھی اتنے بڑے بنگلے میں ایک تالے کی چابی تلاش کر لینا اتنا آسان نہ تھا۔

اب ایک چانس اور تھا اور چانس کے لیے اسے گھوم کر بنگلے کی پشت پر جانا پڑا۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی ادھر کھلتی تھی۔ اگرچہ اس بات کی امید نہ تھی کہ وہ کھڑکی ادھر سے کھلی ہو۔

وہ جب اس کمرے کی پشت پر پہنچی تو اسے کھڑکی بند نظر آئی۔ مایوس ہو کر وہ پلٹنے والی تھی کہ اس نے ایسے ہی اس پر ہاتھ رکھ کر اس کے پٹ کو اندر کی طرف دھکیلا۔ پٹ تھوڑا سا اندر ہو گیا لیکن کھلا نہیں تب اسے احساس ہوا کہ کھڑکی اندر سے بولٹ نہیں ہے بلکہ اس کا پٹ سختی سے بند ہے۔ اس نے ایک زور کا دھکا مارا تب پٹ کھل گیا۔

یہ کھڑکی فرش سے دو ڈھائی فٹ اونچی تھی۔ وہ اس کھڑکی کے ذریعے باآسانی اندر جا سکتی تھی۔ اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ دھکا دے کر کھول دیئے اور چند لمحے انتظار کیا۔ اسے اندر سے کوئی آہٹ نہ سنائی دی۔ البتہ بدبو کا بھپکا ضرور آیا۔ اس نے اپنی ناک پر دوپٹہ باندھ لیا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر اندر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر میں جب اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے کمرے کے عین درمیان کسی کو لیٹا ہوا پایا۔

تب اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر پیر رکھا اور اندر کود گئی۔ ورشا نے کھڑکی سے آتی روشنی میں دیکھا کہ وہ ایک تیرہ چودہ برس کی لڑکی ہے جو بے ہوش ہے اور اس کے جسم پر جگہ جگہ بے شمار زخموں کے نشان ہیں۔ جیسے اس کے جسم پر کسی تیز دھار کی چیز سے کٹ لگائے گئے ہوں۔ اس لڑکی کے کپڑے اس کے جسم پر پڑے ہوئے تھے۔ وہ پہنے ہوئے کچھ نہ تھی۔

اس لڑکی کو دیکھ کر اسے رات ہونے والے ڈرامے کے بارے میں کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ خون کے ''سرطان'' میں مبتلا اس کی ممی کو نیا خون کہاں سے دستیاب ہوا تھا۔ نہ جانے یہ معصوم لڑکی کون ہے؟ کس کی بیٹی ہے؟ اسے سوناں کہاں سے اٹھا کر لائی ہے۔ یہ ممی نے کیسا وحشت ناک کھیل رچایا ہے۔ اس کے دل میں اپنی ماں سے نفرت کا جو بیج موجود تھا وہ اب پھوٹنے لگا تھا۔

اس کے باپ پر خون پھینکنے کا وہ منظر بار ہا اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ جب بھی وہ منظر اسے یاد آتا اس کا دل کٹ کر رہ جاتا۔ ایک نفرت سی محسوس ہونے لگتی لیکن یہ نفرت لحاتی ہوتی۔ جیسے ہی برکھا اس کے سامنے آتی تو وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اس کے دل سے ہر نفرت نکل جاتی۔

اس لڑکی کو دیکھ کر نفرت کے سانپ نے پھر سر ابھارا تھا اور وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے۔ کسی نے گھر کی کال بیل بجائی۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ بے اختیار چونک گئی۔ اس نے اس لڑکی کو ویسے ہی چھوڑا چوکھٹ پر پاؤں رکھ کر کھڑکی سے باہر کودی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کیے اور تیزی سے بنگلے کے گیٹ کی طرف بھاگی۔

جب اس نے چھوٹا گیٹ کھول کر سر باہر نکالا تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔
دروازے پر ایک فقیر مسکین صورت بنائے کھڑا تھا' اللہ کے واسطے بی بی کچھ مدد کرو۔"
ورشا نے کوئی جواب دیئے بغیر دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا اور اپنے کمرے کی طرف چل
دی۔

☆.....☆.....☆

روزی کو غائب ہوئے آج تیسرا روز تھا۔
ان تین دنوں میں پولیس نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ وہ روزی کا سراغ لگانے میں ناکام رہی تھی۔ اخبار میں دو دن سے ایک بڑا اشتہار جس میں روزی کی تصویر بھی موجود تھی' تلاش گمشدہ کے عنوان سے شائع ہو رہا تھا لیکن ابھی تک کسی قسم کی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔
پورا گھر' پورا خاندان پریشان تھا' روزی پورے گھر کی لاڈلی تھی۔ ناصر مرزا تو اس پر جان دیتا تھا' وہ اس کی بیاری بھتیجی تھی۔ گھر میں وظیفے وظائف جاری تھے۔ جس کے ذہن میں جو تدبیر آ رہی تھی اس پر عمل کیا جا رہا تھا لیکن کہیں سے کوئی کامیابی کی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔
ناصر مرزا کی بھتیجی گم ہوئی تھی' ساحل عمر اور مسعود آفاقی کا پریشان ہونا فطری تھا۔ وہ تینوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔
اپنی اپنی سوچ کے مطابق اظہار خیال کر رہے تھے مگر کسی کی سمجھ میں روزی کے غائب ہونے کی وجہ نہیں آ رہی تھی۔ اگر یہ اغوا کا کیس تھا تو ابھی تک تاوان کیوں نہیں مانگا گیا تھا ایک خیال یہ بھی تھا کہ لڑکی ناراض ہو کر نہ کہیں چلی گئی ہو کیونکہ یہ عمر بڑی جذباتی ہوتی ہے لیکن ایسی بات بھی نہ تھی۔ روزی گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اس کے ناراض ہو کر کہیں چلے جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ لے دے کر بس اب یہی بات رہ گئی تھی کہ کہیں وہ عورت فروشوں کے ہتھے نہ چڑھ گئی ہو' کوئی عورت اسے ورغلا کر نہ لے گئی ہو۔
پھر اچانک ساحل عمر کو خیال آیا۔ اس نے ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر کہا۔
"بھائی' کیا اس سلسلے میں عابد منجم صاحب سے مدد نہیں لی جا سکتی۔"
"لی جا سکتی ہے۔"
ناصر مرزا کے چہرے پر خوشی آ گئی۔
"عابد منجم کا خیال ذہن میں آیا ہی نہیں۔"
"ان کے گھر چلیں!"
مسعود آفاقی نے فوراً کہا۔
"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہوں گے' وہ رات دس بجے تک دفتر میں ہوتے ہیں۔ دیر تک بیٹھنے کے عادی ہیں۔"
ناصر مرزا نے بتایا۔
"چلو ان کے دفتر چلتے ہیں۔"

"جانے سے پہلے ٹیلی فون پر چیک کر لیں۔"
ساحل عمر نے رائے دی۔
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔"
مسعود آفاقی نے فوراً تائید کی۔
پھر جب یہ تینوں دوست عابد منجم کے دفتر پہنچے تو وہ ان کے منتظر بیٹھے تھے۔ تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے پھر بولے۔
"یہ فنکاروں کا قافلہ کہاں گھوم رہا ہے۔"
"عابد صاحب' یہ دونوں تو واقعی فنکار ہیں۔"
ناصر مرزا نے مسعود کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"مجھے کہاں آپ نے کانٹوں میں گھسیٹ لیا۔"
"کانٹوں میں نہیں پھولوں میں گھسیٹا ہے۔ آپ کو بھی ہمارے ساتھ فنکار بنا دیا ہے۔"
مسعود آفاقی نے ہنس کر کہا۔
"عابد صاحب' اس وقت ہم ایک گھمبیر مسئلہ لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔"
ساحل عمر اصل موضوع پر آیا۔
"تعویذ تو تم نے گلے میں ڈالا ہوا ہے۔"
عابد منجم فکرمند ہو کر بولے۔
"جی یہ دیکھئے!"
ساحل عمر نے قمیض کے اندر سے نکال کر تعویذ دکھایا۔
"اس وقت میرا مسئلہ نہیں ہے۔"
"تو پھر.....!"
عابد منجم نے ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔
"عابد صاحب' میری بھتیجی کہیں گم ہو گئی ہے۔"
ناصر مرزا نے فوراً اصل بات بتائی۔
"ہیں....."
عابد منجم ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے۔
"یہ کب ہوا؟"
ناصر مرزا نے پورا واقعہ تفصیل سے ان کے گوش گزار کر دیا اور جو معلومات وہ روزی کے متعلق چاہتے تھے وہ بھی انہیں بتا دیں۔
ساری باتیں سن کر انہوں نے میز پر رکھی' پان کی ڈبیہ اٹھائی۔ بڑی نفاست سے ایک پان نکالا۔ بٹوے سے چھالیہ اور تمباکو وغیرہ نکال کر پان منہ میں رکھ لیا اور پان چباتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں' چند منٹ آنکھیں بند رکھیں۔ پھر بال پوائنٹ اٹھا کر کاغذ پر کچھ اعداد و شمار' زائچے اور نقشے

بنانے لگے۔ زائچے بناتے ہوئے کئی مرتبہ ان کے چہرے کا رنگ بدلا' تیوریوں پر بل پڑے۔ آنکھوں سے فکر جھانکی۔

ساحل عمران کے چہرے کے تاثرات بغور دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ گھمبیر ہے۔

پھر عابد منجم نے بال پوائنٹ میز پر رکھ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی دراز کھولی اور ایک خوبصورت سی تسبیح نکال کر وہ تسبیح کے دانوں پر کچھ پڑھنے لگے۔ پان انہوں نے ایک کلے میں دبا لیا تھا۔

پھر انہوں نے تسبیح کا ایک چکر مکمل کر کے تسبیح میز پر رکھی۔ ایک سفید اور سادہ کاغذ اٹھایا۔ اس کی چار تہہ کیں۔ اس کاغذ پر تین پھونکیں ماریں اور دائیں ہاتھ پر رکھی ایک کتاب کے درمیان رکھ دیا۔ کتاب پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کچھ پڑھا اور کاغذ کتاب کے درمیان سے کھینچ لیا۔

کاغذ کھول کر دیکھا۔ کچھ اس طرح دیکھا کہ جیسے اس پر کچھ لکھا پڑھ رہے ہوں۔ پھر انہوں نے کاغذ میز پر رکھ دیا۔ ساحل عمر نے ذرا اچک کر دیکھا۔ اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔

عابد منجم نے جلدی جلدی پان چبایا اور پھر اسے اگلدان میں تھوک کر انتہائی سنجیدگی سے بولے۔

''ناصر میاں' آپ کی بھتیجی اس شہر میں ہے' اسے ایک عورت نے اغواء کیا ہے۔ فی الحال وہ زندہ ہے لیکن اس کی بازیابی کے امکانات .....''

اتنا کہہ رک گئے۔ پھر افسردہ لہجے میں کہا۔

''بس میاں' اللہ سے دعا ہی کی جا سکتی ہے۔ وہی زندگی اور موت کا مالک ہے۔ وہی بچھڑوں کو ملانے والا ہے۔''

''عابد صاحب' میری بھتیجی کے بارے میں مکمل معلومات کیجئے۔ اس سلسلے میں آپ جو کہیں گے آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔''

ناصر مرزا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ناصر میاں' ہر آدمی کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں نے انہی حدود میں رہتے ہوئے جو کچھ بتا سکتا تھا بتا دیا ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ اللہ سے لو لگانے کی ضرورت ہے۔ بس دعا کریں کہ اللہ اس بچی پر ابنا رحم کرے۔'' عابد منجم نے کہا۔

''اچھا' ناصر تم کل صبح میرے گھر پر فون کرنا۔ مجھے رات کو وظیفہ پڑھنا پڑے گا۔''

عابد منجم نے پتہ نہیں ایسے ہی ان کی ڈھارس بندھانے کے لیے یہ بات کہہ دی یا واقعی وہ اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے تھے۔

چلو اتنا تو ہوا کہ روزی کے سلسلے میں بنیادی معلومات دستیاب ہو گئی تھیں۔ یہ بات بھی تسلی بخش تھی کہ وہ جہاں تھی' زندہ تھی۔ رہ گئی بازیابی کی بات تو عابد منجم نے اس سلسلے میں کچھ کہتے کہتے خاموشی اختیار کر لی تھی اور یہ بات تینوں کو ناگوار گزری تھی۔

☆.....☆.....☆

چھ سات دن ہو گئے تھے۔ ورشا سے نہ فون پر بات ہوئی تھی اور نہ ملاقات ہوئی تھی۔ عابد منجم کے سامنے اس کے گھر پر آئی تھی۔ عابد منجم نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ یہ ورشا نہیں ہے۔ ایسا کیسے ممکن تھا کہ ورشا کے جسم میں برکھا گھس جائے۔ یہ سارا کیا گورکھ دھندا تھا، وہ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اتنی بات اس کی سمجھ میں ضرور آ گئی تھی کہ برکھا ایک خطرناک عورت تھی، وہ ماہر ساحرہ تھی۔ اس کے سحر سے بچنا ضروری تھا۔ عابد منجم نے اس کی حفاظت کے لیے جو تعویذ دیا تھا، وہ اس نے گلے میں پہن لیا تھا۔

عابد منجم نے ورشا سے ملاقات کرنے سے بھی منع کیا تھا۔ ابھی تک خود ہی ورشا نے ٹیلی فون پر یا بالمشافہ کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ لہٰذا اس سے ملاقات سے انکار کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ویسے بھی وہ سوچتا تھا کہ اگر انکار کرنے کی نوبت آئی تو کیا وہ انکار کر سکے گا۔ وہ اس سے کہہ سکے گا کہ اب وہ اس سے نہیں ملے گا۔ یہ سن کر کیا وہ خاموشی سے ٹیلی فون بند کر دے گی۔ کیا وہ پلٹ کر پوچھے گی نہیں کہ میرے رانجھن ایسا مجھ سے کیا قصور ہوا کہ ترک تعلق پر اتر آئے۔ تب وہ اسے کیا جواب دے گا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے گا، اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، اس کے دل نے کہا، یہ ٹیلی فون ورشا کا ہے۔ اس نے ریسیور اٹھا کر "جی" کہا۔

"ہائے رانجھن۔"

ادھر واقعی ورشا تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"کیا قصور ہوا ہم سے ....."

"کچھ نہیں ....." ساحل عمر نے جواب دیا۔

"پھر اتنے دن ہو گئے، نہ فون کرتے ہو، نہ ملتے ہو۔" اس نے شکایت کی۔

"ورشا ایک بات پوچھ رہا ہوں، دیکھو سچ بتانا۔"

"چھ سات دن پہلے جب تم آئی تھیں تو پھر فوراً واپس کیوں چلی گئی تھیں۔"

"رانجھن، کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں سات دن پہلے تمہارے گھر کب آئی۔ میں تو تمہارے گھر نہیں آئی۔"

ورشا نے بڑے یقین سے کہا۔

"پھر وہ کون تھا۔ تم ہی تو تھیں ..... تم بھول رہی ہو، یاد کرو، تم نے میز پر سے اٹھا کر کیا پیا تھا۔

"رانجھن! تم یہ کیا کہہ رہے ہو میں تمہارے گھر آئی ہی نہیں تو پھر پینے یا نہ پینے کا سوال کیسا۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیا تم ساری بات مجھے تفصیل سے بتانا پسند کرو گے۔"

"ہاں! کیوں نہیں۔"

ساحل عمر نے یہ کہہ کر اس دن کی پوری روداد اس کے گوش گزار کر دی۔

ساری روداد سن کر وہ بڑی حیرت زدہ ہوئی۔ پھر ایک دم اس پر اداسی چھا گئی۔ چند لمحے

خاموش رہی گہرا سانس لینے کی آواز آئی اور پھر ایک دم مرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیا ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"چلو چھوڑو اس مسئلے کو بھول جاؤ اور سناؤ"

اس نے موضوع بدلا۔

"بس کیا سناؤں۔"

اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"دماغ ماؤف ہوتا جا رہا ہے۔"

"کیا ہوا؟ وہ چونک کر بولی۔

"بھئی وہ ہمارے ایک دوست ہیں ناصر مرزا..... تین دن سے ان کی بھتیجی غائب ہے۔"

"کتنی بڑی ہے۔ کیسے غائب ہوئی۔"

"ان کے بھائی' اپنی فیملی کے ساتھ کافنٹن کے پلے لینڈ گھومنے گئے تھے۔ بس وہیں سے وہ غائب ہو گئی۔ پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ اخبار میں اشتہار بھی آ رہا ہے لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ تیرہ چودہ سال کی لڑکی ہے اور اکلوتی بچی ہے۔" ساحل عمر نے بتایا۔

"اوہ' بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

"کس اخبار میں اشتہار ہے' میں دیکھوں گی۔ اس میں اس کی تصویر بھی ہو گی۔"

"انگریزی اور اردو کے تمام بڑے اخباروں میں یہ اشتہار موجود ہے۔ تصویر بھی ساتھ ہی ہے۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ ورشا دعا کرو کہ وہ بچی مل جائے۔"

وہ بھلا کیا دعا کرتی۔ وہ دعا کرنے کے قابل کہاں رہی تھی۔ ساحل عمر کی باتوں نے اسے خاصا الجھا دیا تھا۔ اس کے گھر میں دو اخبار آتے تھے۔ ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ ورشا کو اخبار پڑھنے کا زیادہ شوق نہ تھا بس وہ سرسری سے انداز میں نظر ڈالتی تھی۔ البتہ برکھا کو اخبار پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اخبارات کو بڑی دلچسپی سے پڑھتی تھی۔ آج کا ایک اخبار اٹھا کر اس نے صفحات الٹے تو وہ اشتہار اسے فوراً ہی نظر آ گیا۔ اس نے تصویر کو غور سے دیکھا تو اس کو کرنٹ سا لگا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو شاید اس وقت بھی برکھا کے کمرے میں موجود ہو۔ دو دن پہلے تو وہ یقیناً وہاں موجود تھی' اس نے خود اپنی آنکھوں سے اسے کمرے کے فرش پر بے ہوش پڑے دیکھا تھا۔

ابھی وہ اشتہار غور سے دیکھ ہی رہی تھی کہ برکھا اس کے کمرے میں دبے پاؤں آ گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا کہ ورشا کیا پڑھ رہی ہے۔

"ممی..... تم نے یہ اشتہار دیکھا۔" اس کی موجودگی محسوس کر کے ورشا نے گردن اٹھا کر پوچھا۔

"ہاں دیکھا ہے کوئی خاص بات..... اس شہر میں روز ہی لڑکیاں ادھر ادھر ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شہر میں ہلچل کس طرح پیدا ہو۔" برکھا نے بے نیازی سے کہا۔

"ممی جانتی ہو' یہ لڑکی کس کی بھتیجی ہے۔"

''نہیں۔'' برکھا ذرا چونکنا ہوئی۔

''ساحل عمر کے ایک دوست ہیں ناصر مرزا' یہ ان کی بھتیجی ہے۔''

''اچھا! تو یہ اس شکاری کی بھتیجی ہے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا' ایک تیر سے دو شکار ہو گئے۔'' وہ بے خیالی میں بولی۔

''ممی کیا مطلب؟'' ورشا کچھ نہ سمجھ پائی۔

''کچھ نہیں۔'' برکھا ٹال گئی۔

''ممی' کیا آپ بتا سکتی ہیں' اس لڑکی کو کس نے اغوا کیا ہے۔''

''ہاں' بتا سکتی ہوں' یہ بتانا میرے لیے کچھ مشکل نہیں لیکن تم اس لڑکی میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہو۔''

''بس ویسے ہی ممی۔

''اس میں یہ بتانے کی ہمت نہ تھی کہ اس نے اس لڑکی کو عملیات کے کمرے میں دیکھا ہے۔

''یہ لڑکی کل جھاڑیوں سے برآمد ہو جائے گی۔'' برکھا نے پیشگوئی کی۔

''مر گئی۔'' ورشا ایک دم چونک اٹھی۔

''ظاہر ہے' جب اس کے جسم میں ایک قطرہ خون کا نہیں رہے گا تو وہ مرے گی نہیں تو زندہ رہے گی۔'' برکھا نے ورشا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی لاپروائی سے کہا۔

''ممی کس نے مارا ہے اس کو۔'' ورشا نے پوچھا۔

''جس نے بھی مارا ہے ٹھیک مارا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ یہ ناصر کی بھتیجی تھی۔ اب اسے پتہ چلے گا۔ کیا تم جانتی ہو کہ تہکال کو میرے ہاتھوں سے نکالنے والا یہی شخص ہے۔ اس نے اسے آزاد کر دیا' مجھے مزید مشکل میں ڈال دیا۔ آہ' یہ کتنی اچھی بات ہوئی کہ یہ اس کی بھتیجی ہے' میں بہت خوش ہوں۔ تم نے مجھے بہت اچھی خبر سنائی۔ بولو کیا مانگتی ہو۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔

''کچھ نہیں ممی' مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ تم ہو نا میرے پاس۔'' ورشا نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ورشا' اب تمہیں میرے ساتھ بیٹھ کر کام سیکھنا ہو گا۔ مجھے تمہاری سخت ضرورت ہے۔ میں اکیلی کچھ نہ کر سکوں گی۔ تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ میں تمہیں ہر وہ عمل سکھا دوں گی جو میں جانتی ہوں۔ پھر میں تمہیں سالانہ اجتماع میں پیش کروں گی۔ اعور کا باپ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو گا اور فوراً تمہیں اپنی داسی بنا لے گا۔''

''ٹھیک ہے ممی' جیسی آپ کی مرضی۔'' ورشا نے انتہائی فرمانبرداری سے کہا۔

ورشا کی تمام سوچیں برکھا کے سامنے آتے ہی دم توڑ دیتی تھیں۔ برکھا سے نظر ملتے ہی وہ اپنا آپ بھول جاتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگتا کہ ممی جو کچھ کہہ رہی ہیں' ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

برکھا کی ''پیشگوئی'' کے مطابق روزی کی لاش دوسرے دن ایک ویران علاقے کی جھاڑیوں

سے برآمد ہوگی۔ برکھا تو خیر سب جانتی تھی۔ یہ سب کیا دھرا ہی اس کا تھا۔ البتہ عابد منجم نے جو کہا تھا' وہ بہت مبہم تھا لیکن اس ابہام میں بھی بہت کچھ واضح ویچ ثابت ہوا۔ اگرچہ عابد منجم نے جو کہا تھا'

تھا۔

برکھا نے روزی کی لاش واسم کے ذریعے جھاڑیوں میں پھنکوائی تھی اور پھر اسی نے ٹیلی فون کر کے متعلقہ تھانے میں روزی کی لاش کی اطلاع دی۔ ممکن تھا کہ روزی کی لاش کو بازیاب ہونے میں پانچ سات دن لگ جاتے لیکن برکھا چاہتی تھی کہ لاش جلد از جلد برآمد ہو جائے تاکہ لواحقین لاش پاکر رو دھو کر سکون سے بیٹھ جائیں۔ لاش نہ ملنے کی صورت میں برکھا کو خطرہ تھا کہ روزی کے متعلقین عالموں کے ذریعے اس تک نہ پہنچ جائیں۔ سب سے زیادہ خطرہ تو اسے عابد منجم سے تھا۔ وہ اس دن اس کی ایک جھلک دیکھ کر ہی اندازہ لگا چکی تھی کہ بندہ واقف کار ہے۔ کام کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

لاش برآمد ہوئی تو اس گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی جس گھر کی وہ بیٹی تھی اس کی موت کا ماں باپ کو جتنا دکھ ہوتا کم تھا لیکن وہ تو خاندان بھر کی لاڈلی تھی۔ سب سے زیادہ تو وہ ناصر مرزا کی بھتیجی تھی۔ اس کی لاش دیکھ کر وہ چند لمحوں کو ساکت رہ گیا۔ دل سے درد کی ایک لہر اٹھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اسے کسی تیز دھار آلے سے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے۔ جسم سے بے پناہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔

ناصر مرزا کا بس چلتا اور اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ کس درندے نے اس کی بھتیجی کی یہ حالت بنائی ہے تو وہ اس سے کہیں زیادہ اذیت دے کر اسے مار ڈالتا۔ اپنی معصوم بھتیجی کی لاش دیکھ کر اس کا خون کھول کر رہ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں طے کیا کہ وہ قاتل کا ہر ممکن طریقے سے پتہ لگانے کی کوشش کرے گا۔

پولیس سے تو کسی قسم کی امید رکھنا فضول ہی تھا۔ اگر کوئی شخص روزی کی لاش سے متعلق فون نہ کرتا تو پولیس تو اس کی لاش بھی برآمد نہ کر سکتی تھی۔ قاتل کا پتہ لگانا تو بہت دور کی بات ہے۔ ناصر مرزا کا ذہن بار بار عابد منجم کی طرف جاتا تھا ممکن ہے وہ اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکے۔ ویسے اس سے زیادہ امید وابستہ نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ وہ روزی کی گمشدگی کے بارے میں بھی زیادہ واضح جواب نہ دے سکا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک مرتبہ اس سلسلے میں عابد منجم سے بات ضرور کرے گا۔

روزی کی لاش ابھی گھر پر موجود تھی۔ مگر ناصر مرزا کے غصے اور بے قراری کا یہ عالم تھا کہ وہ روزی کی تجہیز و تکفین کا بھی انتظار نہ کر سکا۔ اس نے اسی وقت عابد منجم کو فون کیا۔

اس کا فون کرنا بہتر ہی ثابت ہوا' کیونکہ عابد منجم نے ساری بات سن کر جس چیز کی فرمائش کی اگر روزی کی تدفین ہو جاتی تو اس چیز کا مہیا کرنا ناممکن ہو جاتا۔

اس وقت روزی کو غسل دیا جا رہا تھا۔ ناصر مرزا نے اپنی بھابی کو بلا کر روزی کا ایک بال لانے کی ہدایت کی۔ بھابی نے اپنی بیٹی کا ایک بال ناصر مرزا کے حوالے کر دیا۔ ناصر مرزا نے اس بال کو ایک کاغذ میں لپیٹ کر بہت احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب یہی بال عابد منجم کے سامنے رکھا

ہوا تھا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ گھر کے تمام لوگ سو چکے تھے مگر وہ اپنے کمرے میں بیٹھے وظیفے میں مصروف تھے۔ اڑھائی بجے تک وہ وظیفے میں مصروف رہے۔

وظیفے سے فارغ ہو کر انہوں نے روزی کے بال کو اپنے بائیں ہاتھ کی چٹکی میں اٹھایا اور دائیں ہاتھ سے لائٹر جلا کر بال کو آگ دکھا دی۔

بال نے فوراً آگ پکڑ لی۔ وہ آناً فاناً جل گیا۔ بال جلتے ہی عابد منجم کی سماعت میں ایک بم گونجا اس نام کو تین بار بہت صاف لہجے میں دہرایا گیا۔ برکھا..... برکھا..... برکھا.....''

اس نام کو سن کر عابد منجم حیرت زدہ رہ گئے' ''روزی کی قاتل اور برکھا۔'' انہوں نے حیران ہو کر خود کلامی کی۔ اپنے وظیفے کی کامیابی پر وہ بہت خوش تھے اگرچہ انہیں امید نہ تھی کہ وہ قاتل کا نام پتہ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اوپر والے کی مہربانی سے وہ کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اس بات کی اطلاع فوری طور پر ناصر مرزا کو دے دی جائے۔

اگرچہ یہ فون کرنے کا وقت نہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ ادھر سے ناصر مرزا ضرور فون اٹھائے گا' لیکن وہ اپنی کامیابی پر خوش اس قدر تھے کہ اس راز کو فوراً اصل بندے تک منتقل کر دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ فون پر ٹرائی کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔

ابھی فون کی دوسری گھنٹی بھی پورے طور پر بج نہ پائی تھی کہ ناصر مرزا نے فون اٹھا لیا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا اور اپنے اسٹڈی روم میں تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں وظائف کی ایک بہت پرانی کتاب تھی۔ یہ اس کے دادا کے زمانے کی تھی۔ وہ اس کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر عابد منجم اس سلسلے میں کچھ نہ کر پایا تو وہ خود کوشش کر کے دیکھے گا۔

''ہیلو.....!'' ناصر مرزا گھمبیر آواز میں بولا۔

''ناصر میاں' میاں عابد بول رہا ہوں' عابد منجم''

''جی' عابد صاحب' آپ نے اس وقت فون کیا ہے تو یقیناً آپ کو اس سلسلے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔'' ناصر مرزا نے بے قراری سے کہا۔

''ہاں' میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ تم قاتل کا نام سنو گے تو اچھل پڑو گے۔''

''ہیں..... کیا میں اسے جانتا ہوں۔''

''نہ صرف جانتے ہو بلکہ اسے دیکھ بھی چکے ہو۔''

''فوراً آپ اس کا نام بتائیے..... میں اس کا خون پی جاؤں گا۔''

''ویسے وہ ہے بھی اس قابل کہ اس کا خون پی لیا جائے۔'' عابد منجم جذباتی ہو کر بولے۔ روزی کو قتل کرنے والی کا نام ہے برکھا.....''

''برکھا.....!'' اس نام کو سن کر وہ واقعی حیرت سے اچھل پڑا۔

''یہ عورت آخر چاہتی کیا ہے۔ یہ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔''

''ناصر میاں! وہ عورت بہت خطرناک ہے۔ کوئی جذباتی قدم نہ اٹھا لینا۔ اس کا حساب

کتاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔ کل تم میرے دفتر آجاؤ' وہاں اطمینان سے بیٹھ کر اس بارے میں کوئی لائحہ عمل طے کریں گے ٹھیک ہے۔''

''جی ٹھیک ہے' میں کل آپ کے دفتر آجاؤں گا۔''

برکھا نے آج واسم کو صبح ہی طلب کرلیا تھا۔ وہ کافی دیر سے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا اور برکھا اپنے کمرہ خاص میں براجمان تھی۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے کمرۂ خاص سے برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موبیے کا تر و تازہ ہار اور مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ وہ ان دونوں چیزوں کو لیکر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو واسم برکھا کو دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔

''بیٹھو واسم۔'' برکھا نے اپنی تیز چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''جی برکھا دیوی'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

برکھا نے دونوں چیزیں اس کے حوالے کرکے اچھی طرح سمجھا دیا کہ کیا کرنا اور کیسے کرنا ہے۔

واسم نے وہ ہار بہت احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ لیا۔ پھر دونوں چیزیں لیکر برکھا کے بنگلے سے نکل آیا۔ اس نے اپنی گاڑی کا رخ ''جائے واردات'' کی طرف موڑ دیا۔

مطلوبہ جگہ پہنچ کر اس نے گاڑی بلڈنگ کے نیچے پارک کی اور وہ دونوں چیزیں اٹھا کر اس بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اس بلڈنگ کے دوسرے فلور پر عابد منجم کا دفتر تھا۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بجے تھے اور وہ ابھی ابھی دفتر آئے تھے۔ دفتر کا ملازم شوکت کرسی ڈالے کمرے کے باہر بیٹھا تھا۔

واسم نے ایک نظر شوکت پر ڈالی اور کمرہ کھلا دیکھ کر وہ سیدھا کمرے میں داخل ہوگیا۔

عابد منجم نے ایک عجیب سے شخص کو اپنے دفتر میں بلا تکلف داخل ہوتے دیکھ کر ذرا ناگواری سے پوچھا۔ ''جی فرمایئے!''

واسم نے کوئی جواب دیئے بغیر مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھا اور کاغذ میں لپٹا ہوا ہار کھولنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ زہریلی ہوتی جارہی تھی۔

☆.....☆.....☆

"یہ کیا ہے؟" عابد منجم نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"سر آپ کی پیشگوئی سچ ثابت ہوگئی۔ سر آپ کو یاد نہیں ہوگا میں نے چھ ماہ پہلے آپ سے اپنی شادی کے بارے میں پوچھا تھا۔ آپ نے اس کا جواب اپنے رسالے میں دیا تھا۔ میری شادی کے بارے میں آپ نے جو پیشگوئی کی وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوگئی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری شادی زبیدہ سے ہو جائے گی دشمن چچا کی بیٹی سے .... لیکن آپ کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ اسی خوشی میں میں یہ تھوڑی سی مٹھائی اور پھولوں کا ہار لایا ہوں۔ سر اگر آپ اجازت دیں تو میں خود آپ کو یہ ہار پہنا دوں۔ سر یقین کریں میری خوشی اس طرح دوبالا ہو جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ میز کی بائیں جانب سے عابد منجم کی طرف بڑھا اور ابھی وہ جواب بھی نہ دے پائے تھے کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

"مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے کس پرچے میں آپ کے سوال کا جواب دیا تھا۔ چلیں آپ کی شادی ہوگئی۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ نے بلاوجہ تکلف کیا۔"

عابد منجم نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے ہار کی طرف ہاتھ بڑھایا اتارنے کے لیے۔

"سر! ابھی مت اتاریے گا۔ ذرا یہ تھوڑی سی مٹھائی اور چکھ لیں۔"

یہ کہہ کر واسم گفٹ پیپر میں پیک ہوا ڈبہ کھولنے لگا۔ ڈبہ کھولتے ہوئے وہ بار بار ہار کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ہار موتیے کی کلیوں کا تھا۔ ان کلیوں کے منہ سے اچانک خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ پورا ہار آناً فاناً سرخ ہو گیا تھا۔ واسم نے جب دیکھا کہ ہار پورا خون سے سرخ ہو چکا ہے تو ڈبہ عابد منجم کے بالکل قریب کر کے اسے کھول دیا اور کہا۔

"لیجیے سر، کھایئے مٹھائی۔"

عابد منجم نے کھلے ڈبے پر نظر کی۔ جو چیز برق رفتاری سے اس ڈبے سے برآمد ہو رہی تھی، اسے دیکھ کر عابد منجم کے ہوش اڑ گئے۔ اب انہیں اندازہ ہوا کہ برکھا نے ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے، لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

ڈبہ کھلتے ہی دس بارہ بچھو تیزی سے نکل کر عابد منجم پر چڑھ گئے اور ان بارہ بچھوؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا زہر عابد منجم کے جسم میں اتار دیا۔ یہ انتہائی زہریلے بچھو تھے۔

زہر اس قدر تیزی سے چڑھا کہ وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

واہم کو جب یقین ہو گیا کہ عابد منجم کا کام تمام ہو گیا ہے تو وہ بڑے اطمینان سے کمرے سے باہر نکل آیا اور باہر بیٹھے شوکت سے بولا۔

"اے سنو' دیکھو آدھے گھنٹے تک کوئی اندر نہ جائے' صاحب نے منع کیا ہے۔ وہ کوئی ضروری کام کر رہے ہیں۔"

"جی اچھا صاحب!" شوکت نے فرمانبرداری سے گردن ہلائی اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

واہم تیزی سے زینے کی طرف بڑھا اور جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسی وقت ناصر مرزا اوپر آ رہا تھا۔ دونوں کا ٹکراؤ سیڑھیوں پر ہوا' دونوں نے ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھا اور پھر دونوں اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔

جب ناصر مرزا' عابد منجم کے دفتر کے نزدیک پہنچا تو اس نے شوکت کو حسب معمول کرسی پر بیٹھا پایا۔ وہ ایک سیدھا سادہ ملازم تھا' اپنے کام سے کام رکھنے والا' ناصر مرزا سے وہ اچھی طرح واقف تھا' اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔

"کیوں بھئی شوکت کیسے ہو؟"

ناصر مرزا نے پوچھا۔

"صاحب جی! میں ٹھیک ہوں..... صاحب اندر ہیں' کچھ کام کر رہے ہیں۔"

شوکت نے بتایا مگر اسے یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی کہ آپ اندر مت جائیے۔

"اچھا میں دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ دفتر میں داخل ہو گیا۔

ابھی ناصر مرزا نے سلام کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ عابد منجم کی حالت دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ سفید شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں ہار تھا جو سرخی مائل تھا۔ شیروانی پر جگہ جگہ خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں اور میز پر ایک ڈبہ رکھا تھا جو بالکل خالی تھا۔

"شوکت"

ناصر مرزا نے گھبرا کر آواز دی۔

شوکت دوڑا ہوا اندر آیا۔ ناصر مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے عابد منجم کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ!"

"ارے' میرے صاحب کو کیا ہوا؟"

وہ جلدی سے عابد منجم کی طرف بڑھا۔

ناصر مرزا نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور پوچھا۔

"یہ کیسے ہوا؟"

"صاحب! خدا کی قسم مجھے کچھ نہیں معلوم۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک صاحب آئے تھے اور وہ سیدھے اندر آگئے تھے۔ کچھ دیر اندر رہے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ صاحب اندر کام میں مصروف ہیں اندر کوئی نہ جائے۔"

"لیکن تم نے تو مجھے اندر آنے سے نہیں روکا۔"

"صاحب! میں آپ کو اندر آنے سے کیسے روک سکتا تھا' کیا میں آپ سے واقف نہیں ہوں۔"

"جو صاحب اندر آئے تھے' وہ کیسے تھے۔"

ناصر مرزا نے پوچھا۔

"صاحب وہ کچھ عجیب سے تھے' مجھے تو ان کی صورت دیکھ کر ہی ڈر لگا۔ ابھی وہ کمرے سے نکل کر گئے ہیں۔ آپ کو وہ ضرور زینے میں ملے ہوں گے۔"

تب ناصر مرزا کو وہ تیزی سے اترتا ہوا شخص یاد آیا۔ وہ واقعی خبیث صورت شخص تھا لیکن وہ تھا کون؟ اور وہ یہ سب کیا کر گیا تھا۔

عابد منجم کی پراسرار موت نے شہر میں ہلچل مچا دی۔ وہ اس شہر کی جانی مانی شخصیت تھے۔ ان کے بڑے لوگوں سے تعلقات تھے۔ لوگ ان کے پاس اپنے مسائل لیکر آتے رہتے تھے۔ وہ اپنے فن کو لوگوں کو لوٹنے کھسوٹنے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ ایک مثبت آدمی تھے۔ دولت کا لالچ ذرا بھر بھی نہ تھا۔

پولیس نے اس کیس میں خاصی سرگرمی دکھائی لیکن تفتیش آگے نہ بڑھ سکی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ ظاہر ہوا کہ عابد منجم کی موت ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے ہوئی جبکہ ناصر مرزا نے ایف آئی آر میں واضح طور پر یہ درج کروایا کہ عابد منجم کو قتل کیا گیا ہے۔

پولیس نے اس بات کو محض ایک مفروضہ قرار دیا۔ جس صورت حال میں عابد منجم کی موت واقع ہوئی' وہ صورت حال یقیناً پراسرار تھی۔ گلے کا ہار اور شیروانی پر پڑے خون کے دھبے کسی انوکھی بات کے مظہر ضرور تھے لیکن وہ آلہ قتل نہ تھے۔ آلہ قتل تو اس صورت میں تلاش کیا جاتا جب ان کی موت کا سبب حرکت قلب بند ہو جانا نہ ہوتا۔

ناصر مرزا کو عابد منجم کی موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ اسے اس بات کا پکا یقین تھا کہ اس واردات میں برکھا کا ہاتھ ہے لیکن یہ ایسی بات نہ تھی جسے سرعام نہیں کہا جاسکتا تھا۔ عابد منجم جاتے جاتے اس کی جیتی کی قاتلہ کی نشاندہی کر گئے تھے۔ وہ ان سے مل کر روزی کی موت کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ منصوبہ بندی کرنے آیا تھا لیکن برکھا نے عابد کو اپنے بارے میں انکشاف کرنے کی فوری طور پر سزا دے دی تھی۔

ناصر مرزا اب اس میدان میں تنہا رہ گیا تھا' لیکن وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہ تھا۔ اپنا بگاڑ ڈھونڈ کر مارنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔

دن کا وقت تھا اس وقت گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ ساحل عمر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا

چائے پی رہا تھا اور ایک میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ یہ ایک خاص وقت تھا۔ اگرچہ اب یہ وقت خاص نہ رہا تھا۔ ورشا اب کسی وقت بھی بات کر لیا کرتی تھی۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ ورشا کا فون نہ ہو۔ اماں کچن میں مصروف تھیں۔ مرجینا گھر کی جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا' وہ خود ہی ٹیلی فون اٹینڈ کر لے۔

اپنے بیڈ روم میں جا کر اس نے ریسیور اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں "جی" کہا۔

"ہائے رانجھن!"

ورشا کی کھنک دار ہنسی سنائی دی۔ یہ وہ ہنسی تھی جو اس کی سماعت میں رس گھول دیتی تھی۔

"ہاں ورشا کیسی ہو؟"

ساحل عمر نے پوچھا۔

"میں مروں یا جیوں' تمہیں کیا؟"

اس نے شکوہ کیا۔

"کیا ہوا؟"

"مجھے دوست کہتے ہو لیکن سمجھتے نہیں' اسی لیے دوستوں کا سا سلوک نہیں کرتے۔"

"آخر ہوا کیا؟"

"خیر ایسا تو نہیں۔"

"ایسا ہی ہے' میرے رانجھن ایسا ہی ہے۔ تم ایک بے مروت شخص ہو یا شاید اب تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔"

ورشا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

یہ بات ٹھیک تھی کہ ساحل عمر اب واقعی اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سے عابد منجم کی موت ہوئی تھی اور اس موت میں برکھا کا ہاتھ نظر آرہا تھا' تب سے وہ اور محتاط ہو جانا چاہتا تھا لیکن عملاً وہ ایسا کر نہیں سکا تھا جب ورشا کا فون آجاتا تو وہ اس کی آواز سن کر یہ بھول جاتا کہ یہ وہ لڑکی ہے جس سے آئندہ نہیں ملنا۔ ملنے سے انکار تو دور کی بات ہے وہ نہ ملنے کا کوئی بہانہ بھی نہیں بنا پاتا تھا۔ اس کا فون آنے پر وہ کسی سدھے ہوئے شیر کی طرح اس کے قدموں میں جا بیٹھتا۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ باوجود انکار کی خواہش رکھنے کے وہ یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں' اب میں تم سے ملنا نہیں چاہتا بلکہ اس نے کہا۔

"بھلا' ایسا ہو سکتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں' تم کبھی مجھ سے ملنے سے انکار نہیں کر سکتے۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولی' اس کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

"ایسا کیوں؟"

ساحل عمر نے سادگی سے پوچھا۔

"ایسا' اس لیے میرے رانجھن کہ میں تمہارے اندر گھسی ہوں' تمہارے دل میں ...... میں

تمہارے خون میں گردش کرتی ہوں۔"

وہ شرارت آمیز انداز میں ہنسی۔

"یہ بات تو شیطان کے بارے میں سنی ہے کہ وہ انسان کے خون میں گردش کرتا ہے۔"

ساحل عمر نے کہا۔

"چلو شیطان سمجھ لو مجھے ..... تم جانتے ہو کہ میں شیطان کو کس قدر پسند کرتی ہوں۔"

"کہیں میرے اندر بھی تو تمہیں کوئی شیطان نظر نہیں آتا۔"

"تم تو بڑے شیطان ہو۔"

اس نے یہ بات بڑے پیار بھرے لہجے میں کی اور زور سے ہنس پڑی۔ پھر چند لمحے توقف کر کے بولی۔

"اچھا 'ہاں کہیں باتوں باتوں میں میں اصل بات نہ بھول جاؤں۔"

"اصل بات .... وہ کیا؟"

"تمہیں آج ممی نے بلایا ہے۔"

"چائے پر۔"

اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں یونہی سمجھو۔"

ورشا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آؤ گے ناں۔"

"تمہاری ممی سے میں آج تک نہیں ملا' پتہ نہیں ان سے ملتے ہوئے دل کیوں ڈر رہا ہے۔"

"میری ممی بہت پیاری ہیں۔ آج تم ان سے ملو گے تو سارا ڈر دور ہو جائے گا۔ پھر انہی کا کلمہ پڑھنے لگو گے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اچھا!" ساحل عمر نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ممی آج ساڑھے چار بجے تمہارا انتظار کریں گی۔ آؤ گے ناں۔"

"میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا۔"

ساحل عمر نے بتایا۔

"میں تمہیں خود لینے آؤں گی۔"

اس نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔"

وہ راضی ہو گیا۔

پھر وہ پروگرام کے مطابق وقت مقررہ پر اسے لینے آ گئی۔ ساحل عمر نے خود جا کر گھر کے گیٹ پر اس کا استقبال کیا۔ آج وہ جینز اور شرٹ میں تھی۔ جینز اور شرٹ میں ساحل عمر نے اسے پہلی

بار دیکھا تھا۔

وہ بے حد اسمارٹ لگ رہی تھی۔ وہ جس طرح کا چاہے کپڑا پہن لیتی۔ اس پر لباس کھل اٹھتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ورشا نے بے تکلفی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"ہائے راجھن!"

"ہائے ورشا!"

ساحل عمر نے اس کا نرم ملائم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"آؤ!"

مگر میں آکر اس نے اماں سے سلام دعا کی اور پھر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گئی جبکہ ساحل عمر کا خیال تھا کہ وہ بیڈ روم میں جاکر بیٹھے گی۔ ساحل عمر کا خیال ٹھیک تھا' وہ واقعی بیڈ روم میں جاکر دم لیتی لیکن وہاں رشا ملوک کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس تصویر سے وہ الرجک تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر اس کے دل میں آگ سلگ اٹھتی تھی۔

ٹی وی لاؤنج کے ایک صوفے میں دھنس کر اس نے ساحل عمر کی طرف ایک خاص انداز سے دیکھا پھر تھوڑا سا مسکرائی جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ساحل عمر نے اپنی بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"جی فرمایئے! کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔"

"کوئی تصویروں کی البم نہیں ہے' تمہارے پاس۔"

"بے شمار البم ہیں..... لیکن تم کیا دیکھنا چاہ رہی ہو۔"

"سچ بتا دوں۔"

ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں' ضرور سچ بولنے میں کیا حرج کیا۔"

وہ مسکرا کر بولا۔

"مجھے تمہاری ایک تصویر چاہئے۔"

وہ ذرا جھجکتی ہوئی بولی۔

"میری تصویر لیکر کیا کرو گی' میری تصویر مجھ سے اچھی تو نہیں۔" وہ ہنسا۔

"ٹھیک کہا تم نے..... تمہاری تصویر واقعی تم سے اچھی نہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم ہر وقت تو میرے پاس نہیں ہوتے۔ پھر میں کیا کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ہر وقت میرے پاس رہو۔ تم تصویر کی صورت میں ہی میرے پاس ہو سکتے ہو۔ تمہاری تصویر میرے پاس ہو گی تو جب دل چاہے گا۔ اسے نکال کر دیکھ لوں گی۔ تم سے وہ باتیں کر لوں گی جو میں تم سے کہہ نہیں پاتی۔"

اس نے خلاف معمول نظریں جھکا کر کہا۔

"پھر تو میں تمہیں اپنی تصویر نہیں دوں گا۔"

ساحل عمر نے انکار کیا۔

''کیوں آخر؟''

وہ چونک کر بولی۔

''پھر میں وہ باتیں کیسے سنوں گا جو تم میری تصویر سے کرو گی' تمہارے پاس میری تصویر نہ ہو گی تو مجبور ہو کر ایک نہ ایک دن تم وہ باتیں مجھ سے کرنے لگو گی۔

''ہرگز نہیں۔''

ورشا نے بڑے یقین سے کہا۔

''تم چاہے' مجھے اپنی تصویر دو یا نہ دو۔ وہ باتیں میں تم سے ہرگز نہیں کر سکتی۔ وہ خاص پرائیویٹ باتیں میں تم سے ہرگز نہیں کر سکتی۔ وہ خاص پرائیویٹ باتیں ہیں جو تمہاری تصویر سے کی جا سکتی ہیں' تم سے نہیں۔''

ورشا نے یہ کہہ کر کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ ساحل عمر کو اپنی آنکھیں جھکاتے ہی بنی۔

''اچھا' پھر میں تمہیں البم دکھانے کے بجائے اپنی لے ٹیسٹ اتری ہوئی تصویریں دکھائے دیتا ہوں ان میں سے کوئی پسند کر لینا۔''

ساحل عمر اٹھتے ہوئے بولا۔

''بالکل ٹھیک! ورشا ایک دم خوش ہو کر بولی۔

''یوں تو میرا جی چاہ رہا تھا کہ تمہاری ساری البمیں دیکھوں لیکن اس وقت جلدی ہے۔ ممی گھر پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ پھر کسی دن آ کر ساری تصویریں دیکھوں گی۔''

ساحل عمر نے چار پانچ نئی اتری ہوئی تصویروں کا لفافہ لا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ تصویریں دو ماہ پہلے مسعود آفاقی نے بنائی تھیں۔

یہ ساری تصویریں دس بارہ سائز میں تھیں۔ ورشا نے جو تصویر پسند کی وہ فرنٹ سائیڈ کلوز اپ تھا۔ وہ اس تصویر کو بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ تصویر لے لوں۔''

''لے لو''

ساحل عمر نے باقی تصویریں لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا بس' پھر چلو' ممی انتظار کر رہی ہوں گی۔''

وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ تصویر اس نے اپنے بیگ میں حفاظت سے رکھ لی تھی۔

''کچھ چائے وائے نہیں پیو گی؟''

ساحل عمر نے پوچھا۔

''چائے تو وہاں پیئں گے۔''

ورشا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

''آج میری ممی نے تمہیں چائے پر بلایا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں ہنس دی۔
"چلو پھر!"
ساحل عمر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
وہ ٹھیک ساڑھے چار بجے بنگلے پر پہنچ گئے۔ گیٹ پر پہنچ کر ورشا نے ایک مخصوص انداز میں ہارن دیا۔ تھوڑی دیر بعد جس عورت نے گیٹ کھولا' وہ بر کھا نہ تھی۔ وہ سوناں تھی۔
سوناں نے ان دونوں کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ ساحل عمر نے سوالیہ نگاہوں سے ورشا کی طرف دیکھا۔
"یہ سوناں ہے۔ میری ممی کی خادمہ خاص ہے۔"
ورشا نے اس کی نگاہوں کا سوال سمجھ کر جواب دیا۔
"واقعی خاص ہے۔"
ساحل عمر نے تعریف کی۔
"تم نے اسے کس نظر سے دیکھا۔"
ورشا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔
"اپنی نظر سے۔"
اس نے ایک معنی خیز جواب دیا۔
"ہو سکے تو آئندہ اپنی نظروں کو نیچی رکھنا' میں کسی کی تعریف برداشت نہیں کر سکوں گی۔"
ورشا نے گاڑی سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔
"آدمی کو اس قدر جیلس نہیں ہونا چاہیے۔"
ساحل عمر گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔
"تم جانتی ہو کہ میں آرٹسٹ آدمی ہوں۔ کسی بھی اچھی چیز کو دیکھ کر اس کے لیے اچھے الفاظ خود بخود زبان پر آجاتے ہیں۔"
"میرے رانجھن' زبان پر قابو پانا سیکھیے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میرے لیے ہو۔"
وہ ایک ادائے خاص سے بولی۔
"اگر ایسا نہ ہوا تو سزا دوں گی"
"پھر تو شاید ساری زندگی سزا کاٹنے میں ہی گزر جائے گی۔
وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔
"اتنے میں سوناں ان کے نزدیک آگئی تو باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ورشا نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔
"سوناں ممی کہاں ہیں؟"
"وہ اپنے کمرے میں ہیں۔"

سوناں نے بڑے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"آپ صاحب کو لیکر ڈرائنگ روم میں چلئے میں انہیں اطلاع دیتی ہوں۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔"

ورشا نے سوناں کو جواب دیا' پھر وہ ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔

"آؤ' میرے راجھن۔"

"ورشا' تم کہاں رہتی ہو؟"

ساحل عمر کا سوال سن کر وہ سمجھ نہ پائی کہ اس کے جملے کا مطلب کیا ہے۔ اس نے الجھی نظروں سے اسے دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"کیا مطلب؟"

اصل میں ساحل عمر جیسے ہی اس بنگلے کے احاطے میں داخل ہوا اور اس نے بنگلے کی عمارت پر ایک نظر ڈالی تو اسے اس بنگلے کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی محسوس ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے وہ بھوتوں کے مسکن میں چلا آیا ہو۔ ایک تو یہ بنگلہ پرانے انداز کا بنا ہوا تھا۔ اوپر سے خستہ حال تھا۔ اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ظاہری حالت کے ساتھ اس کی اندرونی کیفیت بھی وحشت ناک تھی۔ اسی لیے ساحل عمر نے ورشا سے پوچھا تھا کہ تم کہاں رہتی ہو؟

اس کا خیال تھا کہ ورشا جیسی لڑکی کو کسی ماڈرن بنگلے میں ہونا چاہئے تھا۔ اس کی رہائش گاہ دیکھ کر ساحل عمر کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔

"یہ علاقہ' یہ بنگلہ اور تم جیسی لڑکی ..... ان تینوں چیزوں میں کوئی مناسبت نہیں۔"

اس کی رہائش گاہ دیکھ کر ساحل عمر نے اپنی بات واضح کی۔

"اس میں میرا کوئی قصور نہیں' میری ممی کو یہ گھر بہت پسند ہے' وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ میرا تو بہت جی چاہتا ہے کہ میں کلفٹن چلی جاؤں۔"

ورشا نے اپنے دل کی بات ظاہر کی۔

"تمہاری ممی میں کوئی پرانی روح گھسی ہوئی معلوم ہوتی ہے؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

"مجھے حیرت ہے آپ دونوں اتنے بڑے اور ویران سے بنگلے میں کس طرح رہتی ہیں۔"

اس سے پہلے کہ ورشا کوئی جواب دیتی سوناں اچانک ڈرائینگ روم کے دروازے پر نمودار ہوئی اور با آواز بلند بولی۔

"برکھا دیوی آرہی ہیں۔"

برکھا کے آنے کا سوناں نے کچھ اس طرح اعلان کیا جیسے کسی ملک کی ملکہ معظمہ تشریف لا رہی ہوں۔ ورشا کو بھی یہ بات عجیب محسوس ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے' وہ کسی وقت کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہے۔ وہ ڈرامہ باز عورت تھی۔ اسے ڈرامہ کر کے بڑا مزہ آتا تھا۔

ساحل عمر تھوڑا سا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک

شعلہ سا لپکا۔ ساحل عمر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ سرخ ساڑھی میں ایک سفید بدن کی پرکشش عورت دروازے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس نے اچھا خاصا میک اپ کر رکھا تھا۔ بغیر آستین کا چھوٹا بلاؤز پہنے ار فلمی اداکاراؤں کی طرح نیچی ساڑھی باندھے' وہ کسی فلم کی ہیروئن بننے کی کوشش میں تھی۔ برکھا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی بجی ہوئی تھی اور آنکھیں کسی ناگن کی طرح چمک رہی تھیں۔

ورشا کو ماں کا اس طرح فل میک اپ اوز نیم عریاں انداز میں آنا اچھا نہ لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی ممی اس کے ور کے بجائے اپنے ور سے ملنے آئی ہو۔ یہ اس کی ماں کو دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔

"بیٹھو۔"

برکھا نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ انداز میں بڑی تمکنت تھی۔

"جی' شکریہ۔"

"کیسے ہو ساحل۔"

برکھا نے پروقار لہجہ بنانے کی کوشش کی۔

"جیسا ہوں' آپ کے سامنے ہوں۔"

ساحل عمر نے سیدھے لہجے میں جواب دیا۔

"تم ویسے نہیں ہو' جیسا میں دیکھنا چاہتی ہوں' تم ویسے بن جاؤ' جیسا میں چاہتی ہوں۔"

"پتہ نہیں جی' آپ کیا فرما رہی ہیں؟"

ساحل عمر نے برکھا کے بجائے ورشا کی طرف دیکھا۔

"تم نے مجھے پہچانا؟"

برکھا نے عجب لہجے میں سوال کیا۔

"ظاہر ہے آپ ورشا کی ممی ہیں۔"

ساحل نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو خیر میں ہوں۔"

برکھا نے بے نیازی سے کہا۔

"لیکن میں تمہیں عمر عابد صاحب کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانتی ہوں۔"

اپنے والد کا نام سن کر ساحل عمر بے اختیار چونک گیا۔ اس کے والد کا نام تو شاید ورشا کو بھی معلوم نہ تھا۔

"حیرت ہے' آپ میرے والد کو کیسے جانتی ہیں۔"

"تمہارے والد اس بنگلے پر آ چکے ہیں۔"

برکھا نے ایک اور انکشاف کیا۔

"ان کا کوئی مسئلہ تھا۔ جو میں نے حل کر دیا تھا۔ پھر ایک دن ان سے میری ملاقات الفنسٹن اسٹریٹ پر ہوئی تھی۔ تم ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے میرا تم سے تعارف کرایا تھا۔ تمہیں کہاں

یاد ہو گا۔ کافی پرانی بات ہے۔ تم خاصے چھوٹے تھے۔"

اس نے کہا۔

"جی مجھے یاد نہیں۔"

ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"لیکن مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔"

برکھا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ورشا تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔ ہر وقت تمہارے گن گاتی ہے لیکن کبھی بات یہ ہے کہ یہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی' نہ تم خود اپنے بارے میں جانتے ہو کہ تم کیا ہو' صرف میں جانتی ہوں کہ تم کیا ہو؟ تم میرے لیے کتنے اہم ہو۔"

"میں آپ کے لیے کیوں اہم ہوں؟"

ساحل عمر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میری وجہ سے۔"

ورشا بے اختیار بولی۔

"شاید"

برکھا نے ایک لفظ بول کر ورشا کو بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ ورشا کے چہرے پر ایک اداسی سی چھا گئی۔ برکھا نے ورشا کو گہری نظر سے دیکھا اور پھر ساحل عمر سے مخاطب ہو کر بولی۔

"میں تمہیں کیسی لگی؟"

عجیب سوال تھا' ساحل عمر پریشان ہو کر رہ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہاں ورشا کے لیے نہ آیا ہو برکھا کے لیے آیا ہو۔ جیسے برکھا' ورشا کی بیٹی ہو۔ ورشا اپنی ماں کی حرکتوں پر مسلسل شرمندہ ہو رہی تھی لیکن برکھا کو کسی کی پروا نہ تھی۔

آپ بہت اچھی ہیں۔"

بالآخر ساحل عمر کو کہنا پڑا' اگر وہ یہ نہ کہتا تو پھر کیا کہتا۔

"شکریہ' ساحل' اب میں چلتی ہوں۔ آپ ورشا کے ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں۔ مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے' ورنہ میں تم لوگوں کے ساتھ کچھ دیر اور بیٹھتی۔ امید ہے کہ تم مائنڈ نہیں کرو گے۔"

"کوئی بات نہیں۔"

ساحل عمر نے سرسری انداز میں کہا جیسے اس کے چلے جانے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو۔

"ورشا" برکھا اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی۔

"جی ممی!" وہ جلدی سے بولی۔

"دیکھو' ساحل کو بغیر چائے پلائے نہ جانے دینا۔ یہ ہمارے گھر آئے ہیں۔ ہمارے لیے

بڑے انداز کی بات ہے۔ یہ ملک کے بہت بڑے آرٹسٹ ہیں۔"

یہ کہہ کر برکھا ڈرائنگ روم سے جانے لگی' پھر جاتے جاتے ورشا سے بولی۔

"ورشا ایک منٹ ذرا میری بات سننا۔"

"جی ممی آئی۔"

ورشا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"ساحل ایک منٹ۔"

گویا اس نے اس سے اجازت لی۔

"ہاں ٹھیک ہے ورشا' آپ ممی کی بات سن لیں۔"

ساحل عمر نے خوش اخلاقی سے کہا۔

برکھا دروازے پر جا کر رک گئی۔ جب ورشا قریب آگئی تو اس نے بہت آہستہ سے پوچھا۔

"کام ہوا؟"

"جی ممی' ہو گیا۔"

ورشا نے دور بیٹھے ساحل عمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شاباش' میری جان!"

برکھا نے ورشا کے دونوں گال تھپتھپائے۔ وہ ایک دم خوش ہو گئی تھی۔

"ممی' آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

ورشا نے ہمت کر کے پوچھا۔

"آپ نے ساحل کو بلایا تھا۔"

"ایک ارجنٹ کال پر مجھے جانا پڑ رہا ہے۔ میرے جائے بغیر مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ تم اس کے پاس بیٹھو' اسے چائے وائے پلاؤ۔ سوناں گھر میں ہے۔ میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔ ٹھیک میری جان۔"

"اچھا ممی بائی۔"

ورشا نے بلند آواز میں کہا اور ساحل عمر کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی۔

اسے پیاری نظروں سے دیکھا ہلکا سا مسکرائی اور پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"دیکھا میری ممی کو؟"

"بھئی' تمہاری ممی خوب ہیں۔ اس عمر میں بھی چیک لگتی ہیں۔"

"کیا مجھ سے بھی زیادہ چیک۔"

یہ کہہ کر اس نے شرارت آمیز لہجے میں ساحل کو دیکھا اور پھر زور سے ہنس پڑی۔

"تم سمندر کی لہر ہو۔"

وہ بولا۔

"اور ممی۔"

اس نے پوچھا
"وہ بھی سمندر کی لہر ہیں۔"
"واہ یہ کیا بات ہوئی۔"
وہ خفگی سے بولی۔
"وہ بھی لہر میں بھی لہر۔"
"ہاں، مگر دونوں میں فرق ہے۔"
"اچھا وہ کیا؟"
"تم سمندر کی اٹھتی ہوئی لہر ہو اور تمہاری ممی جاتی ہوئی لہر۔"
ساحل عمر نے ہنس کر کہا۔ اس کی وضاحت سن کر وہ بھی ہنسنے لگی۔

☆......☆......☆

ساحل عمر کی تصویر دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ ورشا نے یہ لاجواب کام کیا تھا۔ اس نے بہت صاف اور واضح تصویر حاصل کی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر برکھا کی باچھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے اس تصویر پر بے اختیار اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے اور پیار بھرے لہجے میں بولی تھی۔
"میرا ماٹا!"
اس وقت برکھا اپنے
"آپریشن تھیٹر" میں موجود تھی۔ ورشا بھی اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے ورشا کو بہت سے عمل سکھا دیئے تھے۔ شروع شروع میں تو ورشا نے ان عملیات میں کوئی دلچسپی نہ لی لیکن جب اس نے اس سفلی علم کے اثرات دیکھے تو وہ خود بخود لائن پر آ گئی۔ اس وقت وہ برکھا کی دائیں جانب کی معمول کی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔
برکھا کے ہاتھ میں ساحل عمر کی تصویر موجود تھی، وہ دھیرے دھیرے کچھ پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے زمین پر ایک دائرہ بنایا اور اس تصویر کو اس نے دائرے میں رکھ دیا۔
پھر اس نے دائیں جانب مڑ کر ورشا کو دیکھا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر اٹھی اور کارنس پر رکھے شیشے کے پیالے کو اٹھا لائی۔ اس پیالے میں ایک سرنج رکھی تھی۔ پیالہ دے کر ورشا پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ برکھا نے اس کے بلاؤز کے دو چار بٹن کھول دیئے۔ اس کی پیٹھ پر بنا بچھو صاف دکھائی دینے لگا۔ برکھا نے سوئی بچھو کے منہ پر رکھی اور ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ سوئی کھال میں گئی تو ورشا نے سسکاری بھری۔
برکھا نے آدھی سرنج کے قریب ورشا کا خون نکال لیا اور پھر روئی کے ذریعے اس نے اس خون کو ساحل عمر کی پوری تصویر پر اچھی طرح مل دیا اور اس کے بعد اس نے ورشا سے باہر جانے کو کہا۔ ورشا کسی معمول کی طرح خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا اور جاتے جاتے کمرے کا دروازہ بھیڑ گئی۔
ورشا کے باہر جانے کے بعد وہ ساحل عمر کی تصویر پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی۔ یہ عمل آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ جب یہ عمل ختم ہوا تو اس کمرے کے چاروں کونوں سے بچھو نکل کر آنے لگے۔ برکھا نے فوراً اس تصویر کو دائرے میں رکھ دیا اور خود دائرے سے دور ہو کر بیٹھ گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بچھوؤں نے تصویر کو اچھی طرح ڈھک لیا۔ جب پوری تصویر پر بچھو اچھی طرح چھا گئے تو برکھا کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ آہستگی سے اٹھ گئی۔ کمرے سے باہر نکل کر اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا اور پھر اس میں ایک بڑا سا تالا ڈال دیا۔

پھر اس نے ورشا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ آرام سے لیٹی ایک رسالہ دیکھ رہی تھی۔ ماں کو کمرے میں جھانکتا پا کر اس نے پوچھا۔

"کیا رہا ممی۔"

برکھا نے خوش ہو کر کہا' پھر وہ پورے اطمینان سے اپنے کمرے میں جا کر پاؤں پھیلا کر سو گئی۔

برکھا کے جانے کے بعد اس نے رسالہ ایک طرف رکھ کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے بارہ بجے کا عمل تھا۔ اس نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ لیا۔ سوچنے لگی کہ اسے فون کرے یا نہ کرے۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔ ممکن ہے ساحل سو چکا ہو۔ نہ بھی سویا ہو تو یہ کسی کے گھر فون کرنے کا مناسب وقت تو نہ تھا۔

پر اس کا دل نہ مانا۔ اس نے سمجھایا کہ فون کر کے دیکھ لینے میں کیا حرج کیا۔ اگر وہ جاگ رہا ہو گا اور بات کرنے کے موڈ میں ہو گا تو بات کرے گی ورنہ "ہیلو ہائے" کر کے فون بند کر دے گی۔ یہ سوچ کر اس نے دوبارہ ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھایا ٹیلی فون کو اپنی گود میں رکھ کر ساحل عمر کا نمبر ڈائل کیا۔

جلد ہی اسے ساحل عمر کی مخصوص انداز میں "جی" سنائی دی۔

"ہائے رانجھن۔" اس نے بڑے میٹھے لہجے میں اسے پکارا۔

"اوہ' یہ تم ہو؟"

ساحل عمر نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔

"کیا کر رہے تھے؟"

"سچ بتاؤں۔"

اس نے پوچھا

"ہاں' پلیز۔"

"جانے کیوں ابھی ابھی تمہارا خیال آیا تھا۔ تم بے اختیار یاد آئی تھیں۔"

"شکر ہے ..... میں تمہیں یاد تو آنے لگی۔"

"پتہ نہیں' اس وقت میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ فوراً تم سے ملوں' تم سے بات کروں۔ اتنے میں تمہارا فون آ گیا۔"

"اس کیفیت کو جانتے ہو' کیا کہتے ہیں۔"

ورشا نے پوچھا۔

''نہیں' میں نہیں جانتا۔''

ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''اس کیفیت کو محبت کہتے ہیں..... تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔''

وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

''ورشا' میں الجھ گیا ہوں۔''

ساحل عمر کچھ پریشان سا تھا۔

''ہاں' میری زلفوں میں الجھ گئے ہو' میری زلفوں کے اسیر ہو گئے ہو۔''

اپنی دھن میں مگن تھی۔

''کچھ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ میرے دل میں عجب وسوسے اٹھ رہے ہیں' میرے دل پر بادل سے چھائے ہیں۔ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ اچھا ورشا میں تم سے پھر بات کروں گا۔''

ساحل عمر نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا' اس نے ورشا کا جواب سننے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ ورشا ریسیور تھامے کچھ دیر یونہی سکتے کے سے عالم میں بیٹھی رہی' پھر اس نے ایک گہرا سانس لیکر ریسیور رکھ دیا۔ پھر لائٹ بجھا کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

برکھا کو آج صبح تڑکے ہی اٹھنا تھا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی کمرے میں جانا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی ہوئی چاپ والے کمرے کی طرف چل دی۔

اس نے کمرے کا بڑا سا تالا کھولا اور بے تابی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اب وہاں ایک بھی بچھو نہ تھا۔ برکھا نے جھک کر ساحل عمر کی تصویر اٹھالی اور جب اس نے خوش ہو کر اس کی تصویر پر نظر ڈالی تو خوشی ایک دم اداسی میں بدل گئی۔

برکھا کو زبردست حیرت کا جھٹکا لگا۔

☆.....☆.....☆

حیرت کا جھٹکا آخر کیوں نہ لگتا؟ کام ہی کچھ ایسا ہوا تھا۔

اس نے یہ سوچ کر تصویر اٹھائی تھی کہ ساحل عمر کی تصویر غائب ہو چکی ہوگی' وہاں صرف سادہ کاغذ رہ گیا ہوگا۔ پھر وہ اس کاغذ کے چار ٹکڑے کر کے انہیں جلائے گی اور اس کی راکھ ورشا کے حوالے کر دے گی تاکہ وہ اس راکھ کو ساحل عمر کو کھلا دے اور جونہی ساری راکھ اس کے خون میں شامل ہو گئی' وہ ورشا کا مطیع ہو جائے گا۔ پھر ورشا کے ذریعے وہ ساحل عمر پر حکومت کرے گی۔ اسے دھیرے دھیرے وہاں لے جائے گی جہاں لے جانا چاہتی ہے۔

تصویر دیکھ کر اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ساحل عمر کی تصویر کاغذ پر موجود تھی۔ البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ تصویر کہیں کہیں سے اڑ گئی تھی۔ جیسے تصویر بہت پرانی ہو جائے تو اس پر چھوٹے چھوٹے سفید دھبے پڑ جاتے ہیں۔ بس ایسی ہی ہو گئی تھی اس کی تصویر..... لیکن ایسا کیوں ہوا تھا آخر؟

یہ تو اس کا آزمودہ عمل تھا۔ کئی بار اس نے مختلف لوگوں کے لیے کیا تھا۔ یہ وہ عمل تھا جو

سب سے پہلے اس کے باپ نے کیا تھا۔ اسی سے اس نے سیکھا تھا۔ اس عمل کے ناکام ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے' وہ ہو گئی تھی۔

جب ساحل عمر نے ورشا سے بات کرتے کرتے اچانک ریسیور رکھ دیا تو ورشا کو عجیب سا لگا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ یہ اس کی تو عادت تھی کہ وہ بات کرتے کرتے اچانک ریسیور رکھ دیتی تھی۔ شاید اسی کا سایہ اس پر پڑ گیا تھا۔ ساحل عمر کو اپنی اس حرکت پر بعد میں شرمندگی ہوئی تھی لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ اصل میں بات کرتے کرتے اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے ناریے ناچنے لگے تھے۔ اسے ایک زوردار چکر آیا تھا کہ اس کا ہاتھ خود بخود کریڈل پر پہنچ گیا تھا اور غیر ارادی طور پر ریسیور فون سیٹ پر رکھا گیا تھا۔

اس کے دل پر شدید گھبراہٹ سی طاری تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھایا ہوا تھا اور سر گھوم رہا تھا۔ وہ اپنا سر جھکائے اور اسے دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھا تھا۔

کبھی اس نے دیکھا کہ کوئی چیز بڑی تیزی سے اس کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ وہ جھکال تھا جو اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ وہ بے وزن تھا' بے آواز تھا اور کبھی اسے دکھائی دے رہا اور کبھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

پھر اچانک ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا اور چند لمحوں پہلے اس نے جو کچھ محسوس کیا تھا یا کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا' وہ اب محض ایک خواب لگ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ جھکال اچانک کہاں سے آ گیا۔ اس نے اس کے گرد چکر کیوں لگائے۔

بہرحال جو بھی ہوا تھا لیکن کمرے میں کسی قسم کے آثار نہیں تھے۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اتنا بڑا جانور اس کمرے میں گھوم کر گیا ہے۔ اس وقت رات کا پون بجا تھا۔ اماں شاید جاگ رہی ہوں' اس نے سوچا۔ ان سے تذکرہ کر کے دیکھے' انہیں اپنا حال سنائے' اپنی کیفیت بیان کرے۔ پھر اس نے سوچا جب کمرے میں کسی چیز سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا کہ یہاں کوئی چیتا چھلانگیں مار کر گیا ہے تو وہ اماں کو کیسے یقین دلائے گا۔ اسے یہ تو معلوم تھا۔ اس بات کا پکا یقین تھا کہ وہ اماں کو بتائے گا' اس پر وہ من وعن یقین کر لیں گی مگر وہ یہ سب بتا کر انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بیچاری اس کی طرف سے ویسے ہی خاصی پریشان رہتی تھیں۔

سوچتے سوچتے اچانک اس کی نگاہ رشا ملوک کی تصویر پر پڑی۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر چونک پڑا اور جس چیز نے اسے چونکایا اس کی تصدیق کے لیے تصویر کے نزدیک جانا ضروری تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ رشا ملوک کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو جو جم کر برف بن گئے تھے' وہ برف کے آنسو اب پگھلنے لگے تھے۔

وہ فوراً اٹھ کر تصویر کے نزدیک پہنچا۔ اس نے ان آنسوؤں کو غور سے دیکھا۔ وہ آنسو واقعی پگھل رہے تھے' پانی بن رہے تھے لیکن پانی بن کر بہہ نہیں رہے تھے۔ وہ پانی ہوا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ آنسو تصویر سے غائب ہو گئے۔ اب تصویر خشک اور صاف تھی۔

ساحل عمر کے دل پر سرشاری سی چھا گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے خود اپنے ہاتھوں رشا ملوک کے آنسو پونچھ دیئے ہوں۔

☆.....☆.....☆

ناصر مرزا کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔ اس کی گاڑی نے ملیر ہالٹ کے سٹاپ سے ماڈل کالونی کی طرف رخ اختیار کر لیا تھا۔ شام کے چار بجے تھے۔ وہ حافظ موسیٰ خان سے ملنے جا رہا تھا۔ حافظ موسیٰ کا پتہ اس کے منیجر زاہد ملک نے بتایا تھا۔

پتہ ڈھونڈنے میں ناصر مرزا کو کوئی دقت پیش نہ آئی۔ مارکیٹ میں پہنچ کر جب اس نے ایک جنرل اسٹور والے سے حافظ موسیٰ کا پتہ معلوم کیا تو حافظ موسیٰ کا نام سن کر اس نے بڑی عقیدت سے ناصر مرزا کو دیکھا۔ اگرچہ ان کا گھر نزدیک ہی تھا' پھر بھی اس جنرل سٹور والے نے اپنی دکان کے لڑکے کو ناصر مرزا کے ساتھ کر دیا۔

گھر کے سامنے پہنچ کر اس لڑکے نے چاہا کہ وہ گیٹ پر لگی بیل بجا کر اندر سے کسی کو بلا دے مگر ناصر مرزا نے منع کر دیا۔ اس نے کہا۔ ''بس بیٹا' آپ جائیں۔ میں خود دروازہ کھٹکھٹا لوں گا۔''

''اچھا جی۔'' لڑکا یہ کہہ کر واپس اپنی دکان پر چلا گیا۔

ناصر مرزا نے گیٹ کی دیوار کے ساتھ اپنی گاڑی کھڑی کی۔ پھر گیٹ پر آ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ چار سو گز پر بنے اس مکان کی چار دیواری اتنی اونچی تھی کہ اندر کا گھر نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکے نے گیٹ کھولا اور اپنے سامنے ایک بھاری بھرکم شخصیت کو پا کر تھوڑا سا جھک گیا۔ اس کے چہرے پر نرمی سی آ گئی تھی اور اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جی فرمائیے' کس سے ملنا ہے؟''

''بیٹے مجھے حافظ جی سے ملنا ہے۔'' ناصر مرزا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اچھا آپ ٹھہریئے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں۔ اس وقت وہ پچھلے حصے میں ہیں۔ آپ اپنا نام بتایئے۔ میں دروازے کے باہر کھڑے ہو کر آپ کا نام لوں گا۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو ملاقات ہو جائے گی ورنہ آپ کو دوبارہ زحمت کرنا پڑے گی۔'' اس لڑکے نے خلاف توقع بڑی تفصیل سے ساری صورتحال سمجھائی۔

''ٹھیک ہے بیٹے..... میرا نام ناصر مرزا ہے۔ میں حسن اسکوائر سے آیا ہوں۔''

وہ لڑکا اس کا نام سن کر اندر چلا گیا۔ ناصر مرزا گیٹ کے سامنے سے ہٹ کر اپنی گاڑی کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اس کے منیجر نے بتایا تھا کہ وہ بہت کم لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے لوگ چکر پر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ وہ شخص بڑا خوش قسمت ہوتا ہے جسے پہلی ہی دفعہ میں شرف باریابی حاصل ہو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد گیٹ پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی تو ناصر مرزا فوراً گیٹ کے سامنے آ گیا۔ وہ لڑکا چھوٹے گیٹ سے برآمد ہوا اور مسکرا کر بولا۔ ''آپ کو اندر بلایا ہے۔''

''شکریہ بیٹے!'' ناصر مرزا نے ممنونیت سے کہا۔ لڑکا کچھ نہ بولا۔ جب وہ گیٹ کے اندر

داخل ہو گیا تو لڑکے نے گیٹ اندر سے بند کر دیا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ''آ ئیے۔''

ناصر مرزا کا خیال تھا کہ وہ اسے گھر میں لے جائے گا لیکن اس نے گھر میں جانے کی بجائے گھر کے پچھواڑے کا رخ کیا۔ یہ گھر درختوں' پودوں اور کیاریوں سے گھرا ہوا تھا۔ جب وہ گھر کے پچھلے حصے میں پہنچے تو ناصر مرزا کو ایک دیوار نظر آئی۔ اس دیوار میں ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ لڑکا دروازے کے سامنے رک گیا اور زور سے بولا۔ ''بابا! دروازہ کھولیے۔'' یہ کہہ کر وہ لڑکا واپس مڑا اور ناصر مرزا سے مخاطب ہوا۔ ''ابھی دروازہ کھلے گا' آپ اندر چلے جائیے گا اور دروازہ اندر سے بند کر لیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ناصر مرزا نے کہا۔

وہ لڑکا جس راستے سے آیا تھا' اسی راستے سے واپس چلا گیا۔

لڑکے کے جانے کے بعد دروازہ کھلا لیکن دروازے میں کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ کچھ فاصلے پر نیم کے درخت کے نیچے ایک چارپائی پر بیٹھا شخص ضرور نظر آیا۔ اس شخص کا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ وہ بولا۔ ''آؤ بھائی' اندر آ جاؤ۔''

یہ سن کر ناصر مرزا فوراً دروازے میں داخل ہو گیا اور اس نے پلٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر وہ بہت آہستہ آہستہ بڑے مودبانہ انداز میں چارپائی پر بیٹھے شخص کی طرف بڑھا۔

ناصر مرزا نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا لیکن اسے وہاں حافظ موسیٰ کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ تو پھر دروازہ کس نے کھولا تھا؟ حافظ موسیٰ اگر دروازہ کھولتے تو وہ اسے دروازے پر نظر آتے۔ دروازہ کھلتے ہی حافظ موسیٰ دور چارپائی پر بیٹھے نظر آئے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں ایک موٹی سی لاٹھی تھی۔ وہ چارپائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے اور لاٹھی دونوں ٹانگوں کے درمیان تھی جو انہوں نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی اور ذرا آگے کو جھکے بیٹھے تھے۔

وہ ایک بھرے بھرے چہرے والے سرخ سفید آدمی تھے۔ اگرچہ بیٹھے تھے لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ اونچے قد و کاٹھ کے مالک ہیں۔ انتہائی نورانی چہرہ۔ ایسا کہ ایک بار دیکھے تو پھر نظریں ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ اندھے تھے۔ ان کی دونوں آنکھوں میں پتلیاں نہ تھیں' محض سفیدی تھی اور آنکھیں قدرے سکڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں نہ ہونے کے باوجود ان کے چہرے میں بے پناہ کشش تھی۔

ناصر مرزا جب ان کے نزدیک پہنچا تو حافظ موسیٰ نے کڑک دار لہجے میں کہا۔ ''اچھا بچو! اب تم جاؤ' کل اچھی طرح سبق یاد کر کے آنا۔''

ناصر مرزا نے بڑی حیرت سے انہیں' پھر ان کے سامنے' اس کے بعد چاروں طرف حتیٰ کہ نیم کے درخت پر بھی نظر ڈالی مگر اسے وہاں کوئی بچہ نظر نہ آیا۔ دروازہ بھی جوں کا توں بند تھا۔

چند لمحے حافظ موسیٰ نے جیسے ان بچوں کے جانے کا انتظار کیا۔ پھر ناصر مرزا سے مخاطب ہو کر دھیمے لہجے میں بولے۔ ''ہاں بھائی آؤ بیٹھو۔ بتاؤ کیوں آئے ہو؟''

ناصر مرزا ان کے قدموں میں نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔ حافظ موسیٰ کو فوراً احساس ہو گیا کہ وہ نیچے بیٹھ گیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''بھائی مجھ گنہگار کو مزید کیوں گنہگار کرتے ہو' آؤ چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔''

انہوں نے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ناصر مرزا اب اتنا بدتہذیب بھی نہ تھا کہ ان کے سرہانے چڑھ کر بیٹھ جاتا۔ وہ ان کی پائنتی کی طرف مودبانہ انداز میں بیٹھ گیا۔ یہ ایک کھری چارپائی تھی۔ اس پر چادر بھی نہ بچھی تھی۔

''ہاں اب کہو۔ کیسے آئے ہو؟'' وہ گویا ہوئے۔

''حافظ جی! آپ کے شہر میں ایک جادوگرنی نے ظلم کی انتہا کر رکھی ہے۔'' ناصر مرزا نے شکوہ کیا۔

''بھائی میرا شہر کہاں؟ شہر تو شہر والے کا ہے' وہی جانے اپنی حکمت۔'' حافظ موسیٰ نے گریز کا راستہ اختیار کیا۔

''حافظ جی! آپ کو کچھ کرنا ہوگا۔ وہ قتل پر قتل کر رہی ہے۔ ایک اس نے میری بھتیجی کو مارا دوسرے اس نے ایک ایسے شخص کو مار دیا جس نے اس کے قاتلہ ہونے کا سراغ لگایا۔ نہ جانے وہ اب تک کتنے معصوم اور بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہوگی۔ آپ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اللہ نے آپ کو طاقت دی ہے۔ اگر آپ کچھ نہیں کریں گے تو پھر کون کرے گا؟'' ناصر مرزا نے بڑے امید بھرے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''بھائی مجھے ان بکھیڑوں میں نہ الجھاؤ۔ ایک گوشے میں بیٹھا ہوں' بیٹھا رہنے دو۔''

''آپ موسیٰ ہیں' فرعون کی سرکوبی آپ کا فرض ہے۔'' ناصر مرزا بضد تھا۔

''بھائی میں نام کا موسیٰ ہوں اور اس شہر میں ایک نہیں' ہزاروں فرعون ہیں۔ بتاؤ میں پھر کیا کروں؟''

''اس جادوگرنی کے لیے تو آپ کو ضرور کچھ کرنا ہوگا۔'' ناصر مرزا نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''تم تو خود ایک سمجھدار آدمی ہو۔''

''میں سمجھدار ضرور ہوں لیکن میرے پاس لاٹھی نہیں ہے۔''

''بھائی لاٹھی میری لے جاؤ۔'' انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف لاٹھی بڑھائی۔

''میں لاٹھی کا کیا کروں گا' لاٹھی بھی اسی کے ہاتھ میں سجتی ہے جو اسے چلانا جانتا ہو۔''

''بہت ضدی ہو' مانو گے نہیں۔''

''ضدی نہیں ہوں' مظلوم ہوں۔ آپ کے پاس فریاد لے کر آیا ہوں۔''

''تمہارے پاس تو ایک بڑی اہم دستاویز ہے۔ ایک زبردست خزانہ۔ اسے کیوں نہیں استعمال کرتے۔'' حافظ موسیٰ نے اس کتاب کی طرف اشارہ کیا جس میں بہت سے وظائف درج تھے۔ یہ ہاتھ کا لکھا ہوا مخطوطہ فارسی زبان میں تھا اور یہ کتاب اس کے دادا کے پاس سے ملی تھی۔ پتہ نہیں اس کتاب کے بارے میں انہیں کیسے پتہ چل گیا۔

''میں ایک گاڑی کا مالک ضرور ہوں لیکن مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی۔''

''میں ڈرائیونگ سکھا دوں گا۔'' وہ بولے۔

''تو پھر میں گاڑی چلا لوں گا۔'' اس نے بھی اسی انداز میں کہا۔

''کتاب ساتھ لائے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی لایا ہوں۔'' جواب دیا گیا۔

''کتاب چارپائی پر چھوڑ جاؤ۔ پانچ دن کے بعد آنا لیکن اس وقت نہیں' صبح میں آنا۔ اس وقت میرے پاس کچھ بچے قرآن شریف پڑھنے آتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''جی بہت بہتر!'' ناصر مرزا نے ہاتھ کا لکھا ہوا مخطوطہ جو اس نے کتاب کی شکل میں مجلد کروایا ہوا تھا' اپنے بریف کیس سے نکال کر چارپائی کے سرہانے رکھ دیا اور پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا حافظ جی' میں چلوں۔''

''نہیں' بیٹھ جاؤ اور مجھے ہر وہ بات بتاؤ جو تم مجھے بتانا چاہتے ہو۔''

ناصر مرزا ان کا حکم سن کر پھر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس نے ان واقعات کو وہاں سے شروع کیا جہاں سے وہ شروع ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اس کے دوست ساحل عمر نے ایک انوکھی تصویر بنائی اور اس نے کیا رنگ اختیار کیا۔ اس داستان میں ورشا کا بھی ذکر ہوا' برکھا پر بھی فردجرم عاید کی گئی۔ چیتے والی تصویر کا بھی ذکر ہوا۔ عابد منجم کے ساتھ کیا بیتی' یہ بھی ان کے گوش گزار کیا گیا۔ بھیجی کا اغوا اور پھر اس کا قتل۔ عابد منجم کے ساتھ ہولناک واردات۔ غرض جب ہر وہ بات بتا دی گئی جو وہ بتانا چاہتا تھا تو ساری بات سن کر حافظ موسیٰ گویا ہوئے۔

''پانچ دن کے بعد آنا اور ساتھ اس لڑکے کو بھی لانا' کیا نام ہے اس کا؟''

''جی' ساحل عمر۔'' ''اصل قصہ تو اس کا ہے۔ وہ سفلی والی شیطان کی چیلی اس کے پیچھے لگی ہے۔ لو دیکھو!'' حافظ موسیٰ نے اپنی لاٹھی اس کی طرف کی۔

''کہاں دیکھوں؟''

''اس آنکھ میں دیکھو۔'' حافظ موسیٰ نے موٹی لاٹھی میں بنی ایک آنکھ نما گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ حافظ موسیٰ جب تک وہ واقعات سناتا رہا تھا' اس لاٹھی میں بنی آنکھ سے اپنی اندھی آنکھ لگائے بیٹھے تھے۔

جب اس نے اس لاٹھی کی آنکھ پر اپنی آنکھ رکھی تو برکھا اسے واضح طور پر نظر آئی۔

''یہی ہے نا وہ؟'' حافظ موسیٰ نے پوچھا۔

''جی یہی ہے۔'' ناصر مرزا نے تصدیق کی۔

''اس سفلی والی کو پچھاڑنے کے لیے بہت محنت کرنا ہوگی۔ میں تمہاری مدد کروں گا لیکن اصل محنت تمہیں خود کرنا ہوگی۔'' اس نے آئندہ کا لائحہ عمل بتایا۔

''حافظ جی! آپ جو کہیں گے' کروں گا۔ بس میں اسے ٹھکانے لگانا چاہتا ہوں۔'' ناصر مرزا نے اپنی دلی خواہش ظاہر کی۔

''بڑی عیار لومڑی ہے بھائی۔'' حافظ موسیٰ نے پرفکر انداز میں کہا۔ ''خیر اللہ مالک ہے۔''

''آپ کا ہاتھ میرے کندھے پر رہا تو میں اسے مار گراؤں گا۔''

حافظ موسیٰ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ یکا یک خاموش ہو گئے۔ ناصر مرزا نے محسوس کیا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لاٹھی پکڑ کر سر جھکا لیا تھا۔ پھر انہوں نے کچھ دیر کے بعد سر اٹھایا اور بولے۔ ''اس کتاب کا صفحہ سات کھولو۔''

ناصر مرزا نے ان کے سرہانے سے وہ کتاب اٹھا کر اس کا صفحہ سات کھول لیا۔ ''جی!''

''فارسی پڑھ لیتے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''جی پڑھ تو لوں گا لیکن اچھی طرح سمجھتا نہیں ہوں۔'' ناصر مرزا نے بتایا۔

''اچھا پڑھو' میں سمجھاتا ہوں۔''

ناصر مرزا نے صفحہ سات پر جو درج تھا' وہ پڑھ کر سنا دیا۔

''یہ ایک زبردست وظیفہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس طرح میدان جنگ میں اترنے سے پہلے سپاہی اچھی طرح ڈھال اور تلوار کا استعمال سیکھتا ہے' بالکل اسی طرح تمہیں اس سفلی والی کو پچھاڑنے کے لیے پہلے اپنی حفاظت کا طریقہ سیکھنا پڑے گا۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ وظیفہ ایک طرح سے لائف پروف جیکٹ ہے۔'' حافظ موسیٰ نے مسکرا کر کہا۔ پھر انہوں نے اسے اچھی طرح سمجھایا کہ یہ وظیفہ کس طرح پڑھنا ہے۔ کہاں پڑھنا ہے۔ کس وقت پڑھنا ہے اور پڑھنے کے دوران کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ ساری بات اچھی طرح سمجھا کر بولے۔ ''بھائی سمجھ گئے نا؟''

''جی بالکل' میں نے ساری بات بہت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔'' ناصر مرزا نے پریقین اور پرمسرت لہجے میں کہا۔

''بس ٹھیک ہے۔ تم اب جاؤ' پانچ دن بعد اس وظیفے کے عامل بن کر میرے پاس آنا۔ ساتھ میں اس لڑکے کو بھی لانا' میں چاہتا ہوں ذرا اسے ایک نظر دیکھ لوں۔''

''جی بہتر۔'' یہ کہہ کر ناصر مرزا کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو وہ گردن جھکائے مکان کی طرف دیکھے بغیر گیٹ سے باہر نکل آیا۔ گیٹ سے باہر نکل کر اس نے کال بیل بجائی۔ کچھ دیر کے بعد وہی لڑکا باہر نکل کر آیا۔

''بیٹے گیٹ بند کر لیں۔'' ناصر مرزا نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر جب ناصر مرزا اپنے گھر کی طرف چلا تو وہ بہت خوش تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔ حافظ موسیٰ سے ملاقات ہی کار دارد تھی۔ اس کے منیجر زاہد ملک نے اسے اچھا خاصا ڈرا دیا تھا کہ وہ ملاقات نہیں کرتے۔ ملاقات کرتے ہیں تو بات نہیں کرتے لیکن یہاں تو پہلی دفعہ میں ہی چھکا لگ گیا تھا۔ نہ صرف ملاقات ہو گئی تھی بلکہ انہوں نے ''لائف پروف وظیفہ'' بھی بتا دیا تھا۔ پھر انہوں نے ساحل عمر کو بھی بلا بھیجا تھا۔ ایک بات انہوں نے البتہ عجب کہی تھی کہ وہ ایک نظر ساحل عمر کو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس نے ان کے بارے میں سنا تھا کہ وہ نابینا ہیں اور یہ بات انہیں دیکھ کر صحیح ثابت ہو گئی تھی' وہ واقعی اندھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر یہ دیکھنے والی بات؟

تب اسے خیال آیا کہ انہوں نے کتاب کو کھولے بغیر یہ کیسے کہہ دیا تھا کہ اس کا صفحہ سات

کھول کر پڑھو۔ انہوں نے آخر اس کتاب کو کس آنکھ سے پڑھا؟

وہ اندھے ہوتے ہوئے بھی اندھے نہ تھے۔ اصل میں ہمارے جسم کو کچھ دیکھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ چھونے کے لیے ہاتھوں کی ضرورت پڑتی ہے لیکن وہ جسم تھے ہی کب؟ ان کا جسم روح ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اندر سمٹ گئے تھے۔ جب چاہتے' من کی آنکھ کھول لیتے اور جو چاہتے دیکھ لیتے تھے۔ انہیں اب ان ظاہری آنکھوں کی ضرورت تھی اور نہ ہاتھ پاؤں کی۔ وہ بیٹھے بیٹھے جہاں چاہے پرواز کر سکتے تھے۔

تب ناصر مرزا کو زاہد ملک کا وہ واقعہ یاد آیا تھا جو اس کے خالہ زاد بھائی ارشد کے گھر میں پیش آیا تھا۔ ارشد کے گھر میں جنات نے بسیرا کر لیا تھا اور یہ جن شریر قسم کے تھے۔ انہوں نے گھر والوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ کبھی وہ کسی گھر کے فرد کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ جاتے' کبھی چیزوں کو توڑ پھوڑ دیتے' کھانے پینے کی اشیاء غائب ہو جاتیں۔ گھر میں کبھی چاروں طرف گندگی پھیلا دیتے۔ چھوٹے بچوں کے سامنے خوفناک شکلوں میں آ کر انہیں چیخ مارنے پر مجبور کر دیتے۔ کبھی گھر کی لائٹیں خود بخود جل جاتیں' کبھی خود بخود بجھ جاتیں۔

کئی عاملوں کو جھاڑ پھونک کرنے والوں کو بلا کر دکھایا مگر مسئلہ وہیں کا وہیں رہا بلکہ جیسے ہی کوئی عامل گھر سے نکل کر جاتا' یہ شرارتی جن مزید تخریب کاری مچا دیتے۔

بالآخر گھر کے مکینوں نے سوچا کہ اس گھر کو بیچ دینا چاہیے۔ بہت کوشش کی کہ کسی طرح یہ مکان فروخت ہو جائے مگر ایسا ہو نہ سکا۔ اچھا خاصا سودا ہو جاتا' پھر کوئی ایسی وجہ ہو جاتی کہ بنا بنایا سودا بگڑ جاتا۔

جب گھر میں رہنا محال ہو گیا تو یہی سوچا کہ گھر کو تالا لگا کر کرائے پر مکان لے لیا جائے۔

تب مایوسی کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ کسی نے حافظ موسیٰ کا پتہ بتایا۔ اول تو وہ مل کر ہی نہ دیئے۔ جب سات چکر لگ گئے اور زاہد ملک کے بھائی ارشد مایوس ہو کر واپس جانے لگے تو گیٹ کے اندر سے آواز آئی۔ ''آ جاؤ بھائی' واپس کیوں جاتے ہو۔'' اس کے ساتھ ہی گیٹ کھلا۔ گیٹ ایک لڑکے نے کھولا اور اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

حافظ موسیٰ ایک بیری کے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھے تھے۔ ان کی لاٹھی ان کے نزدیک رکھی تھی اور وہ دروازے کی طرف پیٹھ موڑے بیٹھے تھے۔

ارشد اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا۔ دونوں میاں بیوی ان کے سامنے جاتے ہی سسک سسک کر رو پڑے اور رو رو کر اپنی بپتا بیان کی۔ ساری روداد سن کر انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ''کل چار بجے آنا۔ آ کر مجھے لے جانا۔ بھائی میں اندھا آدمی ہوں۔''

دوسرے دن ارشد گاڑی لے کر مقررہ وقت پر پہنچ گیا اور انہیں گاڑی میں اپنے ساتھ لے آیا۔ حافظ موسیٰ اپنی موٹی لاٹھی ہاتھ میں تھامے کچھ پڑھتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ پھر وہ لاٹھی کے سہارے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھ کر کچھ دیر پڑھتے رہے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئے۔ وہاں بیٹھ کر کچھ دیر پڑھا۔ پھر ایک گلاس پانی مانگا۔ اس پر پھونک ماری اور

بولے۔ ''گھر کا ہر فرد تھوڑا تھوڑا اس پانی کو پی لے۔''

گھر کے تمام افراد کو یہ پانی پلا دیا گیا۔ پھر وہ ارشد سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بھائی تمہارے گھر میں جنوں کا ایک خاندان آباد ہے۔ ان کے چند بچے ہیں جو بہت خبیث ہیں۔ ایک بچہ اس وقت ٹی وی پر چڑھا بیٹھا ہے۔ اس کے آدھے سر پر بال ہیں' آدھا سر گنجا ہے۔ ایک بچہ ادھر فریج کے اوپر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہے۔ ایک ادھر دروازے میں کھڑا قلابازیاں لگا رہا ہے۔ جن کی بیوی اور اس کا ایک بھائی میرے قدموں میں پڑے ہیں۔ معافی کے خواستگار ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ اگر انہیں سزا نہ دی گئی تو یہ خود اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائیں گے لیکن میں نے ایسے بہت سے خبیث دیکھے ہیں۔ یہ اتنی شرافت سے جانے والے نہیں ہیں۔ میرے نکلتے ہی یہ پھیل کر بیٹھ جائیں گے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ جب میں یہاں تک آ گیا ہوں تو ان کا پکا بندوبست کر کے جاؤں گا۔ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ جب تک یہ میرے سامنے سمندر پار نہیں کر جاتے میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔''

پھر وہ وہاں بیٹھے پڑھتے رہے۔ پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی وہ اس جنات گھرانے سے مخاطب بھی ہو جاتے۔ دو تین گھنٹے کی محنت کے بعد وہ اس گھر کو جنات کے خاندان سے خالی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

تب انہوں نے گھر والوں کو بتایا۔ ''میں نے اس خاندان کو سمندر پار کرا دیا۔ اب یہ کبھی اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔ آپ لوگ مطمئن ہو جائیں۔''

اس کے بعد انہوں نے پانی پڑھ کر دیا اور کہا۔ ''اس پانی کے چھینٹے گھر کی دیواروں پر مار دیں۔''

ارشد نے پڑھے ہوئے پانی کے چھینٹے گھر کی ہر دیوار پر مار دیئے۔ بس پھر وہ دن اور آج کا دن۔ دو سال ہو گئے' پھر کبھی اس گھر میں کوئی خلاف عقل واقعہ نہیں ہوا' سکون ہو گیا۔

گھر کے لوگوں کو اس بات پر حیرت نہ تھی کہ حافظ موسیٰ خان نے اس گھر کے جن نکال دیئے تھے۔ حیرت اس بات پر تھی کہ انہوں نے یہ کیسے بتا دیا کہ ٹی وی کدھر رکھا ہے اور فریج کدھر کھڑا ہے۔ وہ تو اس طرح بتا رہے تھے جیسے واقعی آنکھیں رکھتے ہوں۔

وہ واقعی آنکھیں رکھتے تھے۔ اندھے ہونے کے باوجود جب وہ چاہتے ہر اس چیز کو دیکھ لیتے تھے جس کو وہ دیکھنا چاہتے تھے اور اس کا مشاہدہ ناصر مرزا نے خود اپنی آنکھوں سے کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اندھیری رات تھی۔ آس پاس کے بنگلوں کی لائٹیں بھی بجھ چکی تھیں۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ جھینگروں کا شور تھا۔ برکھا نے اپنے بنگلے کے پچھلے حصے میں پیپل کے درخت کے نیچے ایک پختہ حوض بنوا رکھا تھا۔ یہ ایک چوکور حوض تھا۔ اس کی چوڑائی لمبائی چار فٹ تھی۔ اتنا ہی گہرا تھا۔ اس میں پانی بھرا رہتا تھا۔

اس حوض کے چاروں طرف دیئے روشن تھے اور برکھا رات کے گیارہ بجے سے پانی میں کھڑی کسی عمل میں مصروف تھی۔ اس کا آدھا جسم پانی کے اندر تھا اور آدھا جسم پانی سے باہر تھا۔ اس

وقت اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے سر جھکائے کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

حوض کے چاروں طرف اکیس دیئے روشن کیے گئے تھے جو آہستہ آہستہ بجھتے جا رہے تھے۔ اب اس کے سامنے صرف تین دیئے روشن تھے۔ عمل کا وقت پورا ہو رہا تھا۔ ان تینوں دیوں کو ایک ساتھ بجھنا تھا۔ ان دیوں کے بجھتے ہی اعور کی سواری کو آنا تھا۔

اندھیری رات بھیانک سے بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ جھینگروں کا شور اڑتی ہوئی چمگادڑوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور پھر علاقے کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں۔ یہ سب چیزیں بتا رہی تھیں کہ اعور کی سواری کہیں نزدیک ہی ہے۔ بس آیا ہی چاہتی ہے۔

پھر وہ منحوس گھڑی آ پہنچی جو برکھا کے لیے شبھ گھڑی تھی۔ تینوں دیئے بیک وقت بجھ گئے۔ چند لمحوں کے لیے مہیب سناٹا چھا گیا۔ پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تک رک گئی۔ ہوا بھی جیسے ساکت ہو گئی۔

یہ سناٹا محض چند لمحوں کے لیے تھا۔ اس کی سواری آ پہنچی تھی۔ برکھا نے حوض کے کنارے رکھی ماچس سے جلدی جلدی سارے دیئے روشن کر دیئے اور جب اس نے سامنے نگاہ کی تو وہ اپنی سواری پر موجود تھا۔

اس کے سامنے ایک تین فٹ لمبی چھپکلی موجود تھی جس کی زبان باہر نکل رہی تھی اور اس چھپکلی کی گردن میں ایک سانپ رسی کی طرح بندھا تھا۔ اس سانپ کی دم اعور کے دونوں ہاتھوں میں تھی۔ یہ کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا بچھو تھا۔ اس بچھو کی دم اٹھی ہوئی تھی اور اس دم کا آخری حصہ چمک رہا تھا۔ بالکل کسی جگنو کی طرح۔

''سواگتم مہاراج۔ سواگتم مہاراج۔'' برکھا آدھی جھک کر بولی۔

''ہاں' کیوں بلایا ہے ہمیں؟ کیا تو جانتی نہیں کہ ہمارا وقت کتنا قیمتی ہے؟''

''جانتی ہوں مہاراج۔ میں نہیں جانوں گی تو اور کون جانے گا۔ پر کیا کروں مہاراج اکیلی ہوں۔ آپ کو نہیں پکاروں گی تو پھر کس کو پکاروں گی؟ مہاراج میری مدد کریں۔'' وہ گھگھیائی۔

''کیا ہوا؟'' مہاراج اعور نے کڑک کر پوچھا۔

''ایک انکاری آڑے آ گیا ہے۔'' برکھا نے فریاد کی۔

''جو انکاری ہے' اسے اقراری بنا۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ دنیا انکاریوں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارا کام انکاریوں کو اقراری بنانا ہے اور اقراری بناتے رہنا ہے۔ تو جتنے اقراری بنائے گی' اتنے ہی تیرے درجات بلند ہوں گے۔ میرا باپ تجھے طاقت بخشتا چلا جائے گا تو اقراریوں پر راج کرے گی۔'' اعور بولا۔

''مہاراج آپ یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ انکاری بڑے اڑیل ہوتے ہیں۔''

''ہاں' جانتا ہوں۔'' اعور نے پررعب آواز میں کہا۔ ''پر ایسے انکاری کو مار مار کر سیدھا کیا جاتا ہے۔''

''میں نے اسے سدھو کی مار مارنی چاہی تھی لیکن وہ صاف بچ نکلا۔''

''ہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سدھو کا وار تو ہمارا وار ہے۔ ہمارا وار کیسے خالی ہو گیا۔ ہمارے چیلے کیسے ناکام ہو گئے۔'' اعور نے غصے میں بار بار اپنی دم چھپکلی کی پیٹھ پر ماری۔

''مہاراج یہی تو نہیں معلوم ہو رہا ہے' اسی لیے تو آپ کو زحمت دی ہے۔ آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا ہے۔''

''اس کی چال بتا۔''

''وہ شنی ہے۔ وقت کا دھنی ہے۔ چاند اور سورج اس کے راستے میں ہیں۔ اس پر زحل کا سایہ ہے۔ مشتری اس کا غلام ہے۔ عطارد اس کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی پیدائش سات ستاروں کے گٹھ جوڑ سے عمل میں آئی ہے۔'' برکھا نے جیسے سبق سنایا۔

''ایسا انکاری تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔'' اعور نے حیران ہو کر کہا۔

''ہاں مہاراج۔ وہ صدیوں میں پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے تو میں اس کے پیچھے ہوں۔ آپ جانتے ہیں مہاراج برکھا جس کے پیچھے لگے' وہ کوئی معمولی انکاری نہیں ہوتا۔''

''ہاں' جانتا ہوں۔ اسی لیے میرا باپ تجھ سے بہت خوش ہے۔'' اعور نے کہا۔ ''اس انکاری کا نام بتا۔''

''ساحل عمر۔'' برکھا نے اپنی چمکتی آنکھوں سے اعور کو دیکھا۔

''اوہ' اچھا وہ ہمارا دشمن۔''

''ہیں مہاراج۔ آپ اس سے واقف ہیں؟''

''بہت اچھی طرح۔''

''وہ کس طرح مہاراج؟''

''یہ راز ابھی ہمارے من میں ہے۔''

''کوئی بات نہیں مہاراج' آپ نہ بتائیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مہاراج وہ کئی سالوں سے میری نظروں میں ہے۔ میں اس پر کام کر رہی ہوں۔ اس کے لیے جال بن رہی ہوں۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اس پر سدھو کا جال پھینکا تو وہ بڑے آرام سے نکل گیا۔''

''ہوں۔'' اعور نے گہرا سانس لیا۔ ''فکر کیوں کرتی ہے۔ وہ اب ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ اس انکاری کی کمر توڑنا اب ہمارا فرض ہے۔''

''ہاں مہاراج۔ بہت ضروری ہے۔'' برکھا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''وہ بہت قیمتی ہے۔''

''تیرے لیے قیمتی ہے تو میرے لیے وہ بہت اہم ہے۔ وہ میرے راستے کا پتھر ہے۔ اسے ٹھوکر لگانا ہی ہو گی۔''

''مہاراج میرا سدھو کیوں ناکام ہوا؟'' اسے اپنے عمل کی ناکامی کا غم تھا۔ وہ جلد سے جلد

اس راز کو جان لینا چاہتی تھی۔

"تیرے سدھو کو جہکال نے بھرشٹ کیا ہے۔"

"اوہ' اب سمجھی۔" برکھا کی سمجھ میں فوراً ہی ساری بات آ گئی۔ وہ بے قراری سے بولی۔

"مہاراج جہکال کا کچھ کریں۔"

"ہاسکل کو اس کے پیچھے لگانا ہوگا۔"

"ہاں مہاراج۔ وہی اس کو سبق سکھا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو دیئے بجھا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ تو میرے پیغام کا انتظار کرنا۔"

"اچھا مہاراج۔ آپ کی بڑی مہربانی' آپ آئے۔" یہ کہہ کر اس نے دیئے کی لو پر ہاتھ رکھ کر تمام دیوں کو بجھا دیا اور جب اس نے سامنے نظر کی جہاں اعور کی سواری موجود تھی' وہاں اب کچھ نہ تھا۔ اندھیرا اور مہیب سناٹا تھا۔

☆.....☆.....☆

ساحل عمر رشا ملوک کی تصویر کے سامنے کھڑا اس کی پینٹنگ کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جمے ہوئے آنسو کئی دن ہوئے پگھل چکے تھے۔ اب اس کا چہرہ بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اس لڑکی کے حسن میں کوئی ایسی بات تھی کہ جو کوئی اسے دیکھتا تھا تو بڑا لطیف احساس ذہن کے اندر جاگتا تھا۔ ایسا حسن جو دل میں ٹھنڈک کی طرح اترتا جاتا تھا۔ جب دیکھیے' جتنی بار دیکھیے' نظر ٹھہر جائے اور دل نظریں ہٹانے کو نہ چاہے۔

عابد نجم نے جب اس تصویر کو دیکھا تو وہ نظریں ہٹانا بھول گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کا وجود ہے۔ پھر ان کی زندگی نے وفا ہی نہ کی کہ وہ ان سے مزید معلومات حاصل کرتا۔ کافی دن سے رشا ملوک اسے خواب میں بھی نظر نہ آئی تھی۔ اس کے دل میں کبھی کبھی یہ خواہش جاگتی تھی کہ اگر یہ لڑکی اس دنیا میں موجود ہے تو اس سے ملاقات کرے۔ اس نے سوچا کہ اب اگر رشا ملوک اسے خواب میں نظر آئی تو وہ اس سے ملاقات کی شدید خواہش کرے گا اور اس سے اس کا پتہ دریافت کرے گا بشرطیکہ اسے خواب میں یہ بات یاد رہی۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی چیخی۔ اس کی محویت ٹوٹ گئی۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ریسیور اٹھایا اور دھیمے لہجے میں کہا۔

"جی۔"

"میرے رانجھن کیسے ہو؟" وہی مترنم ہنسی' وہی کھنک دار لہجہ۔

"میں بہت اچھا ہوں۔" ساحل عمر نے خوشدلی سے کہا۔

"کیا کر رہے تھے؟" پوچھا گیا۔

"تمہیں یاد کر رہا تھا۔" بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا۔ اپنی اس بات پر اسے حیرت بھی ہوئی کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا اور کیوں کہہ دیا۔

"بڑی خوش قسمت ہوں میں کہ تم جیسے عظیم آرٹسٹ کی یادوں میں بستی ہوں۔" اس نے

بڑے ناز سے کہا۔

''اور سناؤ؟'' ساحل نے رستہ تبدیل کیا۔

''آج شام تیار رہنا' میں آؤں گی تمہیں لینے۔'' اس نے ایک دم اپنا پروگرام بتایا۔

''کیا ارادے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ وہ اس کا پروگرام سمجھ نہ سکا۔

''بہت دن ہو گئے سمندر پر گئے ہوئے۔ سمندر پر چلنا ہے اور رات وہیں رہنا ہے۔'' اس نے کھل کر بتایا۔

''چاند کی کیا تاریخ ہے؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''چاند کی آخری تاریخ ہے۔'' ورشا بولی۔

''پھر رات کو تو وہاں اندھیرا ہوگا۔ سمندر کیا خاک نظر آئے گا۔'' ساحل عمر نے اسے سمجھایا۔

''کبھی تم نے اندھیری رات میں سمندر دیکھا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں' آج تک نہیں۔ البتہ فل مون میں سمندر کو دیکھا ہے۔ کیا قیامت خیز منظر ہوتا ہے۔''

''آج اندھیری رات کا سمندر دیکھنا..... اس کا اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔''

''حسن نہ کہو' احساس کہو کیونکہ حسن کا تعلق دید سے ہے اور دید بغیر روشنی کے ممکن نہیں۔''

''ہاں رانجھن۔ تم نے اچھی بات کہی' اسے احساس ہی کہنا چاہیے۔'' ورشا نے ہنس کر کہا۔

''پھر چلو گے نا' ہم وہاں پہنچ کر پہلے ڈوبتے سورج کا نظارہ کریں گے۔ پھر اندھیری رات میں سمندر کو محسوس کریں گے اور جب صبح ہوگی تو طلوع ہوتے سورج کو دیکھیں گے۔ آہ کتنا مزہ آئے گا۔'' وہ خوش ہو رہی تھی۔

''اور ہٹ کا کیا ہوگا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''ہٹ کی فکر مت کرو۔ وہاں ایک علیحدہ جگہ پر زبردست ہٹ ہے۔ وہاں عام لوگوں کا گزر نہیں ہے۔ ممی کے ایک جاننے والے ہیں' ان کی ہٹ ہے۔ فرنشڈ' پانی' بجلی' ڈش' ٹیلی ویژن وی سی آر..... کیا ہے وہاں جو نہیں ہے۔ رات' سمندر' میں اور تم..... اور کیا چاہتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی۔ اس کی یہ ہنسی اس کا دل لوٹ لیتی تھی۔ وہ پھر لٹ گیا۔

''چلو پھر چلتے ہیں.....'' ساحل عمر نے فوراً کہا۔ یہ بات بھی بے اختیار اس کی زبان سے نکل گئی تھی جبکہ وہ اندر سے سمندر پر جانے کے لیے راضی نہ تھا۔

''اوہ' زندہ باد..... میرے رانجھن زندہ باد۔ میں پھر شام کو آتی ہوں!'' یہ کہہ کر اس نے فوراً ٹیلی فون منقطع کر دیا۔

اسی وقت اس کی نظر سامنے دیوار پر پڑی۔ تب بے اختیار اس کے منہ سے نکلا

''ارے.....!''

☆.....☆.....☆

سامنے دیوار پر رشا ملوک کی تصویر موجود نہ تھی۔
وہ ریسیور رکھ کر تیزی سے بیڈ سے اٹھا۔ وہ تصویر قالین پر پڑی تھی۔ وہ ورشا سے باتوں میں اس قدر مشغول تھا کہ فریم کے گرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اس نے فوراً تصویر اٹھا کر دیکھی۔ تصویر کے پیچھے بندھی ڈوری کھل گئی تھی۔ دیوار پر کیل موجود تھی۔ اس نے ڈوری کو دوبارہ مضبوطی سے باندھا اور تصویر دوبارہ کیل پر لٹکا دی۔ اس نے تصویر کو اچھی طرح دیکھا۔ اسے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔

اماں کمرے میں داخل ہوئیں تو انہوں نے ساحل کو رشا ملوک کی تصویر کا بغور معائنہ کرتے پایا۔ انہوں نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پوچھا۔ ''ساحل! کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں اماں! تصویر کی ڈوری کھل جانے کی وجہ سے تصویر نیچے گر گئی تھی، میں نے دوبارہ لگائی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''حیرت ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''آج تک تو کوئی تصویر نہیں گری۔''

''بس اماں گر گئی۔'' ساحل عمر نے بحث میں پڑنے کے بجائے بحث ختم کی اور پھر بولا۔ ''ہاں، اماں شام کو میں گھر سے باہر جاؤں گا۔ رات کو باہر ہی رہوں گا۔ کل دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔''

''کس کے ساتھ جا رہے ہو؟'' اماں نے پوچھا۔

''اماں ورشا ساتھ جا رہی ہے۔'' ساحل عمر نے صاف گوئی سے کام لیا۔

''جا کہاں رہے ہو؟'' انہوں نے پھر سوال کیا۔

''سمندر پر۔'' وہ بولا۔

''ٹھیک ہے جاؤ۔'' اماں نے خوشدلی سے جواب دیا۔

''لیکن اماں مسئلہ یہ ہے کہ آپ گھر پر اکیلی کیسے رہیں گی؟'' اس کا لہجہ تشویش بھرا تھا۔

''میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' انہوں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

''پھر بھی اماں! میں آپ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی آپ کے ساتھ رہے۔''

''ارے نہیں بیٹا! میں کوئی بچہ تھوڑی ہوں۔''

"اماں ایسا کریں۔ آج کی رات مرجینا کو اپنے پاس روک لیں۔ وہ ابھی گئی تو نہیں۔"

"نہیں ابھی کہاں جائے گی۔ ٹھیک ہے میں اس سے کہے دیتی ہوں۔ وہ تو بڑی خوشی سے رک جائے گی۔"

"چلو اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہو تو ناصر یا مسعود کسی کو بھی فون کر لینا۔" ساحل عمر نے ہدایت کی۔

پھر چائے پی کر وہ کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اسے شام ہونے والی تھی۔ وہ جلدی سے نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ قمیض اتارتے ہوئے آئینے میں نظر پڑی۔ اس نے دیکھا گلے میں تعویز موجود ہے۔ وہ نہاتے ہوئے تعویز اتار دیا کرتا تھا۔ وہ فوراً باہر آیا۔ اس نے تعویز کو رشا ملوک کی تصویر کے فریم کے ایک کونے پر لٹکایا۔ وہ تعویز اسی طرح لٹکایا کرتا تھا۔ باتھ روم سے نکلتا تو گلے میں ڈال لیتا۔ اگر فوراً گلے میں ڈالنا بھول جاتا تو کسی نہ کسی طرح اس کی نظر تعویز پر پڑ جاتی۔

آج وہ باتھ روم سے نہا کر نکلا تو ورشا اسے لینے آ چکی تھی۔ وہ لاؤنج میں اس کی منتظر بیٹھی تھی۔ وہ جلدی سے کپڑے تبدیل کر کے اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ بیگ اٹھانا نہ بھولا تھا۔

گیٹ کے باہر نکلا تو سامنے گاڑی موجود تھی۔ گاڑی میں ڈرائیور کی سیٹ پر ایک طباق سے چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

"یہ کون ہے؟" ساحل عمر اسے دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکا۔

"یہ اس شخص کا ڈرائیور ہے جس کی ہٹ ہے۔ یہ ہمیں ہٹ تک پہنچا کر واپس آ جائے گا۔"

"اور گاڑی؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"گاڑی ہمارے پاس رہے گی۔"

وہ دونوں گاڑی کے نزدیک آ گئے تو وہ شخص بڑی پھرتی سے گاڑی سے باہر آیا۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ بڑے مودبانہ انداز میں کھولا۔ جب وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تو اس نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور بڑی مستعدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اماں گیٹ پر کھڑی تھیں۔ انہوں نے جاتی ہوئی گاڑی پر پھونک ماری۔ ساحل عمر نے انہی ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا۔ ورشا نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ہلکے سے دباتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ "میرے رانجھن!"

ساحل عمر نے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیا۔

واسم نے آئینہ ٹھیک کرنے کے بہانے ایک لمحے کو ورشا کی طرف دیکھا اور پھر گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔

جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو سورج اپنی تمازت کھو چکا تھا۔ وہ ہٹ واقعی شاندار تھی۔ دو منزلہ اس ہٹ میں ہر سہولت موجود تھی۔ واسم نے ہٹ کھولنے کے بعد گاڑی کی ڈگی میں پڑا ہوا سامان ہٹ میں منتقل کر دیا اور پھر گاڑی کی چابی ورشا کو دیتا ہوا بولا۔ "بی بی جی میں جاتا ہوں۔ کل صبح

دس بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ورشا نے اس سے چابی لیتے ہوئے کہا۔ "دیکھو وقت پر پہنچ جانا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ ہٹ سے نکل گیا۔

واسم ہٹ سے ضرور نکلا لیکن وہ ہٹ سے دور نہ گیا۔ وہ بڑی احتیاط سے ہٹ کی پشت پر گیا اور دروازہ کھول کر زینہ چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچا تو وہاں برکھا پہلے سے موجود تھی۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔ "سب ٹھیک ہے؟"

"جی برکھا جی...... سب ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر واسم نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اوپر آنے کا راستہ ہٹ کے اندر سے بھی تھا لیکن اس دروازے کو لاک کر دیا گیا تھا۔ اوپر جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نیچے کا پورشن خاصا کشادہ اور شاندار تھا۔ پھر ہٹ بھی خاصی بلندی پر بنی ہوئی تھی۔ پھر بھی اگر ساحل اوپر جانے کی بات کرتا تو ورشا اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتی اور پھر بند پا کر غصے سے کہتی۔ "بے وقوف اوپر کا پورشن کھولے بغیر ہی چلا گیا۔" ظاہر ہے اس کے جواب میں ساحل عمر کو یہی کہنا پڑتا۔ "ارے کوئی بات نہیں۔"

واسم کے ہٹ سے جانے کے بعد ورشا نے مترنم لہجے میں کہا۔ "اچھا جناب' پہلے میں بناتی ہوں چائے۔ چائے پی کر پھر باہر نکلتے ہیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"ہیں تم چائے بنا لیتی ہو؟" ساحل عمر نے حیرت ظاہر کی۔

"جناب میں کھانا بھی زبردست پکاتی ہوں۔ آج رات کا کھانا جب پکا کر کھلاؤں گی تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔" اس نے ایک ادا سے کہا اور پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

پھر وہ فوراً ہی مسکراتی ہوئی واپس آئی۔ ٹیلی ویژن پر رکھا ہوا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دیا اور شوخی سے بولی۔ "جب تک تمہارے ہاتھ میں سویٹ ڈش آئے' اس وقت تک ورلڈ ڈش سے شوق فرماؤ۔"

"کھانے میں سویٹ ڈش بھی ہو گی؟" ساحل عمر نے ریموٹ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ہو گی۔" اس نے چمکیلی نگاہوں سے ساحل کو دیکھا۔

"پھر تو تمہیں پوری رات کھانا پکاتے ہی گزر جائے گی۔" ساحل عمر نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ارے نہیں' کیا سمجھا ہے مجھے۔" وہ اترا کر بولی۔ "اچھا پکاتی ہوں اور جلدی پکاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئی۔

کیتلی چولہے پر رکھ کر وہ ساتھ لایا ہوا سامان کھولنے لگی۔

ساحل عمر نے ٹی وی آن کر کے چینل بدلنے شروع کیے۔ چند لمحے وہ ایک چینل کا جائزہ لیتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ بالآخر وہ ایک میوزک چینل پر ٹھہر گیا۔ اس وقت سکرین پر میڈونا چھائی ہوئی تھی۔

میڈونا کے گانے کی آواز سن کر ورشا نے کچن سے جھانکا۔ "تھوڑی سی آواز بڑھا دو۔"

"اچھا!" ساحل عمر نے یہ کہہ کر تھوڑی سی آواز تیز کر دی۔ "کیا تمہیں میڈونا پسند ہے؟"

''ہاں بہت۔'' ساحل عمر نے زور سے کہا۔'' اور مائیکل جیکسن؟''

''اس کی تو دیوانی ہوں۔''

''تمہاری پسند آخر اس قدر تیزی سے تبدیل کیوں ہو جاتی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ کچن سے باہر نکل آئی۔

''دو دن پہلے تو تم نے کہا تھا کہ میں تمہاری دیوانی ہوں۔'' ساحل عمر نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''وہ میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہوگا۔'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور شرارتی نظروں سے دیکھتی ہوئی پھر کچن میں چلی گئی۔

دو کپ چائے تیار کر کے اس نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا۔ پھر ایک چمچ میں دو چار بوند پانی لے کر اس پر ایک بار پھونک ماری اور اس چمچ کو ایک کپ میں ڈبو کر نکال لیا۔ ٹرے میں دونوں کپ سجائے۔ لاؤنج میں میز پر ٹرے رکھی۔ ساحل عمر کا کپ اس کے ہاتھ میں دیا اور اپنا کپ قالین پر رکھ کر ساحل عمر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''ارے کہاں بیٹھ گئیں.....اوپر آ جاؤ۔'' ساحل عمر نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں' میں یہیں ٹھیک ہوں۔ تمہارے چرنوں میں۔'' یہ کہہ کر اس نے اس کا پیر پکڑ لیا اور اسے چومنے کے لیے جھکی۔

''اوہ نو۔'' ساحل عمر نے فوراً اپنا پاؤں کھینچ لیا۔'' خدا کے لیے ورشا مجھے انسان رہنے دو' دیوتا مت بناؤ۔''

''تم میرے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں۔'' اس نے بڑی عقیدت سے کہا۔

''او یار' میں کوئی دیوتا ویوتا نہیں' تم شرافت سے صوفے پر آ کر بیٹھ جاؤ۔ چائے پیو اور باہر نکلو۔'' ساحل عمر نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''اچھا۔'' وہ بڑی فرمانبرداری سے قالین سے اٹھ کر اس کے برابر بیٹھ گئی اور چائے پیتے ہوئے ایک خاص انداز میں دیکھنے لگی۔

''اب کیا ہوا؟'' وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے بولا۔

''ساحل' یو آر اے کلر۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔

''یہ ڈائیلاگ میں نے کسی انگلش فلم میں سنا ہے اور شاید راکیل ویلچ کے لیے کہا گیا تھا۔ اس وقت وہ جس لباس میں تھی' یقیناً قاتل لگ رہی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسا مکالمہ کسی عورت کے لیے ہی اچھا لگتا ہے۔'' ساحل عمر نے یہ کہہ کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''حالانکہ اصل قاتل مرد ہوتا ہے۔'' اس نے بات کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔

''میرا خیال ہے کہ مرد عورت کے معاملے میں خاصا بے وقوف واقع ہوا ہے۔ کوئی خوبصورت عورت کسی بھی مرد کو آسانی بے وقوف بنا سکتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے' الو بنا سکتی ہے۔ عورت مرد کی بڑی کمزوری ہے۔''

''کیا تم انہی مردوں میں سے ہو؟'' اس نے ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میری کیا بات کرتی ہو..... میں تو پرلے درجے کا احمق ہوں۔''

''پھر تمہیں کیا الو بنانا' تم تو بنے بنائے ہو۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''مجھے بے وقوف بنانے کا ارادہ تھا کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں' میں بے وقوف بنانے پر یقین نہیں رکھتی۔ سچ بتاؤں ساحل' میں تمہارے بارے میں تضادات کا شکار ہوں۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''پتہ نہیں' ساحل میں کیا چاہتی ہوں۔ تم کیا چاہتے ہو۔ کوئی اور کیا چاہتا ہے۔'' وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

''ارے' تم تو سیریس ہو گئیں۔'' ساحل عمر نے اپنا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھئی تم نے بہت اچھی چائے بنائی۔''

''تھینک یو۔'' ورشا نے مسکرا کر کہا۔

جب وہ بھی چائے پی چکی تو اس نے اپنا کپ میز پر رکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''آؤ چلو سمندر پر چلیں۔''

یہ ایک مخصوص بیچ تھا۔ یہاں عام لوگوں کا گزر نہ تھا۔ آج تو یہاں خاص لوگ بھی برائے نام تھے۔ بس دو چار جوڑے کچھ فاصلے پر اپنی اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ چھٹی کا دن جو نہ تھا۔

ساحل عمر اور ورشا دونوں ہی جینز اور شرٹوں میں تھے اور اس وقت یہ واحد جوڑا تھا جو سر سے پیر تک ڈھکا ہوا تھا جبکہ جو لوگ آس پاس نظر آ رہے تھے' ان کے مرد نیکر پہنے ہوئے تھے اور عورتیں نہانے کے لباس میں تھیں۔ یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ کوئی پاکستانی سمندر کا کنارہ ہے۔

سورج سمندر کی طرف جھک رہا تھا اور ورشا ساحل عمر کا ہاتھ پکڑے سمندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

سامنے بے کراں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کا اپنا ایک حسن ہے۔ آپ اسے ڈوبتے سورج کے پس منظر میں دیکھیں یا نکلتے سورج کے پیش منظر میں۔ ماہ کامل میں اس کا نظارہ کریں یا مختلف موسموں میں اسے دیکھیں۔ آپ اسے ہر بار مختلف پائیں گے۔ یہ صبح کچھ ہوتا ہے' دوپہر کو کچھ اور شام کو کچھ اور ہوتا ہے۔ اس کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس کے تیور محبوب جیسے ہوتے ہیں اور دلکشی میں بھی محبوب جیسا ہوتا ہے۔

ساحل عمر کو سمندر بہت پسند تھا۔ وہ اسے دیکھ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ سمندر کی لہریں اس کے دل کے تاروں کو ہلا دیتیں۔ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے سمندر اسے پکار رہا ہو' بلا رہا ہو۔ وہ سمندر میں بے پناہ کشش محسوس کرتا تھا اور یہ کشش اس وقت دگنی ہو گئی تھی۔ ایک حسین لڑکی کا ہاتھ جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک طرف پرکشش لڑکی دوسری طرف پرکشش سمندر..... دو کششیں ایک ساتھ مل گئی تھیں۔ وہ پاگل کیسے نہ ہو جاتا۔

اس نے ورشا کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور سمندر کی طرف بھاگنے لگا۔

''رک جاؤ ساحل..... زیادہ اندر مت جاؤ' مجھے اس کی موجوں سے ڈر لگتا ہے۔'' ورشا نے اسے مزید آگے جانے سے روکنا چاہا۔

''ڈرتی ہو۔'' ساحل عمر نے رک کر کہا۔

''ڈرتی نہیں ہوں' احتیاط لازم ہے۔ سمندر چڑھا ہوا ہے۔ زیادہ اندر جانا ٹھیک نہیں۔''

اتنی دیر میں سمندر کی ایک بڑی لہر آئی۔ ان دونوں کے قدم ڈگمگانے لگے۔

اسی وقت واسم پردہ چھوڑ کر برکھا سے مخاطب ہوا۔ ''وہ دونوں سمندر میں جا چکے۔'' وہ بڑی دیر سے پردے سے لگا بیٹھا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ پردہ ہٹا کر دیکھ لیتا تھا۔ بالآخر ورشا اور ساحل اسے سمندر میں جاتے ہوئے نظر آ ہی گئے۔

''آؤ پھر نیچے چلو۔'' برکھا نے فوراً کہا۔

''آیئے!'' واسم نیچے کے دروازے کی اپنی جیب میں چابی ٹٹولتا ہوا زینہ اترنے لگا۔

☆.....☆.....☆

وظائف کی کتاب کے صفحہ سات پر جو عمل دیا گیا تھا' اس کو پڑھنے کے لیے حافظ موسیٰ نے اور جو ہدایات دی تھیں' اس کے مطابق اس عمل کو رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان کرنا تھا۔ دوسرے کمرے میں مکمل تاریکی کا ہونا بہت ضروری تھا۔

اس عمل کے لیے ناصر مرزا کا اسٹڈی روم بہترین تھا۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے جن کی وجہ سے کمرے میں گہری تاریکی ممکن تھی۔ کوئی پونے بارہ بجے کے قریب ناصر مرزا کمرے میں آیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ گھر والوں کو ہدایت کر دی کہ اسے کسی بھی صورت میں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ پردے کھلے ہوئے تھے۔ اس نے پردے برابر کیے۔ عمل کرنے کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ پھر ٹھیک بارہ بجے کمرے کی لائٹ آف کر کے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔

اس وظیفے پر کوئی خاص محنت نہ تھی۔ پانچ راتوں کا وظیفہ تھا۔ وظیفے کے دوران زیادہ پڑھنا بھی نہ تھا۔ جو بتایا گیا تھا اسے پندرہ بیس منٹ میں بآسانی ختم کیا جا سکتا تھا۔

ناصر مرزا کو ابھی وظیفہ شروع کیے پانچ سات منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اس نے اپنے بہت قریب کتے کے رونے کی آواز سنی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کتا کمرے میں موجود ہو۔ کتے کے رونے کی منحوس آواز کو سن کر ناصر مرزا بے اختیار چونک پڑا۔

☆.....☆.....☆

نیچے پہنچ کر واسم کھڑکی کا ذرا سا پردہ ہٹا کر بیٹھ گیا تاکہ اگر وہ دونوں ہٹ میں واپس آ رہے ہوں تو برکھا کو بروقت اطلاع کر سکے۔ برکھا نے کچن کا رخ کیا۔ وہاں ایک ٹرے میں مرغی کا گوشت موجود تھا۔ برکھا نے گوشت میں سے مرغی کی دونوں ٹانگیں نکال لیں اور اوپر سے لائی ہوئی ایک ٹانگ اس نے گوشت میں شامل کر دی۔ اس ٹانگ پر اس نے عمل کیا ہوا تھا۔ یہ ٹانگ پروگرام کے مطابق ساحل عمر کو کھلائی جانی تھی۔ نکالی ہوئی دونوں ٹانگیں اس نے ایک پلیٹ میں ڈال کر فریج میں رکھ دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے بیڈ روم کا رخ کیا۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ایک تکیہ اٹھایا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھر پرس سے لائی ہوئی چھری کی نوک پر اس نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور اس چھری سے تکیے پر ساحل کا نام لکھا۔ کوئی دس منٹ تک وہ اسی طرح بیٹھی چھری پر پڑھ کر پھونکتی اور ساحل کا نام لکھتی رہی۔

آخری بار جب اس چھری سے تکیے پر نام لکھا تو سفید تکیے پر اس کا نام ابھر آیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا نام تازہ خون سے لکھا گیا ہو اور یہ خون چھری سے نکلا ہو..... لیکن چھری کی نوک بالکل صاف تھی۔ تکیے پر ساحل کا نام دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

اس نے وہ تکیہ اپنی گود سے اٹھا کر بیڈ پر الٹ دیا اور اس پر اپنا بایاں ہاتھ رکھ کر دھیرے سے نعرہ لگایا۔ ''کالی واہ۔''

اور پھر فوراً ہی تکیے کو سیدھا کر دیا۔ اب اس تکیے سے ساحل عمر کا نام صاف ہو چکا تھا۔ اس بیڈ پر دو تکیے تھے اور دونوں یکساں تھے۔ ساحل عمر کے تکیے کی پہچان کے لیے اس نے تکیے کے ایک کونے پر پن اسٹک لگا دی۔ اس نشان کو ساحل عمر محسوس نہیں کر سکتا تھا لیکن ورشا فوراً پہچان سکتی تھی۔

اس تکیے کو الگ رکھ کر اس نے دوسرے تکیے کو اپنے نزدیک کیا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر فریب مسکراہٹ تھی۔ اس نے آسودگی سے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ واسم ان پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ دونوں جب سمندر کی موجوں سے کھیل کر تھک گئے تو انہوں نے سوچا کہ اب ہٹ کی طرف چلا جائے۔ ویسے بھی اندھیرا اب اتنا ہو گیا تھا کہ سمندر کی لہر کا ٹھیک طرح سے اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔

وہ دونوں جب ہٹ کی طرف بڑھنے لگے تو واسم نے فوراً پردہ چھوڑ دیا۔ ہٹ کے اندر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ واسم نے فوراً جیب سے لائٹر نکالا۔ اسے جلا کر تیزی سے بیڈ روم کی طرف بڑھا اور دروازے پر پہنچ کر اس نے اندازہ کیا کہ برکھا کہاں ہے۔ لائٹر کی دھیمی روشنی میں وہ اسے بیڈ پر لیٹی ہوئی نظر آئی۔ اس نے گھبرا کر آواز دی۔ ''برکھا جی!''

برکھا اس کی آواز سن کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''ہاں کیا ہوا؟''

''وہ آ رہے ہیں۔''

''اوہ! چلو پھر نکلو یہاں سے..... لیٹے لیٹے مجھے نیند آ گئی تھی۔'' برکھا تیزی سے اٹھتی ہوئی بولی۔

لائٹر کی روشنی میں ہی وہ دونوں جس طرح اوپر سے آئے تھے، ویسے ہی واپس چلے گئے۔

کہا۔ ''ہمیں سمندر پر جانے سے پہلے لائٹیں جلا کر جانا چاہیے تھا۔''

''پریشانی کی کوئی بات نہیں، تم دروازے پر رکو۔ میں اندر جا کر لائٹ جلاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"ورشا کیا تم اس سے پہلے بھی یہاں آ چکی ہو؟"

"ہاں' میں کئی مرتبہ یہاں آئی ہوں' اپنی ممی کے ساتھ۔" ورشا اندر جاتے ہوئے بولی۔

"لیکن تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟"

"اس لیے کہ تمہیں اس ہٹ میں آ کر ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ تم یہاں کی ہر چیز سے مانوس ہو۔ یہاں تک کہ تم یہ بھی جانتی ہو کہ لائٹ کے بٹن کہاں ہیں۔" ساحل عمر نے وضاحت کی۔

"تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا میرے رانجھن! تم کتنے ذہین ہو۔" ورشا نے لائٹ آن کرتے ہوئے کہا۔

"اب یہ ذہین آدمی تھوڑا سا نہانا چاہتا ہے۔" ساحل عمر نے اپنا بیگ کھول کر کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔ "باتھ روم کدھر ہے؟"

"جناب تھوڑا سا کیوں..... بہت سا نہایئے۔ پانی کی یہاں کوئی کمی نہیں۔" ورشا نے ہنس کر کہا۔ "باتھ روم بیڈ روم کے ساتھ ہے' وہ سامنے۔"

ساحل عمر باتھ روم میں گھسا۔ یہ ایک صاف ستھرا باتھ روم تھا۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے پر قرینے سے رکھی تھی۔ باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے تعویز کا خیال آیا۔ اس کا گلا خالی تھا۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے عجلت میں تعویز پہننا ہی بھول گیا۔ بیگ میں دو جوڑے اور کچھ ضرورت کی چیزیں اماں نے رکھ دی تھیں۔ بس وہ ورشا کو بیٹھا دیکھ کر جلدی سے بیگ اٹھا کر گھر سے نکل آیا تھا۔

تعویز کو گلے میں نہ پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ جہاں تھا' وہاں اس تعویز کی اشد ضرورت تھی اور وہیں وہ موجود نہ تھا۔ آخر وہ تعویز گلے میں ڈالنا بھولا کیسے؟ کیا اس بھول میں ورشا کا ہاتھ تھا؟ اس بات کا جواب دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

وہ نہا کر باہر نکلا تو ورشا کو کچن میں مصروف پایا۔

"واہ' بڑی زبردست خوشبوئیں اٹھ رہی ہیں۔" ساحل عمر کچن کے دروازے میں کھڑا ہو کر بولا۔

"میرے رانجھن' تم یہاں کھڑے ہوئے بہت اچھے لگ رہے ہو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تم سدا اسی طرح کھڑے رہو اور میں یونہی تمہارے لیے کھانا بناتی رہوں۔" ورشا نے الٹے ہاتھ کی پشت سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"اس طرح تو میں کھڑا کھڑا سوکھ جاؤں گا۔ تم کوئی ڈھنگ کی خواہش نہیں کر سکتیں؟" وہ ہنسا۔

"کیوں نہیں..... خواہشیں اتنی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔" اس نے ایک ادا سے دیکھا۔

"دم نہ نکالو' کھانا نکالو۔"

"بھوک لگی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ایسی ویسی۔" ساحل عمر نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔
"بس دس پندرہ منٹ اور لگیں گے۔" اس نے تسلی دی۔
"اوکے' میں جب تک ڈش سے دل بہلاتا ہوں۔" وہ لاؤنج کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ پھر بولا۔ "کیا تم نہاؤ گی نہیں؟"
"کیوں نہیں۔" ورشا نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ "شاور لینے میں مجھے دو منٹ لگتے ہیں۔"

اس نے کڑھائی گوشت اور بیسن کا حلوہ بنایا تھا۔ نان وہ ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس نے سچ کہا تھا۔ اس نے کھانا بہت لذیذ اور منفوں میں تیار کیا تھا۔ ساحل عمر گوشت بہت کم کھاتا تھا۔ جب اس نے تکلف دکھایا تو ورشا نے کہا۔ "آج میں جو کھلاؤں گی' وہ کھانا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے اس کی پلیٹ گوشت سے بھر دی۔ اسی میں وہ ٹانگ بھی موجود تھی جس پر برکھا نے کچھ عمل کیا تھا۔ دوسری بوٹیوں کے ساتھ وہ ٹانگ بھی ساحل عمر کے پیٹ میں چلی گئی۔

کھانا کھاتے ہوئے ورشا اسے کچھ دینے کے لیے بار بار جھک رہی تھی۔ نہا کر اس نے جینز شرٹ پہن لی تھی۔ اس کی شرٹ کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ بٹن لگانا بھول گئی تھی یا دانستہ اس نے گلا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ کبھی پلیٹ دینے' کبھی سالن نکالنے' کبھی پانی دینے کے لیے بار بار جھک رہی تھی۔

ساحل عمر سے جب رہا نہیں گیا تو اس نے مہذبانہ انداز میں کہا۔ "تمہاری قمیض کے بٹن کھلے رہ گئے ہیں شاید؟"
"اوہ سوری۔" ورشا نے پریشان ہو کر اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی اپنے گلے کو سنبھال لیا۔

اسے ساحل عمر سے اس جملے کی توقع نہیں تھی۔
لیکن ساحل عمر چند ایسے نوجوانوں میں سے تھا جن سے ایسے جملے کی توقع کی جانی چاہیے۔
کھانے کے بعد اس پر کچھ غنودگی سی چھانے لگی تو وہ صوفے پر ہی پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔
ورشا نے چائے بنائی۔ اسے ہلا کر اٹھایا۔ "جناب چائے' کیا نیند آ رہی ہے؟"
"ہاں' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھے نیند کیوں آ رہی ہے۔ شاید میں نے زیادہ کھانا کھا لیا ہے۔"
"کوئی زیادہ زیادہ نہیں کھایا۔ چڑیا جیسی تو آپ کی خوراک ہے۔ آپ سے زیادہ تو میں نے ہی کھا لیا تھا۔" ورشا ہنس کر بولی۔ "چلیں چائے پی لیں۔ ایک دم کڑک ہے۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔"

ساحل عمر نے خاموشی سے چائے کا کپ لیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔
"کیا بہت نیند آ رہی ہے؟"
"ہاں بھئی!"
"پھر بیڈ روم میں جا کر لیٹ جائیں' تھوڑی دیر سو لیں۔ پھر میں آپ کو اٹھا لوں گی۔" پھر

اس نے ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''یہ بات یاد رکھیں کہ آپ یہاں سونے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ باتیں کریں گے' تاش کھیلیں گے' میوزک سنیں گے۔ میں اپنی پسند کے کیسٹ لے کر آئی ہوں۔''

''اچھا' ہاں ضرور۔'' اس نے بمشکل آنکھ کھول کر چائے کا گھونٹ لیا۔ پھر کپ اس کی طرف واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''بھئی مجھے نیند آ رہی ہے۔ کچھ دیر سو جاؤں۔ یہ تم نے کھانے میں کچھ ملا دیا تھا کیا؟''

''میرے راجن! جو کھانا تم نے کھایا ہے' وہی کھانا میں نے بھی کھایا ہے۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی۔''

''بھئی مجھے تو آ رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے پر ہی لڑھک گیا۔

ورشا نے بیڈ روم سے لپ اسٹک لگا تکیہ اٹھایا اور اس کے سر کے نیچے رکھتی ہوئی بولی۔ ''سر اٹھائیں' یہ تکیہ لگا لیں۔''

''اچھا!'' ساحل عمر نے بمشکل سر اٹھایا۔ ورشا نے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا اور بولی۔ ''اب آرام سے سو جاؤ میرے راجن..... گڈ نائی.....''

ساحل عمر نے کچھ جواب دینا چاہا لیکن وہ بول نہ سکا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نرم نرم روئی میں دھنستا چلا جا رہا ہو۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے ہوش گنوا بیٹھا۔

ورشا کچھ دیر بیٹھی اس کی صورت دیکھتی رہی۔ ساحل عمر ایک خوبصورت لڑکا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت چھائی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہونٹوں کی بناوٹ ہی کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ ہونٹ بند کرتا تو یوں لگتا جیسے دھیرے سے مسکرا رہا ہو۔

ورشا اس وقت متضاد کیفیت سے دوچار تھی۔ ماں کے پلان کے مطابق اس نے ہر وہ کام کر دیا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے اپنی ممی کے منصوبے کو بخیر و خوبی پایہ تکمیل تک پہنچا دیا تھا۔

ایک طرف وہ خوش تھی تو دوسری طرف وہ خوفزدہ بھی تھی' افسردہ بھی تھی۔ وہ اپنی ماں کے عزائم سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی ماں نے مچھلی پکڑنے کے لیے اسے چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ چارہ بننے پر مجبور تھی۔ اس میں انحراف کی قوت ہی نہیں رہی تھی۔ شروع میں تو وہ اسے ایک کھیل ہی سمجھتی رہی تھی لیکن اب جبکہ ساحل عمر گہری نیند سو چکا تھا تو اس پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی۔ شاید وہ اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی۔

پھر اچانک اس کے دماغ میں ایک امید کی کرن چمکی۔ اس نے ساحل عمر کے گلے کو ٹٹولا۔ پھر قمیض کا ایک بٹن کھول کر دیکھا۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر شاک لگا۔ اس کے گلے میں تعویذ نہ تھا۔ اب ساحل عمر کو کوئی بچانے والا نہ تھا۔ اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔

ورشا کچھ دیر گم صم بیٹھی رہی' پھر وہ بے اختیار اس کے چہرے پر جھکنے لگی۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر آئی بات ساحل عمر کے ہونٹوں کو سنا دی۔ پھر وہ اٹھی۔ اٹھتے ہوئے اس کے دل میں آیا کہ وہ کہے۔ ''اللہ تمہارا نگہبان ہو۔'' مگر وہ دل میں آئی بات ہونٹوں پر نہ لا سکی۔

اس نے زینے کے دروازے پر تین بار دستک دی۔ کچھ دیر توقف کیا۔ زینے پر کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ دروازے کے تالے میں چابی گھومی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

دروازہ واسم نے کھولا تھا۔ وہ ورشا کو دیکھ کر ایک طرف ہو گیا۔ ورشا خاموشی سے زینہ طے کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

ناصر مرزا نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ کتے کے رونے کی آواز سن کر اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور عمل جاری رکھا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کے باوجود دو چمکدار آنکھیں اسے گھورتی ہوئی نظر آئیں۔ ساتھ ہی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ کتا تھا' بھیڑیا تھا جو بھی تھا لیکن تھا گدھے جتنا اونچا کیونکہ اس کی آنکھیں خاصی اونچی تھیں۔ وہ کتے کی طرح ہانپ رہا تھا اور بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔

ناصر مرزا مضبوط دل گردے کا مالک تھا۔ پھر حافظ موسیٰ نے اس عمل کے تمام نشیب و فراز اسے سمجھا دیئے تھے۔ خوف کی ایک ہلکی سی لہر اس کے دل میں ضرور اٹھی تھی لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

ناصر مرزا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور عمل جاری رکھا۔

"اوہ بے وقوف تو کن چکروں میں پڑا ہے۔" کمرے میں اچانک ایک آواز گونجی۔ یہ بڑی کرخت آواز تھی۔

ناصر مرزا نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں وہ موجود تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

"آنکھیں کھول کر کیا دیکھتا ہے۔ اپنی یہ خرافات بند کر ورنہ پچھتائے گا۔" پھر وہی آواز گونجی۔

ناصر مرزا اندازہ نہ کر پایا کہ یہ آواز کس کی ہے۔ آیا یہی کتا یا بھیڑیا بول رہا ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی کمرے میں موجود ہے۔ ناصر مرزا نے خاموشی سے اپنا عمل جاری رکھا۔

"سنتا نہیں' کیا بہرہ ہے؟ دیکھتا نہیں' کیا اندھا ہے؟ کیوں اپنی زندگی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ تو جانتا نہیں کہ ہم جس کے پیچھے لگ جاتے ہیں' اسے مار کر ہی چھوڑتے ہیں۔" وہ جو بھی تھا' مسلسل دھمکیاں دیئے جا رہا تھا۔

ناصر مرزا مصلے پر بیٹھا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس کے تسبیح تھی۔ وہ پورے اعتماد سے اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی انگلی کے درمیان تیزی سے تسبیح کے دانے پھسل رہے تھے۔

"او بے وقوف بند کر اپنی بکواس..... نہیں تو میں تیرے اوپر چھلانگ لگا رہا ہوں۔ تیری کھوپڑی انار کر لے جاؤں گا۔" اس کے ساتھ ہی غراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔

ناصر مرزا نے اپنا بایاں ہاتھ بڑھایا۔ اس کے پاس ہی چھ سیل کی ایک پاور فل ٹارچ رکھی ہوئی تھی۔ اب حد ہو گئی تھی۔ اس کی بکواس مسلسل جاری تھی۔ اس کو تھوڑا سا سبق سکھانا ضروری ہو گیا

قبل۔ ناصر مرزا نے بائیں ہاتھ میں ٹارچ تھام کر اس کا بٹن ایک دم آن کر دیا۔ ٹارچ کی تیز روشنی اس غبیث پر پڑی۔

ایک لمحے کو ناصر مرزا کا دل کانپ کر رہ گیا۔ وہ انتہائی خوفناک شکل کا جانور تھا۔ وہ نہ کتا تھا نہ بھیڑیا تھا۔ وہ ان دونوں سے ملتا جلتا ضرور تھا لیکن وہ چیز ہی کچھ اور تھا۔ اس کا قد بھی گدھے جتنا تھا۔ ٹارچ کی روشنی پڑتے ہی وہ جیسے کسی غبارے کی طرح پھٹ گیا۔ ایک تیز غراہٹ سنائی دی اور پھر سامنے کچھ نہ رہا۔

ناصر مرزا نے فوراً ہی ٹارچ بند کر دی اور اپنا عمل جاری رکھا۔ کمرے میں پھر سے گہری تاریکی چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

ورشا اوپر پہنچی تو برکھا کو شدت سے منتظر پایا۔ وہ اسے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھی۔ ”اوہ میری جان!“ یہ کہہ کر اس نے ورشا کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ برکھا کے گلے لگتے ہی اسے شدید بدبو کا بھبکا محسوس ہوا۔ وہ جلدی سے اس سے الگ ہو گئی اور زبردستی مسکرائی۔ ”ہائے ممی!“

”کیا ہوا؟“ برکھا نے ورشا کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیڈ پر بٹھا لیا جبکہ واسم دروازہ کھول کر گیلری میں چلا گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر سمندر کو دیکھنے لگا۔ سمندر دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ سنائی ضرور دے رہا تھا۔ لہروں کی آواز اندھیرے میں بڑی خوفناک محسوس ہو رہی تھیں۔

”ممی جو تم چاہتی تھیں، وہ ہو گیا ہے۔“ ورشا نے گہرا سانس لے کر کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے لہجے سے اداسی ظاہر نہ ہو، اس لیے وہ تھوڑا سا مسکرائی بھی۔ ”وہ سو رہا ہے، گہری نیند۔ میں نے اسے بوٹی بھی کھلا دی ہے اور تکیہ بھی اس کے سر کے نیچے رکھ دیا ہے۔“

”اوہ، میری بچی، تیرا جواب نہیں۔“ وہ ورشا کا ہاتھ چومتی ہوئی بولی۔ ”مجھے مانا حاصل ہو جائے، پھر دیکھ میں تیرے لیے کیا کرتی ہوں۔“

”ممی، بھاڑ میں جائے تمہارا مانا۔“ اسے ایک دم غصہ آ گیا لیکن یہ ایسا غصہ تھا جس کا اظہار ممکن نہ تھا۔ وہ اندر ہی اندر غصے کو پی گئی۔ اس طرح زبان پر آئے ہوئے الفاظ بھی آواز نہ بن سکے۔

اس نے خاموش نگاہوں سے ممی کو دیکھا اور پھر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

”کیا ہوا ورشا..... تم کچھ پریشان ہو۔“ برکھا نے پوچھا۔

”نہیں ممی! میں ٹھیک ہوں۔“

”اچھا تم لیٹ جاؤ..... لاؤ، میں تمہارا سر دبا دوں۔“ برکھا نے تیز نظروں سے اس کی پیشانی کی طرف دیکھا اور کچھ پڑھ کر پھونکا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے سر میں اٹھی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”اوہ ممی۔“

”لیٹ جاؤ۔“ برکھا نے حکم دیا۔ اس کے لہجے میں غراہٹ آ گئی تھی۔

”اچھا ممی۔“ ورشا کے حواس یکدم جواب دے گئے۔ اسے لگا جیسے اسے جکڑ لیا گیا ہو۔ اس نے بے بسی سے برکھا کی طرف دیکھا اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

برکھا نے اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کر دیئے۔ اس کے سر سے تکیہ نکال دیا۔ سر ذرا سا اوپر کر دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ ایک ٹک چھت کو گھورے جا رہی تھی۔

''ورشا! آنکھیں بند کر لو اور یاد رکھو اب تم اس وقت تک نہیں اٹھو گی جب تک میں یہ نہ کہوں کہ ورشا اٹھ جاؤ۔ سن لیا تم نے ورشا۔'' اس نے حکم دیا۔

''جی ممی! میں نے سن لیا..... میں آنکھیں بند کر رہی ہوں۔'' ورشا نے کسی معمول کی طرح آنکھیں بند کر لیں۔

''واسم!'' برکھا نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے آواز دی۔

''جی برکھا جی۔'' وہ فوراً اندر آ گیا۔

''دیکھو، یہاں ورشا لیٹی ہے۔ میں نیچے جا رہی ہوں۔ تم گیلری میں کھڑے رہو گے۔ ذرا آنکھیں کھلیں رکھنا۔''

''جی!'' اس نے سر جھکا کر کہا۔

''جاؤ!'' برکھا نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

واسم فوراً دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا اور گیلری میں مستعد ہو کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ بند ہونے کے بعد برکھا نے ہاتھ اٹھا کر ایک زوردار انگڑائی لی۔ رقص کے انداز میں گھومی اور پھر بڑے سرشار انداز میں دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگی۔

ساحل عمر آنکھیں موندے لیٹا تھا' اسے اپنی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس پر کیا گزرنے والی ہے۔ برکھا آنکھوں میں خواہشات کے خواب سجائے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہوتی' زینے کا دروازہ دھاڑ سے کھلا۔ واسم تیزی سے اندر آیا۔ وہ واسم کو اپنے سامنے پا کر غصے سے چیخی۔ ''کیا ہے؟''

''برکھا جی غضب ہو گیا۔'' وہ بمشکل بولا۔

☆.....☆.....☆

واسم نے بڑے غلط وقت پر مداخلت کی تھی۔ برکھا اسے دیکھ کر ایک دم جل اٹھی تھی۔ وہ بھڑکتا شعلہ بن گئی تھی۔ لیکن جب اس نے واسم کے چہرے پر نظر کی' تو اسے احساس ہوا کہ کوئی سنگین صورت حال ہے۔ واسم کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ اگر کوئی سنگین صورت حال نہ ہوتی تو واسم ہرگز مداخلت بے جا کا مرتکب نہ ہوتا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ واسم حکم کا غلام تھا' لیکن عقل بھی رکھتا تھا۔ اس وقت اس نے اسی لیے حکم عدولی کی تھی۔ اپنی حد دو توڑ کر برکھا کے ''شبستان'' میں داخل ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا؟ جلدی بولو؟'' برکھا نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہ تہکال آ رہا تھا؟'' واسم نے پوری صورت حال ایک جملے میں بیان کر دی۔

''تہکال'' وہ کچھ حیرت اور کچھ غصے سے بولی۔ پھر وہ فوراً ہی قالین پر آسن جما کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بازو پر اس جگہ انگوٹھا رکھ کر دبایا جہاں بچھو اس کے بازو پر گدا ہوا تھا۔ انگوٹھا اس

نے بچھو کے منہ پر رکھا اور پھر اس نے اپنے منہ سے کچھ عجیب سے لفظ نکالے اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی "اعور مدد...... اعور مدد...... اعور ہاسکل کو بھیج۔"

جھکال جواب ہٹ کے نزدیک آ پہنچا تھا اور جس کے لیے بند دروازے اور پتھر کی دیواریں کوئی معنی نہ رکھتی تھیں' چند لمحوں بعد وہ برکھا کو اس کے کیے کی سزا دینے والا تھا کہ اندھیرے کو چیرتا ہوا ہاسکل نمودار ہوا۔

وہ ہاسکل جو نہ کتا تھا اور نہ بھیڑیا' لیکن گدھے کی طرح جسیم تھا۔ اس کی خوفناک چمکتی آنکھیں...... سیاہ رات جیسا رنگ۔ وہ تاریکی میں محض اپنی آنکھوں کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ اس نے چھلانگیں مارتے جھکال کی ایک ٹانگ اپنے بڑے سے بھیانک منہ میں دبا کر چبا ڈالی۔

جھکال اس ناگہانی مصیبت کو سمجھ نہ پایا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے سامنے کسی ایسی چیز کو پایا' جسے اس نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے اور باہر کی فضا خوفناک آوازوں سے گونجنے لگی۔

کچھ دیر کے بعد ایک دم سناٹا چھا گیا۔ بس موجیں مارتے سمندر کی آواز باقی رہ گئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن تین بجے کے قریب ساحل عمر کے گھر کے سامنے ایک گاڑی رکی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر دونوں ماں بیٹی براجمان تھیں اور اگلی سیٹ پر ساحل عمر موجود تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر پچھلی کھڑکی پر آیا۔ ادھر برکھا اور دوسری طرف ورشا بیٹھی تھی۔ ساحل عمر نے جھک کر گاڑی کے اندر جھانکا۔

ورشا نے اسے دیکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن ساحل عمر نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ برکھا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب برکھا نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا' اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ساحل عمر نے اس کا ہاتھ بے تابی سے تھام لیا۔ ورشا یہ دیکھ کر ایک دم بجھ سی گئی۔

"اچھا ساحل پھر ملیں گے۔ دیکھو فون کرنا نہ بھولنا۔ میں انتظار کروں گی۔" جو بات ورشا نے کہنا تھی' وہ برکھا نے کہی۔

"کیوں نہیں برکھا جی' میں آپ کو ضرور فون کروں گا۔" جو بات ورشا نے سننا تھی وہ برکھا نے سنی۔

"اچھا بائی۔" برکھا نے اسے چمکتی آنکھوں سے رخصت کیا۔

"بائی۔" وہ یہ کہہ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"واسم چلو!" برکھا نے حکم دیا۔

برکھا کے حکم کے ساتھ ہی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ساحل عمر بڑی دلچسپی سے گاڑی کو جاتا دیکھتا رہا۔ جب وہ گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی' تو اس پر اداسی سی چھا گئی' اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی گاڑی نکال کر ان لوگوں کے پیچھے ہو لے۔

پھر وہ بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ بیل بجانے پر دروازہ اماں نے کھولا۔

اسے دروازے پر پا کر ایک دم کھل گئیں۔ ایک رات کی غیر موجودگی اماں پر بھاری پڑی تھی۔ ساحل عمر گھر سے غائب تو رہتا تھا' لیکن کبھی پوری رات کے لیے غائب نہ ہوا تھا۔ اماں کو اسے دیکھے بغیر کہاں قرار تھا۔

''آ گئے بیٹے!'' اماں نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے ہاتھ سے بیگ لینے کی کوشش کی۔

''نہیں اماں! بیگ میں کوئی وزن نہیں ہے۔'' ساحل عمر نے مسکرا کر کہا۔ ''خیریت تو رہی؟''

''ہاں بالکل!'' اماں نے گیٹ بند کر کے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''ساحل رات تو گزر گئی لیکن آج کا دن بڑی مشکل سے گزرا ہے۔''

''کیوں اماں؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''بس تم یاد آئے جا رہے تھے۔'' اماں نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ اماں! میں کون سا دبئی چلا گیا تھا۔'' ساحل عمر گھر میں داخل ہوتا ہوا بولا۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا کہ گیارہ بارہ بجے تک آ جاؤں گا۔ میرا خیال تھا کہ ہم ناشتہ کر کے وہاں سے نکل آئیں گے۔ لیکن ورشا کھانا پکانے میں لگ گئی۔ پھر ہم وہاں سے کھانا کھا کر نکلے۔ اس لیے دیر ہو گئی۔''

''تو کیا ہوا..... اچھا ہوا تم گھوم پھر آئے۔'' اماں نے بیگ اس سے لیتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ' آرام کرو۔ پھر رات کو باتیں ہوں گی۔''

''بس اماں آرام کیا کروں گا۔ تھوڑا سا نہا لوں۔ بدن چپک رہا ہے اور ہاں..... اماں کسی کا فون تو نہیں آیا؟'' ساحل عمر نے پوچھا۔

''نہیں' اتفاق سے کسی کا فون نہیں آیا۔'' اماں نے بتایا۔

جب وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا' تو سب سے پہلے اس کی نظر رشا ملوک کی تصویر پر لٹکے تعویذ پر پڑی۔ اس تعویذ کو ساحل عمر نے بڑی اجنبی نگاہوں سے دیکھا اور رشا ملوک کے چہرے کو تو اس نے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ وہ اپنی تصویر کے سامنے سے اس طرح گزر گیا' جیسے یہ پینٹنگ کسی اور نے بنائی ہو۔ ایسی بے رخی کہ آدمی کا دل کٹ کر رہ جائے۔

جب وہ نہا کر باہر نکلا تو ایک خیال اس کے دل میں جڑ پکڑتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ خیال اس کے دل میں نہاتے ہوئے آیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس خیال کو کسی نے بلند آہنگ میں اس کے دل میں ڈالا ہو۔ پھر یہ خیال بوند بوند اس کے دل پر برستا رہا اور جب وہ نہا کر باہر آیا تو یہ خیال بڑی حد تک پختہ ہو گیا تھا۔

کپڑے تبدیل کر کے اس نے بال بنائے۔ پھر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ہوئے اس کی نظر بار بار تعویذ پر پڑ رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا' تو وہ کب کا اس تعویذ کو اپنے گلے میں ڈال چکا ہوتا۔ لیکن اس وقت تو اس کے دماغ میں کچھ اور ہی بات تھی۔

بالآخر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے تعویذ اتار کر اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لیا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ اماں سامنے موجود نہ تھی۔ وہ خاموشی سے گھر کے پچھواڑے آ گیا۔

باغبانی کا اسے خاصا شوق تھا اور یہ شوق اسے اپنی ممی سے ملا تھا۔ اس گھر میں جتنے پیڑ پودے نظر آتے تھے وہ اس کی ممی کے ہاتھوں کے لگے ہوئے تھے۔ اس کی ممی پیڑ پودوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوتیں تو ساحل عمر بھی ان کے ساتھ چلا آتا۔ وہ اپنی ممی کے ساتھ باغبانی میں دلچسپی لیتا' ان کا ہاتھ بٹاتا۔ ان کے انتقال کے بعد تو اس نے پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ اگرچہ ہفتے میں دو تین بار ایک مالی پیڑ پودوں کی دیکھ بھال کے لیے آتا تھا اور یہ مالی بہت پرانا تھا' ممی کے زمانے سے آتا تھا۔ پھر بھی بہت کام ہوتے تھے۔ سب سے بڑا کام تو پودوں کو پانی دینے کا ہوتا ہے۔

گھر کے پچھواڑے ایک سلور کی پرانی بالٹی پڑی تھی۔ اس کے اندر کئی قسم کی کھرپیاں پڑی تھیں۔ ساحل عمر نے ایک تیز کھرپی نکال لی اور کھڑے ہوکر زمین کا جائزہ لینے لگا۔ تب اسے ایک کونا نظر آیا۔ یہ اس کام کے لیے مناسب جگہ تھی۔

اس نے جلدی جلدی تیز کھرپی سے اس کونے کی مٹی کھودی اور جب چھ انچ گہرا ایک چھوٹا سا گڑھا بن گیا' تو اس نے اپنی جیب سے تعویذ نکال کر گڑھے میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو مٹی ڈال کر دوبارہ بھر دیا۔ پھر کھرپی سے زمین کو برابر کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہوکر وہ بڑے اطمینان سے اٹھا اور کھرپی بالٹی میں پھینک کر جب مڑا تو اماں کو اپنے سامنے کھڑے پایا۔ ان کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور وہ اسے ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک آ پہنچی تھیں۔

''کیا کر رہے تھے؟ کوئی نیا پودا لگایا ہے کیا؟'' اماں نے اسے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے دیکھا تھا۔

''ہاں اماں!'' ساحل عمر نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر بولا ''اماں' چائے اندر لے آؤ' میں ذرا ہاتھ دھولوں۔''

''ہاں بیٹا چلو!'' اماں اس کے پیچھے پیچھے ہولیں۔

☆.....☆.....☆

یہ وظیفے کی دوسری رات تھی۔ پہلی رات بخیر وخوبی گزر گئی تھی۔ پہلی رات ہاسکل ڈرانے آیا تھا۔ وہ جانور' جو نہ کتا تھا اور نہ بھیڑیا۔ ناصر مرزا نے جب اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو وہ اس طرح غائب ہوا جیسے کسی غبارے میں سوئی چبھو دی جائے۔ غبارہ پھٹ جائے تو پھر نظر کہاں آتا ہے۔ وہ بھی کسی غبارے کی طرح پھٹا تھا اور پھر غائب ہوگیا تھا۔ ناصر مرزا تیزی سے وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے پھینک رہی تھیں۔

کمرے میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وظیفے کو اندھیرے ہی میں پڑھنا تھا۔ پڑھتے پڑھتے اچانک کمرے میں روشنی کا احساس ہوا' انہیں حیرت ہوئی کہ یہ روشنی کہاں سے آئی۔ شبہ ہوا کہ کہیں کوئی پردہ تو ہٹا نہیں رہ گیا۔ سڑک سے کوئی گاڑی گزری ہو تو اس کی لائٹ اندر آگئی ہو۔ ایسا نہیں تھا۔ اگر پردہ ہٹا ہوا ہوتا اور لائٹ کہیں باہر سے آئی ہوتی' تو وہ اب تک ختم ہو چکی تھی۔

یہ روشنی تو مسلسل تھی۔ تب ناصر مرزا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو اس پر منکشف ہوا کہ یہ روشنی

باہر کی نہیں' اندر کی ہے۔ اس کے سامنے ایک دیا روشن تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے ہاتھ بڑھا کر اس دیے کے ساتھ ایک اور دیا رکھ دیا ہو۔

کھیل شروع ہو چکا تھا۔ ناصر مرزا مستعد ہو گیا۔ اس کی انگلیاں مستقل دانے پھینک رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک اور دیے کا اضافہ ہوا۔ یہ تینوں دیے بڑے سلیقے سے برابر برابر رکھے تھے۔

کوئی دیا آگے تھا نہ کوئی پیچھے تھا۔ ان کی لو بھی برابر تھی۔

کمرے میں ایک ناگوار بو پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔

تین دیوں کی روشنی سے کمرے کی خاصی تاریکی دور ہو گئی تھی۔ ناصر مرزا چوکس تھا۔ وہ اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا' اس کی توجہ ہٹانے کے لیے تھا۔ عمل کا تسلسل روکنے کے لیے تھا۔ حافظ موسیٰ نے ہر بات بہت واضح طور پر سمجھا دی تھی۔ انہوں نے بتا دیا تھا کہ عمل کا تسلسل روکنے کے لیے مختلف مظاہر سامنے آئیں گے۔

مظاہرہ ہو رہا تھا۔ تین دیے روشن ہو چکے تھے۔ ناگوار بو آنی شروع ہو گئی تھی۔ جب اس سے عمل کا تسلسل نہ ٹوٹا' تو نیا ناٹک رچایا گیا۔

ان تینوں دیوں کے پیچھے سے بچھوؤں نے برآمد ہونا شروع کیا۔ وہ بڑی تیزی سے چراغوں کے پیچھے سے نکل نکل کر ادھر پھیلنے لگے۔ کچھ ناصر مرزا کی طرف بڑھے۔ پھر چند لمحوں میں ان بچھوؤں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کمرے میں ہر طرف بچھو ہی بچھو دکھائی دینے لگے۔

اب ان بچھوؤں نے چاروں طرف سے ناصر مرزا کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک مرحلہ تھا۔ یہ ایک ایسا مظاہرہ تھا کہ مضبوط سے مضبوط دل والا بھی حوصلہ چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن ناصر مرزا حوصلہ چھوڑنے والوں میں سے نہ تھا۔

وہ وظیفہ شروع کرنے سے پہلے مصلے کے چاروں طرف حصار کھینچتا تھا۔ پر مصلے پر بیٹھتا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس حصار کو توڑ کر اندر آنا کسی بھی مخلوق کا ممکن نہ تھا۔ یہ یقین اپنی جگہ' لیکن جب آدمی کسی تجربے سے گزرتا ہے اور وہ بھی کسی بھیانک تجربے سے' تو بعض اوقات یقین دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہ مرحلہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔

یہ بچھو جب حصار تک پہنچے تو حصار کی نادیدہ لائن سے ٹکراتے ہی وہ اس طرح واپس پلٹے جیسے چوہے بلی کو دیکھ کر بھاگتے ہیں۔ ان میں بری طرح بھگدڑ مچ گئی۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر غائب ہونے لگے۔

چند لمحوں بعد وہاں ایک بھی بچھو نہ رہا۔ ناصر مرزا نے وظیفہ پڑھتے پڑھتے ایک پھونک ماری۔ پھونک مارتے ہی وہ دیے جھلملا کر بجھ گئے۔ کمرے میں پھر سے تاریکی پھیل گئی۔ ناگوار بو بھی جاتی رہی۔

اس طرح وظیفے کی دوسری رات بھی بخیر و خوبی گزر گئی۔

☆.....☆.....☆

اماں ایک جہاندیدہ خاتون تھیں۔ وہ اس بات کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھیں۔ جب

سے ساحل عمر ایک رات سمندر پر گزار کر آیا تھا' اس کے اطوار تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ ساحل عمر نہ رہا تھا کچھ اور ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بڑی تیزی سے زرد ہوتا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ یرقان کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہو۔

اماں نے اسے ٹوکا تو ساحل نے اسے ان کا وہم گردانا۔ اس نے کہا "اماں نہ میری صحت کو کچھ ہوا اور نہ میری رنگت کو۔ میں پہلے جیسا ہشاش بشاش ہوں۔ مکمل طور پر صحت مند آپ کو یہ محض وہم ہوا ہے۔"

اس کی رنگت ہی تبدیل نہیں ہوئی تھی' اس کی عادتوں میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ وہ اگر کہیں بیٹھا ہے اور اس کی نظر کسی چیز پر جم گئی ہے' تو بس اسے دیکھے جا رہا ہے۔ اماں اس کو ٹوکتیں' تو وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگتا۔ پھر سوال کرتا: "کیا ہوا اماں؟"

"تم دیوار کو کیا گھورے جا رہے تھے؟"

"ارے نہیں اماں! یہ محض آپ کا وہم ہے۔" وہ ہنس کر انہیں ٹال دیتا۔

اماں جب بھی اسے اس کی کسی غیر معمولی حرکت سے ٹوکتیں یا نشاندہی کرتیں' تو وہ بڑی صفائی سے ان کا وہم قرار دے دیتا۔ اماں اس کی بات سن کر چپ تو ہو جاتیں' لیکن ان کا دل مطمئن نہ ہوتا۔ وہ جو کچھ دیکھ رہی تھیں' اس سے ان کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اماں نے ساحل عمر کو جنم نہیں دیا تھا' لیکن وہ ان کے لیے جگر کے ٹکڑے سے کم نہ تھا۔ وہ ان کی گود میں پل کر جوان ہوا تھا۔ وہ اسے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

وہ جو کچھ محسوس کر رہی تھیں' صحیح محسوس کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ساحل عمر کو ہوا کیا ہے۔ کوئی ایسا بھی نہ تھا' جس سے بات کر کے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتیں۔ لے دے کر ایک مرجینا تھی۔ وہ ایک ہمدرد قسم کی ملازمہ تھی۔ اس نے بھی "صاحب" میں ہونی تبدیلیوں کو محسوس کیا تھا۔ اماں نے اس کی بات سن ضرور لی تھی' لیکن اسے ہم راز نہیں بنایا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مرجینا' ساحل عمر کے سامنے کوئی ایسی بات کرے' جو اس کی ناراضگی کا سبب بنے۔

وہ ساحل عمر کی طرف سے خاصی فکرمند تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس سلسلے میں کسی سے بات کریں۔ سوچتے سوچتے ان کے ذہن میں ناصر مرزا کا نام آیا۔ بات تو خیر مسعود آفاقی سے بھی کی جا سکتی تھی۔ دونوں ہی اس کے دوست تھے اور دونوں ہی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ لیکن مسعود آفاقی کچھ کھلنڈرا سا تھا۔ اماں کو یقین نہیں تھا کہ وہ جو کچھ اسے بتائیں گی' وہ بات اسی طرح اس کی سمجھ میں بھی آ جائے گی۔ البتہ ناصر مرزا کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ ایک جہاندیدہ شخص ہے' وہ اسے جو کچھ بتائیں گی' اگر وہ من و عن اس بات پر یقین نہیں کرے گا' تو اس بات کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھیں کہ ناصر مرزا کو فون کر کے ساحل عمر کے بارے میں بتائیں کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر ابھی تک سو رہا تھا۔ یہ صبح دس بجے کا وقت تھا۔ اماں نے ٹی وی لاؤنج

میں رکھے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!" اماں بولیں۔

"اماں! میں ناصر بول رہا ہوں۔ یہ ساحل کہاں ہے؟"

ناصر کی آواز سن کر اماں ایک دم خوش ہوگئیں۔ اس وقت اگر وہ کچھ اور بھی سوچ لیتیں تو پورا ہو جاتا۔ انہوں نے خوش ہو کر کہا "بڑا اچھا ہوا جو تمہارا فون آ گیا۔"

"وہ کیوں اماں؟" ناصر مرزا نے پوچھا۔

"وہ تم سے خود بات کرنے کا سوچ رہی تھی۔"

"میں تم سے خود بات کرنا چاہ رہی تھی۔ ساحل ٹھیک ہیں' اس وقت سو رہے ہیں۔" اماں نے بتایا۔

"اب تک سو رہا ہے؟ کیا رات کو دیر تک جاگتا رہا۔"

"دو چار روز سے ساحل کے شب و روز بالکل تبدیل ہو چکے ہیں۔ مجھے تو ساحل' ساحل ہی نہیں لگتے۔" اماں نے اصل موضوع چھیڑا۔

"ارے اماں ایسا کیا ہوا؟" ناصر مرزا نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

اماں نے جو تبدیلیاں نوٹ کی تھیں' وہ ناصر مرزا کے گوش گزار کر دیں۔ ساری باتیں سن کر ناصر مرزا نے پوچھا "ایسا کب سے ہوا.....؟ میرا مطلب ہے یہ تبدیلی کب سے آئی ہے۔"

"دو چار دن پہلے وہ سمندر پر گئے تھے' وہاں ایک رات رہے بھی۔" انہوں نے بتایا۔

"ہیں!" ناصر مرزا حیران ہوا۔ "کس کے ساتھ گیا تھا وہ' سمندر پر.....؟"

"درشا کے ساتھ' وہ خود لینے آئی تھی۔"

"اوہ!" ناصر مرزا نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ "اچھا اماں آپ پریشان نہ ہوں' میں گھر آتا ہوں۔ وہ اٹھ جائے تو ٹھیک ہے' ورنہ میں خود ہی آ کر اٹھاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" اماں نے ایک پراطمینان سانس لیا۔ ناصر مرزا سے بات کر کے انہیں خاصی تشفی ہوگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ساحل عمر ایک اونچے پتھر پر کھڑا بھیگ رہا تھا۔ بارش بہت تیز تھی' اتنی تیز کہ چاروں طرف دھواں پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑی علاقہ' قریب میں بہتا دریا.....موسلا دھار بارش..... تنہا بھیگتا ساحل.....

اچانک ساحل کا کسی نے ہاتھ پکڑا۔ یہ ایک نرم ملائم ہاتھ تھا' لیکن اس ہاتھ کی گرفت سخت تھی۔ وہ اسے تیزی سے کھینچتی ہوئی ایک طرف لے جا رہی تھی۔

جب وہ ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچا تو ساحل عمر نے دیکھا کہ وہ رشا ملوک ہے۔ وہی سفید ریشمی' لبادہ جو بارش میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گیا تھا۔ اس نے اپنے لباس کو درست

کیا اور کسی قدر غصے میں بولی ''تمہیں بارش میں بھیگنے کا زیادہ شوق ہے' تم بھاگ کر اس درخت کے سائے تلے کیوں نہیں آ گئے؟''

''ہاں! مجھے بارش میں بھیگنے کا بہت شوق ہے۔ میں بھیگ رہا تھا تو بھیگنے دیتیں۔ مجھے یہاں کیوں لے آئیں؟'' ساحل عمر نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''تم نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کی بارش ہے۔ تم پر یہ بارش کس قسم کے اثرات مرتب کرے گی۔ میں تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔''

''تم کون ہو' مجھے روکنے والی۔ میں جو چاہے کروں۔ بارش میں بھیگوں یا دریا میں نہاؤں۔ ہٹو میرے سامنے سے۔ کتنی خوبصورت بارش ہے اور تم خواہ مخواہ مجھے اس بارش میں نہانے سے منع کر رہی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ درخت کے نیچے سے نکلا اور تیزی سے بھاگتا ہوا' پھر اسی اونچے چبوترے پر آن کھڑا ہوا' جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑا تھا۔ بارش موسلا دھار جاری تھی۔ وہ آنکھیں موندے پھر سے اس بارش میں بھیگنے لگا۔

''ساحل' میری بات مان لو' مت بھیگو بارش میں..... یہ بے موسم کی بارش ہے۔ تم بیمار ہو جاؤ گے' کمزور ہو جاؤ گے۔ بے بس ہو جاؤ گے۔ وہ ایسا ہی چاہتی ہے۔'' رشاملوک نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ساحل عمر نے اس کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی اس بے رخی پر رشاملوک کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ جس بے موسم کی بارش میں وہ بھیگ رہا ہے' نہ بھیگے۔ اس نے پھر اس بارش سے بچانے کے لیے قدم اٹھائے' لیکن پھر رک گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ساحل عمر ضدی ہے' وہ کبھی اس کی بات نہ مانے گا۔ پھر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ساحل عمر انجان ہے۔ اسے ہوش نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے کتنا نقصان پہنچ گیا ہے اور مزید کتنا پہنچنے والا ہے۔

''ساحل عمر میں جا رہی ہوں۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''اب بھی وقت ہے' اس گھنے درخت کے نیچے آ جاؤ۔''

''جاؤ!'' اس نے اس کی طرف پیٹھ موڑے موڑے کہا۔ ''مجھے کسی بات کی کوئی پروا نہیں۔''

''کاش! تمہیں پروا ہوتی۔ کاش! تم میری بات سمجھ سکتے۔'' رشاملوک نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''میں کسی کی کوئی بات نہیں سمجھنا چاہتا۔ مجھے یہ بارش بہت اچھی لگ رہی ہے' مجھے بہت مزا آ رہا ہے۔'' ساحل عمر نے خوش ہو کر کہا اور جب اس نے پیٹھ موڑ کر دیکھا تو درخت کے نیچے کچھ نہ تھا۔

ابھی اسے گئے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ یہ بارش خون کی بارش میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے کپڑے خون میں سرخ ہو گئے۔ پھر اس نے جہاں بھی نظر ڈالی' ہر طرف خون ہی خون نظر آیا۔ سارا پانی خون میں تبدیل ہو چکا تھا۔

تب گھبرا کر اس نے رشاملوک کو آواز دینا چاہی' لیکن آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کوئی آواز دے رہا تھا۔ ''ساحل اٹھو بھئی..... آخر کب تک سوتے رہو گے؟''

جب اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے دیکھا کہ ناصر مرزا اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

''کیا ہوا ساحل؟'' ناصر مرزا نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے فوراً ہی سر چھوڑ دیا۔ ''تم کب آئے؟''

''ابھی آیا ہوں۔'' ناصر مرزا نے کہا اور اس کا چہرہ غور سے دیکھتا ہوا بولا ''یار! یہ تمہاری حالت کیا ہو رہی ہے۔ تمہارا چہرہ ایک دم زرد ہو رہا ہے۔ تمہیں یرقان تو نہیں ہو گیا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ صور اماں نے تمہارے کانوں میں پھونکا ہوگا۔'' وہ بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''اماں کو کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے..... کیا مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ مجھے لگتا ہے تم نے کئی دنوں سے آئینہ نہیں دیکھا۔'' ناصر مرزا نے کہا۔

وہ بغیر کچھ جواب دیئے واش روم میں گھس گیا اور دروازہ زور سے بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا لی۔

اماں' جو دروازے پر کھڑی تھیں۔ انہوں نے ناصر مرزا کی طرف دیکھا۔ ناصر مرزا نے ان کی نگاہوں کا مفہوم سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اماں' معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ وہ ساحل عمر ہی نہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا' جو مجھے فون کر کے بتا دیا۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔''

اس کے واش روم سے نکلنے کے بعد ناصر مرزا نے اس سے جو بھی بات کی' اس بات کا اس نے مختصر اور گول مول جواب دیا۔ ناصر مرزا حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو کر اس کے جوابات سن رہا تھا۔

''ساحل تمہیں میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا ہوگا' تم مجھے بیمار دکھائی دے رہے ہو۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بلکہ پہلے سے زیادہ چاق و چوبند ہوں۔''

''مرحوم عابد منجم نے تمہیں منع کیا تھا کہ ورثا سے اب نہیں ملنا۔ تم ملنا چھوڑنے کے بجائے اس کے ساتھ سمندر پر چلے گئے؟'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''عابد منجم کو بلاوجہ کوئی غلط فہمی تھی۔ ورثا بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اچھی اس کی ماں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان سے ملنے میں کوئی حرج ہے۔''

''یہ بات تم کہہ رہے ہو' تم نہیں جانتے ہو کہ میری بھتیجی کی قاتلہ برکھا ہے۔''

''وہ دونوں ماں بیٹیاں اتنی معصوم سی تو ہیں' وہ کیا کسی کو قتل کریں گی یار!''

''ہیں!'' ناصر مرزا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ ''تمہیں ضرور ان منحوسوں نے کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔ پہلے تو تم نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی۔''

''پہلے میں انہیں زیادہ جانتا نہ تھا۔''

''تمہارے گلے میں مجھے تعویذ نظر نہیں آرہا۔'' اچانک ناصر مرزا کی نظر اس کے گلے پر پڑی۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ گلے میں تعویذ نظر نہیں آرہا تھا۔

تعویذ کا ذکر سن کر ساحل عمر ایک لمحے کو چونکا۔ پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور بڑے اطمینان سے بولا ''یار پتا نہیں وہ تعویذ کہاں گیا۔ میں واش روم میں جاتا تھا تو اس تصویر کے فریم پر لٹکا دیا کرتا تھا۔ اسی تصویر سے وہ غائب ہوگیا۔''

اپنے اس جھوٹ پر ساحل عمر خود بڑا حیران ہوا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اصل بات ناصر مرزا کو بتا دے کہ اس نے تعویذ دفن کردیا ہے اور یہ دفن بھی اس نے اپنی مرضی کے خلاف کیا ہے۔ وہ دفن نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن اندر سے کوئی اسے اس بات پر اکسا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس تعویذ کو دفنانے پر مجبور کردیا گیا۔

اس وقت بھی اس کی خواہش تھی کہ وہ ساری بات پوری ایمانداری سے ناصر مرزا کو بتا دے' لیکن اندر سے اسے کوئی جھوٹ بولنے پر مجبور کررہا تھا۔ زبان اس کی تھی' لیکن بول کوئی اور رہا تھا' جیسے اسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔

''ساحل تمہیں کیا ہوا ہے؟'' ناصر مرزا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ' تمہارے ساتھ سمندر پر کون کون تھا؟ کیا وہاں برکھا بھی تھی؟''

''رات کو میں اور ورشا اکیلے تھے' البتہ صبح کو برکھا پہنچ گئی تھیں۔'' ساحل عمر نے بتایا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ رات کو وہاں نہیں تھی۔''

''کیا بات کرتے ہو یار' وہ وہاں ہوتیں تو کیا نظر نہ آتیں' پھر انہیں چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔ جس طرح وہ صبح نظر آگئیں' رات کو بھی سامنے آسکتی تھیں۔ میں نے ورشا سے تنہا رہنے کی فرمائش تو نہ کی تھی۔'' ساحل عمر نے ذرا ناگوار لہجہ بنا کر کہا۔

''اچھا' ساحل اب تم ایک بات کان کھول کر سن لو..... تم اب گھر سے کہیں نہیں جاؤ گے۔ پرسوں صبح میں آؤں گا' تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم پر کیا بیت گئی ہے۔'' ناصر مرزا نے فکرمند ہوکر کہا۔

''او یار شکاری مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم خواہ مخواہ فکرمند مت ہو۔''

''شکاری!'' ناصر مرزا نے حیران ہوکر دہرایا۔ ''یہ تم کس کی زبان بول رہے ہو؟''

''اپنی زبان بول رہا ہوں۔'' ساحل عمر کو اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہوئی۔

''نہیں' تم یہ اپنی زبان نہیں بول رہے۔ میں جان گیا ہوں کہ تم کس کے انداز میں گفتگو کررہے ہو۔'' ناصر مرزا نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ساحل عمر نے چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں۔ ناصر مرزا نے واضح طور پر یہ بات محسوس کی کہ ساحل کی آنکھوں میں محبت کی چمک کے بجائے اجنبیت کا اندھیرا تھا۔

☆.....☆.....☆

آج پانچویں رات تھی۔

ناصر مرزا نے چار راتیں بخیر و خوبی گزاری تھیں۔ ان چار راتوں میں ہر رات ایک نیا ڈرامہ سامنے آیا تھا۔ ناصر مرزا کو حافظ موسیٰ جیسے زبردست شخص نے ہدایات نہ دی ہوتیں اور ہر بات اچھی طرح کھول کر نہ سمجھا دی ہوتی' تو وہ کب کا حوصلہ ہار بیٹھتا۔

چار راتیں صحیح سلامت نکل جانے کے بعد ناصر مرزا میں ایک نئی قوت' نئی توانائی آ گئی تھی۔

بس اب آج کی رات باقی تھی۔ ناصر مرزا بڑے اہتمام سے اپنے اسٹڈی روم میں آیا تھا۔ بارہ بجنے والے تھے۔ وظیفہ بارہ اور ایک بجے کے درمیان کیا جانا تھا۔ ناصر مرزا نے کمرے کے تمام پردے برابر کر دیئے۔ پھر لائٹ بجھا کر یہ چیک کیا کہ کہیں سے روشنی تو نہیں آ رہی۔ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف ایک پردہ ذرا کھسکا ہوا تھا۔ وہاں سے تھوڑی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ ناصر مرزا نے پردہ ٹھیک کیا' تو اسے ایک دم کسی کتے کے رونے کی آواز آئی۔

یہ آواز بڑی دل ہلانے اور دہلانے والی تھی۔ اس آواز کو اس نے سن رکھا تھا۔ یہ آواز اس کی سماعت میں محفوظ تھی۔ یہ اس عجیب جانور کی آواز تھی' جس کا قد گدھے کے برابر تھا اور صورت کتے کی تھی' نہ بھیڑیے کی۔ یہ آواز اتنے قریب سے آئی تھی کہ یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ جانور گھر کی چار دیواری میں موجود ہو۔

ناصر مرزا نے سوچا کہ ابھی تو اس نے وظیفہ بھی شروع نہیں کیا کہ ڈرامہ شروع ہو گیا۔ آج کی رات اللہ خیر کرے۔ وہ اسٹڈی روم کو اندر سے بند کر چکا تھا اور عمل کا وقت شروع ہونے والا تھا۔ ایک بار اس کے جی میں بھی آئی کہ وہ گھر سے باہر نکل کر دیکھے کہیں کوئی کتا تو اندر نہیں آ گیا۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ ہو سکتا ہے' اس طرح اسے عمل سے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس کی توجہ اور یکسوئی کو توڑنے کی ناکام جسارت کی جا رہی ہو۔ وہ کسی قیمت پر اب باہر نہیں جائے گا' چاہے چیک کوئی کتا ہی گھر میں کیوں نہ داخل ہو گیا ہو۔ گھر میں گھر کے دیگر افراد موجود ہیں۔ اگر واقعی یہ کسی کتے کی آواز ہے' تو وہ لوگ بھی سن لیں گے اور اگر محض اس کو بھٹکانے کے لیے یہ ناٹک کھیلا جا رہا ہے' تو یہ آواز محض اس تک ہی محدود رہے گی۔

دو تین بار اور یہ آواز آئی۔ ہر مرتبہ یہ آواز قریب ہوتی گئی۔ آخری بار تو یوں محسوس ہوا' جیسے وہ جانور کمرے میں ہی موجود ہو۔ ناصر مرزا نے روشنی چیک کرنے کے بعد لائٹ جلا دی تھی۔ وہ عمل کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے مصلہ بچھا دیا تھا۔ مصلہ بچھاتے ہوئے ہی رونے کی آواز آخری مرتبہ سنائی دی تھی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔

مصلہ بچھا کر ناصر مرزا نے گھڑی کی طرف دیکھا' بارہ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔ وظیفے کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ اس نے لائٹ بجھا کر اپنے گرد حصار کھینچا اور پھر مصلے پر بیٹھ گیا۔

تسبیح ہاتھ میں لے کر اس نے پڑھنا شروع کیا کہ آج مصلے پر ایک کھلا ہوا چمکدار چاقو بھی رکھا تھا۔ یہ ایک خطرناک شکاری چاقو تھا۔ اس کا پھل سات آٹھ انچ سے کم نہ تھا۔ ناصر مرزا جب شکار پر جاتا' تو اس چاقو کو وہ اپنے ساتھ ضرور رکھتا تھا۔ اس چاقو سے اس نے بیشمار جانور

ذبح کیے تھے۔

ایک تسبیح مکمل کر کے وہ اس چاقو کو اٹھاتا اور اس کے پھل پر پھونک مار کر مصلے پر رکھ دیتا۔ وظیفے کے دوران اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ محض اندازے سے چاقو اٹھاتا' ایک لمحے کے لیے آنکھیں کھول کر چمکتے پھل پر پھونک مارتا اور آنکھیں پھر سے بند کر لیتا۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند تھیں' لیکن اس کے کان پوری طرح کھلے ہوئے تھے۔ کمرے میں ہونے والی ہلکی سی آہٹ بھی اس کی سماعت میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔

پڑھتے پڑھتے اچانک اس کے کانوں میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کئی چمگادڑیں کمرے میں گھس آئی ہوں۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ کمرے کا ہر دروازہ اور ہر کھڑکی بند تھی۔ چمگادڑوں کا باہر سے آنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات فریب سماعت تھی' لیکن وہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ کو اپنے سر پر اس طرح محسوس کر رہا تھا' جیسے حقیقت میں چمگادڑیں کمرے میں گھس آئی ہوں۔

یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ حصار اس نے زمین پر کھینچا تھا۔ اس حصار کو توڑ کر اس تک پہنچنا ممکن نہ تھا' لیکن اس کے سر پر تو کوئی حصار نہ تھا۔ اس طرح کی صورت حال کے بارے میں کوئی نشاندہی بھی نہیں کی گئی تھی۔ اب جو کچھ کرنا تھا' اپنی حاضر دماغی سے کام لے کر ہی کرنا تھا۔

تسبیح پڑھتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے ٹارچ اٹھا کر روشنی کی اور اس کا رخ چھت کی طرف کر دیا۔ کمرے میں چار پانچ چمگادڑیں موجود تھیں اور وہ بڑی تیزی سے ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

سوا بارہ بجے کا عمل تھا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر اپنے بیڈروم میں موجود تھا۔ وہ کمرے میں اندھیرا کیے میوزک سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ گھنٹی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ڈیک کی آواز کم کر کے اس نے ریسیور اٹھایا اور دھیرے سے کہا "جی!"

"کیا کر رہے ہو ساحل؟" مترنم آواز میں پوچھا گیا۔

"اچھا! آپ ہیں۔" ساحل عمر نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔ "میں میوزک سن رہا تھا۔"

"تم وہاں اکیلے ہو' یہاں میں اکیلی ہوں..... میرے پاس آ جاؤ ناں؟" پیار سے کہا گیا۔

"اس وقت..... کیا بجا ہے؟" ساحل عمر نے پوچھا۔

"رات آدھی ہوئی ہے۔ یہی تو وقت ہے دوستوں کا دوستوں سے ملنے کا۔"

"آپ کہاں ہیں؟"

"میں اپنے گھر پر ہوں اور تمہاری منتظر' آ رہے ہو ناں؟"

"جی میں آ رہا ہوں' آپ میرا انتظار کیجیے۔ یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ لائٹ آن کر کے تیزی سے کپڑے تبدیل کیے۔ اس وقت وہ کسی روبوٹ کی طرح کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے اختیار

ہیں نہ تھا' اسے جو کہا گیا تھا' اس پر عمل کرنے کے لیے وہ مجبور تھا۔
کپڑے تبدیل کر کے اس نے گھر کی اور گاڑی کی چابی اٹھائی۔ گیٹ کھول کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کھلے گیٹ سے وہ گاڑی لے کر نکل گیا۔ اس نے گیٹ بند کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔
گھر کا گیٹ کھلنے اور گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز پر جب اماں ہانپتی کانپتی گیٹ تک پہنچیں۔ اس وقت ساحل کی گاڑی گلی کا موڑ کاٹ چکی تھی۔
ساحل عمر کے اس طرح نکل جانے پر اماں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

☆.....☆.....☆

کچھ دیر وہ گیٹ پکڑے کھڑی رہیں۔ آنکھوں کے آگے سے اندھیرا چھٹا تو وہ گم سم ہو گئیں۔ ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ اچانک ہوا کیا؟ ساحل عمر کہاں چلا گیا؟ کیسے چلا گیا؟

وہ اماں سے اس قدر بے نیاز کیسے ہو گیا۔ اس نے تو اپنے گھر کا بھی خیال نہ کیا۔ اس طرح گھر چھوڑ کر بھاگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ چند دنوں قبل جب وہ سمندر پر گیا تھا' تو اماں کی تنہائی کا خیال کر کے اس نے مرجینا کو ساتھ رکھنے کی ہدایت کی تھی اور آج' آدھی رات کو اماں سے اجازت لینے کی بات تو دور کی تھی' وہ گھر کا گیٹ ہی کھلا چھوڑ گیا تھا۔ وہ ڈاکوؤں کو دعوت دے گیا تھا۔

اماں چکرائی ہوئی تھیں۔ تھوڑے ہوش و حواس بحال ہوئے' تو انہوں نے گھر کا گیٹ بند کیا۔ اندر آ کر دروازے کی چٹخنی چڑھائی' اسے لاک کیا اور ساحل عمر کے بستر پر آ کر لیٹ گئیں۔ بستر پر لیٹتے ہی ان کے دل میں جذبات کا جوار بھاٹا اٹھا اور وہ سسک سسک کر رونے لگیں۔

روتے روتے وہ جانے کہاں پہنچ گئیں۔ اس دن بھی تو وہ رو رہی تھیں۔ ایک دم ہی ان پر دکھ کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ اپنے گھر میں جس طرح بیٹھی تھیں' ویسے ہی اٹھ کر نکل آئی تھیں۔ انہیں کسی نے روکنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ویسے بھی وہ رکنے والی نہ تھیں' لیکن اگر انہیں کوئی روکتا' تو وہ اس بات کو زندگی بھر نہ بھولتیں۔

بھولی تو خیر وہ کسی بات کو نہ تھیں۔ جب ماضی کی فلم ان کے دماغ میں چلنا شروع ہو جاتی' تو پھر یہ سلسلہ دور تک چلا جاتا۔ بچپن' شادی' شادی کے بعد کی زندگی' اولاد کا نہ ہونا' اولاد کے لیے سوچتن کرنا اور روز ساس کے طعنے سننا۔

وہ بے اولاد تھیں' تو اس میں ان کا کیا قصور تھا۔ اولاد تو اوپر والے کی دین ہے' جس کو چاہے دے' جس کو چاہے نہ دے۔ دینے پر آئے تو کچے آنگن کو بچوں سے بھر دے اور نہ دینے پر آئے تو سونے کے چمچے والے گھر میں ایک بچہ نہ پیدا ہونے دے۔ لیکن اماں کے گھر والے اور گھر والا' سبھی ان کا دوش جانتے تھے۔

کئی مہینے سے ساس دوسری شادی کی کھچڑی پکا رہی تھی۔ شوہر بھی دبے دبے لفظوں میں اشارے دے رہا تھا۔ اماں ساری باتیں بڑے صبر و سکون سے سن رہی تھیں۔ آخر ایک دن ان کے شوہر نے صاف لفظوں میں دوسری شادی کا ذکر کر ہی دیا۔

اماں نے اپنے شوہر کی بات بڑے صبر کے ساتھ سنی اور صرف اتنا کہا "جس دن اس گھر

میں میری سوکن داخل ہوگی' اسی دن بلکہ اسی وقت میں یہ گھر چھوڑ جاؤں گی' بس اتنا یاد رکھنا۔"

اماں کی بات سن کر ان کا شوہر ہنسا۔ اس نے مذاق سمجھا۔ کون عورت اس طرح اپنا گھر چھوڑتی ہے اور ایسی عورت' جس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ ان کے شوہر اور شوہر کی ماں نے اپنی سی کرلی۔ وہ دونوں مل کر گھر میں ایک نئی عورت لے آئے۔ یہ عورت اماں کی سوکن تھی۔

اماں نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ سوکن کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سوکن کے قدم گھر کے اندر کی طرف اٹھ رہے تھے اور اماں کے قدم باہر کی جانب اٹھ رہے تھے۔ وہ جس طرح بیٹھی تھیں' ویسے ہی پیروں میں چپل ڈال کر چل دی تھیں۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا' نہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

اماں کے شوہر اور ساس نے انہیں گھر سے نکلتے دیکھا۔ شوہر نے چاہا بھی کہ وہ دروازے پر جا کر اماں کو روک لے۔ تب ساس نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑلیا اور بے نیازی سے بولی "کہیں نہیں جائے گی' آجائے گی دھکے کھا کر۔"

ممکن تھا کہ اماں دھکے کھا کر واقعی اس گھر کی دہلیز پر لوٹ آتیں' لیکن ان کی قسمت میں دھکے نہ تھے۔ گھر سے نکل کر ان کا جدھر رخ تھا' ادھر چل پڑیں۔

اور پھر وہ چلتی گئیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کدھر جارہی ہیں۔ بس دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اب اس گھر میں نہیں رہنا' گھر سے بہت دور نکل جانا ہے۔ چلتے چلتے جب وہ تھک گئیں' تو فٹ پاتھ پر بیٹھ گئیں۔

ساحل عمر کے پاپا عمر عابد اور اس کی ممی ٹہل کر آرہے تھے۔ ساحل عمر ان دنوں چھ ماہ کا تھا۔ وہ روحی کی گود میں تھا۔ عمر عابد پیچھے بیکری پر ڈبل روٹی مکھن خریدنے رک گئے تھے اور روحی' ساحل کو گود میں لیے بلڈنگ کے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس وقت یہ لوگ گارڈن کے علاقے میں نئے بنے فلیٹ میں رہتے تھے۔

ساحل اس وقت روحی کی گود میں بری طرح مچل رہا تھا۔ اسے اچانک جانے کیا ہوا تھا۔ ایک دم رونا شروع کردیا تھا۔ شاید اسے اپنے پاپا نظر نہیں آئے تھے یا جانے کیا بات تھی۔

فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اچانک ہی اماں پر نظر پڑی تھی۔ وہ گھٹنوں میں منہ دیئے اور ٹانگوں کے گرد ہاتھ باندھے سسک سسک کر رو رہی تھیں۔

روحی نے ایک عورت کو رات کے دس بجے فٹ پاتھ پر روتے دیکھا تو وہ ٹھٹھک گئی۔ اس نے اس کے پاس کھڑے ہوکر پوچھا "کیا ہوا؟"

اماں نے کسی عورت کی آواز سنی تو فوراً گھٹنوں سے اپنا سر اٹھایا۔ جلدی جلدی دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ ساحل عمر' جو ابھی تک روحی کی گود میں روئے جارہا تھا' اماں کی شکل دیکھ کر ایک دم چپ ہوگیا۔ اماں نے بے اختیار اس کی طرف ہاتھ بڑھایا' تو وہ خاموشی سے ان کی گود میں چلا گیا۔

"بیگم صاحب! آپ کا بچہ بہت پیارا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسے پیار کرلوں؟" اماں

نے بڑے مہذبانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" روحی نے فوراً کہا۔

اماں نے ساحل کو پیار کیا' تو اس نے ان میں جانے کیا دیکھا کہ گلے سے لپٹ گیا۔ روحی نے اماں کے چہرے کو' ان کے لباس کو غور سے دیکھا۔ وہ اسے ایک شریف گھرانے کی عورت نظر آئیں۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ وہ فٹ پاتھ پر بیٹھی رو کیوں رہی تھیں۔

"آپ کون ہیں؟" ساحل عمر کی ممی روحی نے پوچھا۔

"میں کوئی نہیں ہوں۔" جواب ملا' جواب میں بڑا دکھ تھا۔

"کہاں سے آئی ہیں؟" روحی نے پھر سوال کیا۔

"کہیں سے نہیں۔" وہی دکھ بھرا لہجہ۔

"یہاں کیوں بیٹھی تھیں اور رو کیوں رہی تھیں؟"

"اپنے نصیبوں کو رو رہی تھی۔" یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگیں۔ ساحل عمر نے بڑی معصومیت سے روتی ہوئی اماں کو جھک کر دیکھا' تو وہ روتے روتے ایک دم چپ ہوگئیں اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ ساحل عمر پھر ان کے گلے سے لپٹ گیا اور اس طرح لپٹا کہ روحی کی بار بار کوشش کے باوجود اس کی گود میں واپس نہ آیا۔

تب روحی اماں کو اپنے گھر لے آئی۔ اماں پر جو گزری تھی' وہ انہوں نے سچ سچ کہہ سنائی۔ ان کی ساری روداد سن کر روحی نے اماں کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرلیا اور اس فیصلے کی بڑی وجہ ساحل عمر تھا' جسے اماں پسند آگئی تھیں۔ روحی گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ اماں کا ساتھ اسے سکھ دے سکتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے اماں کو اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

اماں کو بھی ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ روحی کے گھر سے اچھا ٹھکانہ ان کے لیے اور کیا ہوسکتا تھا۔ روحی نے اماں سے کہا "اس گھر میں میرے ساتھ جب تک رہنا چاہو رہو۔ جب تمہارا شوہر تمہیں لینے آجائے تو چلی جانا۔"

"نہیں' بیگم صاحبہ! اب میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ شوہر کو تو میں چھوڑ آئی۔ اول تو وہ آئے گا نہیں' اگر بھولا بھٹکا کبھی ادھر نکل آیا' تو میں اس کے ساتھ جاؤں گی نہیں۔ آپ نے نہ رکھا تو کوئی اور ٹھکانہ ڈھونڈ لوں گی' پر شوہر کے گھر نہیں جاؤں گی۔ یہ میں عہد کر کے نکلی ہوں۔" اماں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

بس پھر وہ دن اور آج کا دن' اماں نے اس گھر کی دہلیز کو ایسا پکڑا کہ پھر کبھی کہیں جانے کا نام نہ لیا۔ ساحل نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اب اس گرفت سے نکلنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ساحل عمر بھی اماں کا دیوانہ تھا' وہ ان کے بغیر رہتا ہی نہ تھا' پھر ساحل کی ممی اور پاپا کا سلوک بھی اماں کے ساتھ بہترین تھا۔ وہ دونوں انہیں ملازم سمجھتے ہی نہ تھے۔ جس طرح گھر میں ایک بڑے کی حیثیت ہوتی ہے' بالکل وہی احترام اماں کو دیا جاتا تھا۔

ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ان کے شوہر نے انہیں کبھی ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔ اماں

نے بھی کبھی اپنے شوہر کی جستجو نہ کی۔ وہ تو اپنا گھر جانتی تھیں' لیکن انہوں نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا۔ ایک روحی کے ساتھ صدر گئیں' تو ایک مرتبہ ان کی اپنے شوہر پر ضرور نظر پڑی' اماں نے اسے دیکھتے ہی اپنا منہ چھپا لیا۔ جب انہوں نے اس سے ہمیشہ کے لیے ناتا ہی توڑ لیا تھا' تو پھر اپنا آپ دکھا کر کیا کرنا تھا۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ ساحل عمر' جو چھ ماہ کی عمر میں ان کی گود میں آیا تھا' اب وہ ایک کڑیل جوان بن چکا تھا۔ لیکن جو چاہت اماں کے دل میں پہلے دن سے ساحل کے لیے تھی' وہ آج بھی برقرار تھی۔ وہ اس پر جان نچھاور کرتی تھیں۔ اس پر صدقے واری جاتی تھیں۔ ساحل عمر کا بھی یہی حال تھا' وہ دل سے ان کی عزت کرتا تھا۔ انہیں احترام دیتا تھا۔

چار پانچ سال پہلے ساحل عمر کے ممی پاپا اپنی شادی کی سالگرہ منانے گھر سے نکلے تھے۔ شادی کی سالگرہ والا دن وہ دونوں گھر سے باہر ہی گزارتے تھے اور یہ سارا دن وہ سمندر پر گزارتے تھے۔ دوپہر کا کھانا وہ سمندر پر کھاتے اور شام ڈھلتے ہی وہ گھر کی طرف چل پڑتے۔ رات کا کھانا گھر پر ہوتا۔ واپسی پر وہ کیک لے آتے۔ کیک کاٹا جاتا۔ اماں اس دن خوب اچھے اچھے کھانے تیار کرتیں۔ مزے سے کھانے کھائے جاتے۔ خوب ہلاگلا رہتا۔

اس دن بھی اماں نے کئی ڈشیں تیار کرلی تھیں۔ ساحل عمر اپنے ممی پاپا کا بے چینی سے انتظار کررہا تھا' انہیں اب تک آجانا چاہئے تھا' لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے۔ گارڈن والا فلیٹ وہ کب کا چھوڑ چکے تھے۔ اب یہ لوگ نارتھ ناظم آباد کے ایک بڑے مکان میں رہتے تھے۔ یہ مکان عمر عابد نے بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ اس کی تعمیر میں قدم قدم پر روحی کے مشورے بھی شامل تھے۔ مکان کے آگے اور پیچھے گارڈن ترتیب دیا گیا تھا۔ روحی کو باغبانی کا بے انتہا شوق تھا۔ اس نے جانے کہاں کہاں سے پودے اکٹھے کیے ہوئے تھے۔

ساحل عمر گھر کے سامنے لان پر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سڑک سے گزرنے والی ہر گاڑی پر اسے گمان ہوتا تھا کہ یہ ممی پاپا کی گاڑی ہے۔ لیکن وہ ممی پاپا نہ ہوتے' کسی اور کی گاڑی ہوتی۔

پھر انتظار جب اپنی انتہا کو پہنچا تو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ساحل عمر نے جھپٹ کر ریسیور اٹھایا اور جلدی سے کہا "جی!"

ادھر سے کوئی خاتون بول رہی تھیں۔ انہوں نے پہلے ٹیلی فون نمبر کنفرم کیا۔ ساحل عمر نے نمبر سن کر کہا "جی یہی نمبر ہے۔"

"آپ عمر عابد صاحب کے کون ہیں؟" ادھر سے سوال ہوا۔

"جی' میں ان کا بیٹا بول رہا ہوں۔" ساحل عمر نے جلدی سے جواب دیا۔

"اوہ!" ادھر ایک ٹھنڈا سانس لیا گیا۔ "دیکھئے میں ڈاکٹر ظفرین بول رہی ہوں۔ میرے پاس آپ کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ آپ کے ممی پاپا کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ دونوں کی کنڈیشن اچھی نہیں ہے۔ آپ فوراً ہسپتال آجائیے۔" یہ کہہ کر اس نے ہسپتال کا نام بتایا۔

ساحل عمر جب اماں کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچا تو عمر عابد گزر چکے تھے اور روحی کی زندگی

کے چند سانس باقی تھے۔ روحی نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں کھولیں' ساحل کو دیکھا۔ ساحل نے جھک کر اپنی ماں کی پیشانی چومی' تو اس کی آنکھیں ایک دم چھلک پڑیں۔ اس نے گردن موڑ کر اپنی آنکھیں صاف کیں۔ اتنی دیر میں روحی چل بسی۔

ساحل سمندر سے واپسی پر ان کی گاڑی کو ایک تیز رفتار ٹرک نے ٹکر ماردی تھی اور پھر اس بدمست ڈرائیور نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا کہ گاڑی میں موجود مسافروں کا کیا بنا۔

ساحل عمر نے بڑے حوصلے سے کام لیا۔ اتنے بڑے حادثے کو اس نے دل پر پتھر رکھ کر سہہ لیا۔ اماں اس کو صبر کی تلقین کرتی تھیں اور خود کونوں بچالوں میں چھپ کر روتی تھیں۔ ساحل عمر انہیں روتا ہوا دیکھ لیتا' تو بڑے حوصلے سے ان کو سمجھاتا تھا۔ ساحل عمر کا صبر دیکھ کر اماں حیران ہوتی تھیں۔

سوئم کے بعد ساحل عمر نے ایک مرتبہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں اماں سے کہا تھا "اماں اب تم مجھے چھوڑ کر نہ چلی جانا۔"

ساحل عمر کی اس بات پر اماں کا دل کٹ کر رہ گیا۔ انہوں نے فوراً اسے اپنے گلے سے لگالیا تھا اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔ "میں اب کہاں جاؤں گی؟ میری جان تجھ میں ہے۔"

آج وہی ساحل عمر' جس نے اماں سے چھوڑ کر نہ جانے کی درخواست کی تھی' آج خود ہی ان کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ اس دکھ کو کیسے برداشت کرتیں۔

وہ سسک سسک کر روئے جارہی تھیں اور ان کو تسلی دینے والا کوئی نہ تھا۔

اچانک انہیں یہ احساس ہوا جیسے کسی نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا ہو۔ انہوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور آنسو بھری آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ یہ ان کا وہم تھا۔ تسلی دینے کی خواہش نے شاید مجسم حیثیت اختیار کرلی تھی۔ پھر انہوں نے آنسو پونچھ ڈالے اور وضو کرنے کے لیے واش روم میں چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

ساحل عمر جب برکھا کے بنگلے پر پہنچا' تو نہ اسے ہارن بجانے کی ضرورت پڑی اور نہ بیل دینے کی۔ جب ساحل کی گاڑی گیٹ کے سامنے رکی' تو گیٹ خود بخود کھلتا چلا گیا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ساحل عمر نے دیکھا کہ گیٹ کھولنے والی خود برکھا ہے۔ اسے بڑی حیرت ہوئی' وہ جانے کب سے گیٹ کے پیچھے کھڑی اس کا انتظار کررہی تھی۔ اس احساس نے اس کے دل میں تفاخر پیدا کردیا۔

برکھا نے گیٹ کے ایک طرف کھڑے ہوکر اسے گاڑی اندر لے آنے کا اشارہ کیا' جب گاڑی اندر آگئی تو اس نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ساحل عمر نے گاڑی کو بریک لگایا اور برکھا کو مڑ کر دیکھنے لگا۔

برکھا نے گیٹ بند کیا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس کی طرف مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ ساحل عمر نے ہاتھ ملایا۔ وہ ہنس کر بولی "مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"برکھا جی' کس بات کا؟"

Urdufans.com